

مارچ 2018

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع



بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان خیر بہیہ دہستانی
رکن کونسل آف پاکستان خیر بہیہ دہستانی

MEMBER
APNS
CPNE

باقی و ممبران کی

ممبران کی

ممبران کی

ممبران کی

ممبران کی

ممبران کی

ممبران کی

ذرا سیلانیہ باب کی قیمتیں

پاکستان (سالانہ) 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 7000 روپے



WITH
COLOR LOCK
TECHNOLOGY™

BLACK ROSE®
Color Supreme

PERMANENT
HAIR COLOR
DEEP NOURISHING EFFECTS

AVAILABLE IN 10 DIFFERENT SHADES



COLOR EXPERTS!

www.blackrosecolor.com





282	امت الصور	تاریخ کے جھوکے	271	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	موسم کے یگانہ	264	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خواب صورت بننے	280	واصفہ سہیل	انیمہ خالے میں
			268	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشنویس
			266	خالہ جیلانی	کھٹنا کسی پیہ

مارچ 2018
جلد 32، نمبر 7
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل غلوں میں پیشکش پر اس کے چھپا کر شائع کیا۔ - علامہ اقبال کی تصاویر، شائع کی گئی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



78 سائرہ رضا 'شریائی کرپیا'



62 حیرل تبسم 'ویران دریچے'

72 ریحانہ آفتاب 'گدھ'

103 ماہ و ش طالب 'ابلیہ پانی کے بعد'

140 قرۃ العین ٹیکا 'دم'

183 عمارہ خان 'چھٹی کا دین'

67 ثمینہ قرحان 'تقلوں کا ٹالپ'

254 قرۃ العین رائے 'بہار آتی'



262 عبدالحمد عدم 'غزل'

263 خماریاں بکوری 'نظم'

262 انور شعور 'غزل'

263 محمود شام 'نظم'

10 رضیہ جمیل 'پہلی شعاع'

11 ریاض حسین قمر 'حسد'

11 حاجی امداد اللہ 'نعت'

12 ادارہ 'نئی کی باتیں'



17 سمیرا حمید 'کتاب کہانی'

27 شائین رشید 'عتا نور'

31 شائین رشید 'دستک'

286 ادارہ 'شعاع کے ساتھ'

22 ع - م 'جب مجھ سے ملتا'

24 ع - ط 'جب مجھ سے ملتا'



234 عفتہ بکر لہر 'خواب شیشے کا'

36 مراد اکرم 'ستہر زاد'



112 سلوی علی بیٹ 'شہری دھوپ'

148 صائرہ اقبال 'حال دل کھل چکا'

188 مہوش اختر 'شب تاب'

انتباہ: ماہنامہ شعاع 13 اگست کے جلد حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ شائع کیا جاسکتا ہے۔ نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر نہ رادار، ڈرامائی تقابلی اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

شعاع مارچ کا شمار آپ کے مہینوں میں ہے۔
جدید ٹیکنالوجی نے جہاں بہت سی آسانیاں ہم پہنچائی ہیں وہاں اس کا فائدہ استعمال بہت سے
مسائل کا باعث بھی بن رہا ہے۔ دنیا بھر میں ویب بن گئی ہے۔ فاصلہ سمٹ گئے ہیں لیکن طبیعی شوق کے
مابین فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ پوری دنیا سے رابطے میں لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بچوں کو والدین
سے بات کرنے کی فرصت نہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں آن دیکھی دوستیوں میں وہی ہیں لیکن ساتھ بیٹھا دوست
کس تکلیف میں مبتلا ہے اس سے لاعلم۔

موشل میڈیا، فیس بک اور یوٹیوب کا استعمال کرنے والے لاکھوں کروڑوں ہیں۔ کوئی بھی بات خواہ
وہ جبروت ہو یا سچ، ایک کلک کے ذریعے لاکھوں کروڑوں افراد تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک سچ خواہ اس
کا تعلق کسی کی نجی زندگی سے ہو یا کوئی اجتماعی مسئلہ ہو یا تصدیق کے بغیر سوجھے سمجھے ایک کلک کے بعد
دیا جاتا ہے۔ چینلز پر بھی مقبول شخصیات کے متعلق جھوٹی اور سن گھڑت باتوں کو منظر طریقے سے پیشایا جاتا
ہے تاکہ عوام اصل مسائل پر غور و فکر نہ کر سکیں۔ لیکن وہاں پھر بھی نئے حدود و حدود ہیں جیسا سرشل میڈیا پر
آزادی حاصل ہے۔ آپ جس طرح چاہیں اپنے نظریات و خیالات کی ترویج کر سکتے ہیں۔
اس جدید زمین ٹیکنالوجی کا ایک خطرناک ترن پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمارے مذہب کے متعلق گمراہ کن عقائد
کی ترویج کی جا رہی ہے۔

امادیت اور قرآنی آیات کا ترجمہ مشل میڈیا پر آسان ہے اور ہم اسے انگلی کی ایک جنبش سے کسے بڑھا
دیتے ہیں۔ یہ سوجھے یا تصدیق کرنے کی زحمت نہیں کہنے کو قرآن پاک کی آیت کے ترجمے کے نام پر جو بیس گنا
ہے قرآن پاک میں وہ آیت موجود بھی ہے یا نہیں۔ کسی نے قرآن پاک کی آیت کے ترجمے میں قرین کو نہیں کر دی
ہے یا جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے فیس بک یا یوٹیوب پر لگائی گئی ہے وہ واقعی آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہی ہے۔

کبھی ہمارے لوگوں کو کسے سچ کرنے پر مراد پوری ہونے کی پیش گوئی کی جاتی ہے تو کسی کسی بیٹے کی پہلے مبارک باد
دینے پر بھرتی کی شہادت دی جاتی ہے۔
خوشی یا غمی خیر خیر اللہ کے کرم سے ملتی ہے۔ یہ کسی سچ کو کسے پہنچانے سے نہیں ملتی۔ مراد بھی اللہ ہی پوری
کرنا ہے اور جنت کا حصول بھی اس قدر آسان نہیں ہے کسی بیٹے کی پہلے مبارک باد دینے سے جنت واجب
ہو جائے۔ جنت میں اللہ برکات عین اور ایمان کے ساتھ اللہ کے احکامات پر عمل کرنے اور اس کی رحمت سے
بھی ملے گی۔

اسلام پر کچھ لکھنے یا آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں اسلامی تعلیمات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے۔
اوپر بھی بات کو آگے بڑھانے سے پہلے اس کے متعلق تصدیق کر لینا چاہیے کہ اس میں کبھی صداقت ہے۔ کسی
آدمی کے جوتہ ہونے کے لیے یہ بی کافی ہے کہ وہ ہنسی ستانی بات کو تصدیق کے بغیر آگے بڑھا دے خصوصاً
وہ دن کے معاملے میں تو بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم اس طرح غلط عقائد کو پھیلانے میں معاون
اور مددگار ہو سکتے ہیں۔

اسٹن شمارے میں،

- مریٹن ایف ایم اے ناول۔ شب تاب،
 - مریٹن ایف ایم اے ناول۔ سہری دھوپ،
 - نہید رحمان، قرۃ العین خرم کاسمی، ماہ و فن طالب، قرۃ العین بٹ، رضا آف قلاب اور عمار خان کے افسانے،
 - ان وی لکچر ہفتا نور سے ملاقات،
 - جیب جیسے نانا جوڑا ہے۔ نثار بیک اسلم،
- مارچ کا شمار آپ سب قارئین کو کیسا اگلا، خط لکھ کر اپنی رائے سے مزین قرار دے گا۔

تو خالق ہے زمین و آسمان کا
تو مالک ہے مکان و لامکان کا

ہے متر ماؤں سے بڑھ کر محبت
نہیں پایا ہے تجھ سا مہرباں کا

کرے حمد و ثنا ہر وقت تیری
یقیناً پتا پتا گلستاں کا

ہے چاروں طرف رحمت کا سند
کنارا کب ہے محرابے گراں کا

قمر جو سب خزانوں کا ہے مالک
گدا گر ہوں میں اس کے آستان کا

رباعی حسین قمر

کہے ہے شوقِ نبی یہ اکبر، چلو مدینے چلو مدینے
میں ہوں گادل سے تمہارا درہبر، چلو مدینے چلو مدینے

صبا بھی لاتے گی ہے اب تو نسیم طیبہ، نسیم طیبہ
کہے ہے شوقِ اب ہوا میں اُڑ کر چلو مدینے چلو مدینے

شہر شہر کیوں پھر ہے مارا، خورد و زن عالم کی ہلے لٹ
تو سر قدم ہو کے دردِ کرا چلو مدینے چلو مدینے

جو کفر و ظلم و فسادِ عصیان، ہر گ شہر میں ہو نمایاں
تو دینِ اسلام اُٹھے یہ کہہ کر چلو مدینے چلو مدینے

جب کے ہوتے ہیں جب پیسے، پھر ہیں شوقِ نبی سے
مددایہ نکلتے ہیں کو یہ کوہے، چلو مدینے چلو مدینے

ہلاکتِ ابدی و اب تو آئی، جو فتنہ عصیان کی پر طمان
نجات پا ہو تو اسے بلو چلو مدینے چلو مدینے

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب



وقار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم اس کے لیے دوڑتے ہوئے نہ آؤ (آرام سے معمول کی چال) چلتے ہوئے آؤ اور سکینیت اختیار کرو جو نماز امام کے ساتھ پالو، وہ پڑھ لو اور جو تم سے فوت ہو جائے اسے پورا کرلو۔“

(بخاری و مسلم)

مسلم نے اپنی روایت میں یہ الفاظ زیادہ بیان کیے ہیں۔

”تمہارا ایک آدمی جب نماز کا قصد کر لیتا ہے تو دو نماز (کی حالت) ہی میں شمار ہوتا ہے۔“

فوائد و مسائل:

1- اس سے معلوم ہوا کہ جماعت کے حصول کے لیے دوڑ بھاگ کر آنا ممنوع ہے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے جبکہ حکم وقار اور سکینیت (سکون) اختیار کرنے کا ہے، بالخصوص نماز وغیرہ کے لیے آتے وقت۔

2- جب انسان گھر سے وضو کر کے نکلتا ہے تو اس وقت سے اسے نماز میں شمار کر لیا جاتا ہے۔

3- امام کے ساتھ ملنے والی رکعت مقتدی کی پہلی رکعت ہوگی۔ بعد میں جو ادا کرے گا وہ آخری رکعتیں ہوں گی۔ اور یہ بات عقل و نقل (دلائل) کے عین مطابق ہے۔

تیز رفتاری

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ وہ عرفے کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (عرفات سے) واپس لوٹ رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے سخت ڈانٹ، مار اور اونٹوں (کے بڑبڑانے) کی آواز سنی تو آپ نے اپنے کوڑے کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔

”اے لوگو! سکینیت اختیار کرو (یعنی سکون سے چلو) اس لیے کہ تیز رفتاری نیکی نہیں ہے۔“

(بخاری۔ مسلم نے بھی اس کا کچھ حصہ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل:

1- اس میں بھی وقار اور سکون اختیار کرنے اور تیز روی سے اجتہاد کی تلقین ہے۔ مناسک حج کی ادائیگی کے دوران مقامات حج پر اس ہدایت پر عمل کرنے کی بڑی شدید ضرورت ہے کیونکہ وہاں ہر جگہ انسانوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔ ایسے میں ایک دوسرے کو ٹھیک کر خود تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش دوسروں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے جس کا مشاہدہ ہر سال ایام حج میں ہوتا ہے لیکن مسلمانوں میں صبر و ضبط کی کمی اور ایسے مذہب کی اخلاقی ہدایت سے نا آشنا بیانیے اعتدالی کی وجہ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو پاتا اور سعودی حکومت کے بے مثال اور وسیع انتظامات کے باوجود انسانی جانوں کا ضیاع تقریباً ایک معمول سا بن گیا ہے۔

مہمان کی عزت و تکریم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات پہنچی ہے؟ جب وہ ان کے پاس گئے تو انہوں

نے سلام کیا، حضرت ابراہیم نے بھی جواب میں کہا: سلام (اور کہا: یہ) انجانے لوگ ہیں۔ پھر اپنے گھر کی طرف چلے اور ایک پلا ہوا بچہ (یعنی کمرہ دار) لائے اور ان کے قریب کیا اور فرمایا: تم کھاتے کیوں نہیں؟“ (سورۃ الذاریات 24-27)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لوٹ کے پاس ان کی قوم دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے پہلے بھی وہ براہیوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ حضرت لوط (علیہ السلام) نے فرمایا:

”اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں، چنانچہ اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں سے

کوئی بھی سمجھ دار آدمی نہیں ہے؟“ (سورۃ ہود۔ 78)

فائدہ آیات: قرآن مجید کے ان دونوں مقامات پر مہمانوں کی عزت و تکریم کا ذکر ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ذیل کی احادیث ملاحظہ ہوں۔

مہمان کی عزت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہیے۔ اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ صلہ رحمی (رشتے داروں سے حسن سلوک) کرے۔ اور جو

اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ بھلائی کی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- مہمان کی عزت کرنے کا مطلب ہے، خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے، حسب استطاعت، خوش دلی سے، اس کی مہمان نوازی کرے اور اس کے آرام و راحت کا خیال رکھے۔

2- صلہ رحمی کا مطلب، رشتے داروں کے حقوق

کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے۔

3- گفتگو کم کرنے کا مطلب ہے کہ بے وجہ اور فضول باتوں سے گریز کرے۔ زبان کو ذکر الہی، توبہ و استغفار اور کلمہ خیر کے لیے وقف رکھے یا پھر زیادہ خاموش رہے۔ یہ تینوں خوبیاں ان لوگوں کی بھلائی کی ہیں جو حج معنوں میں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ان میں کوتاہی کرنے والوں کا ایمان ناقص اور خام ہے۔

مہمان کا حق

حضرت ابو شریح خلیلہ بن عمرو خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اسے مہمان کی عزت کرتے ہوئے اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔“

صحابہ نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس کا حق کیا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایک دن اور رات (یعنی اس میں اپنی طاقت کے مطابق بہتر کھانا تیار کرے۔) اور مہمان نوازی تین دن ہے، جو اس کے علاوہ ہو، وہ صدقہ ہے۔“ (بخاری و مسلم)

مہمان کا قیام

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے پاس (انتاز زیادہ) ٹھہرے حتیٰ کہ اسے گناہ گار کر دے۔“

صحابہ نے پھر عرض کیا:

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کو گناہ گار کیسے کرتے گا؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اس کے پاس ٹھہرا ہے اور اس کے پاس کوئی چیز نہ رہے جس کے ساتھ وہ اس کی مہمان نوازی کرے۔“

فائدہ: اس میں مہمان نوازی کے مزید آداب و حدود کی وضاحت ہے کہ پہلے دن اور رات عمدہ کھانے کا اہتمام کیا جائے اور اس کے بعد دو دن مزید معمول کے مطابق مہمان نوازی کی جائے۔ تین دن کے بعد مہمان کو چاہیے کہ وہ وہاں سے چلا جائے، تاہم اگر وہ نہ جائے تو اس کے بعد مہمان نوازی بطور صدقہ ہوگی۔

خوش خبری

عبداللہ بن ابی اونی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو خوش خبری دی کہ (ان کے لیے) جنت میں موتیوں کا گھر ہوگا، جس میں نہ شور ہوگا نہ ٹکناں۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت کے علاوہ خیر کی خوش خبری دینے کا اثبات ہے۔

جنت

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے گھر میں وضو کیا اور باہر نکل گیا۔ (اپنے دل میں) کہا کہ میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہوں گا اور آج کا دن آپ کے ساتھ ہی گزاروں گا۔

چنانچہ میں مسجد میں آیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت (لوگوں سے) پوچھا تو صحابہ نے بتلایا۔ ”کہ آپ نے اس طرف کارخ فرمایا ہے۔“

(حضرت ابو موسیٰ) فرماتے ہیں: ”پس میں آپ کے قدموں کے نشانات پر آپ کے متعلق پوچھتا ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نکل کھڑا ہوا، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر میں (قباء کے قریب ایک باغ) پہنچ گئے۔

میں دروازے پر بیٹھ گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قضائے حاجت کے بعد وضو فرمایا تو میں آپ کی طرف گیا تو دیکھا کہ آپ برابر میں منڈیر پر بیٹھے ہیں اور پندلیوں کو نکا کر کے کنویں میں لٹکایا ہوا ہے۔

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اور پھر واپس آ کر دروازے پر بیٹھ گیا۔ اور میں نے (دل میں) کہا کہ میں آج ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دربان رہوں گا۔“

اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

میں نے پوچھا ”کون ہے؟“
انہوں نے فرمایا: ”ابوبکر۔“
میں نے کہا: ”ٹھہریے۔“
پھر میں گیا اور کہا:

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ ابوبکر، اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انہیں اجازت دے دو اور جنت کی خوش خبری (صحیحی) دے دو۔“

چنانچہ میں آیا اور ابوبکر سے کہا: ”تشریف لائیے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔“

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اندر تشریف لائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منڈیر پر آپ کی دائیں جانب بیٹھ گئے اور اپنے دونوں پیروں میں لٹکالیے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور اپنی پندلیاں ننگی کر لیں۔

میں پھر واپس آ کر (دروازے پر) بیٹھ گیا۔ اور میں (گھر سے نکلے وقت) اپنے بھائی کو وضو کرتا چھوڑ کر آیا تھا کہ مجھے خود ہی آ کر مل جائے گا۔ تو میں نے (دل میں) کہا:

”اگر اللہ تعالیٰ فلاں (یعنی اس کے بھائی) کے

ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اسے یہاں لے آئے گا۔“

اتنے میں کوئی شخص آیا اور دروازہ ہلانے لگا۔ میں نے کہا: ”کون ہے؟“

اس نے کہا: ”عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔“
چنانچہ میں نے کہا: ”ذرا ٹھہریے۔“
میں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کو سلام عرض کیا اور کہا:

”یہ عمرؓ ہیں، اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انہیں اجازت اور جنت کی خوش خبری دے دو۔“
لہذا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا:

”آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اندر آنے کی) اجازت اور جنت کی خوش خبری دی ہے۔“
چنانچہ وہ تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منڈیر پر آپ کی بائیں جانب بیٹھ گئے اور اپنے دونوں پیروں میں لٹکالیے۔

میں پھر واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور (دل میں) کہا: اگر اللہ تعالیٰ فلاں (یعنی اس کے بھائی) کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اسے (یہاں) لے آئے گا۔

اتنے میں ایک اور شخص آیا۔ اس نے دروازہ ہلایا تو میں نے پوچھا: ”کون ہے؟“

اس نے کہا: ”عثمان بن عفان۔“
میں نے کہا: ”اچھا ٹھہریے!“

اور میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر اطلاع دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انہیں اجازت دے دو اور ایک بلوہ (حادثے) کے ساتھ جو

انہیں پیش آئے گا، جنت کی خوش خبری سنا دو۔“

چنانچہ میں آیا اور ان سے کہا: ”تشریف لائیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ایک حادثے کے ساتھ، جو آپ کو پیش آئے گا، جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔“

چنانچہ وہ اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئے (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں دونوں جانب جگہ نہیں ہے) پس وہ آپ کے سامنے دوسری جانب بیٹھ گئے۔

حضرت سعید بن مسیب (مشہور تابعی اور حضرت ابو موسیٰ سے روایت کرنے والے راوی) فرماتے ہیں کہ: ”میں نے اس سے ان کی قبروں کی تاویل کی۔“

(یعنی ابوبکرؓ اور عمرؓ میں بھی اسی طرح ساتھ ہوں گے جب کہ عثمانؓ کی قبر الگ ہوگی۔) (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: ”اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دروازے کی نگرانی کا حکم فرمایا۔“ اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جب خوش خبری سنائی تو انہوں نے اللہ کی حمد بیان کی اور فرمایا: ”اللہ ہی اس لائق ہے کہ اس سے مدد طلب کی جائے۔“

فوائد و مسائل:

- 1- اس حدیث کا تعلق باب سے واضح ہے کہ اس میں بھی خوش خبری دینے کا اثبات ہے۔
- 2- خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو، ان کے جنتی ہونے کی بشارت دے دی گئی۔ اس کے بعد ان کے ایمان میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔
- 3- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بابت جس بلوے کی پیش گوئی فرمائی، وہ ان کی خلافت کے آخر میں پیش آیا، جب کہ عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے مکروہ اور بے بنیاد پردیگنڈے سے متاثر فساد گردہ نے حضرت عثمان کا محاصرہ کر لیا اور بالآخر

کتاب کہانی

سید احمد

جسے ترتیب وغیرہ لیکن جو ”لہجہ“ ہوتا ہے وہ بہت مشق سے آتا ہے یا مشکل سے آتا ہے۔ جب کوئی انسان کسی دوسری زبان کے لہجے کو بھی پوری طرح سے اپنا لیتا ہے تو وہ واقعی میں کمال کرتا ہے۔ اتنے یہ کمال کر دکھایا تھا۔

۔ لہذا کی مادری زبان مراٹھی تھی، قوی زبان ہندی، اور مذہبی زبان سنسکرت اگر وہ ”کامیاب“ ہونے کے لیے اردو سیکھ سکتی ہیں تو اردو تو ہماری اپنی ”قوی“ زبان ہے۔ ہماری پہلی شناخت ہے۔ روز کے دو نئے لفظ ”مہینے“ کے ساتھ لفظ بننے ہیں۔ نوے دنوں میں ایک سوامی الفاظ آپ کے پاس ذخیرہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ذخیرہ کسی خزانے سے کم نہیں اور اس خزانے کی چابی آپ کے پاس ہے۔ آپ کی سوچ اور عمل کے پاس۔

آج کی کتاب کہانی ”زبان کہانی“ کے ساتھ۔ میری پیاری زبان ”اردو“ کے نام۔

اردو: ہماری زبان اردو ”ایک قدیم زبان“ شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی ہے۔ جب کوئی زبان دم توڑ رہی ہوتی ہے یعنی ختم ہو رہی ہوتی ہے تو اس زبان میں سے کئی زبانیں ”کھڑی ہوئی“ کی صورت میں نکل کر آتی ہیں۔ اردو بھی وہی زبان تھی جو پہلے ”ہوئی“ تھی اور جس کے کئی نام تھے۔ پھر یہ سفر کرتے کرتے ہوئی سے زبان بنتی چلی گئی۔ دقت کے ساتھ ساتھ یہ زبان مقامی زبانوں کے ساتھ مل کر پھلنے پھولنے لگی۔

اس زبان کا باقاعدہ آغاز دہلی اور اتر پردیش سے ہوا تھا۔ برصغیر میں نئے آنے والے مسلمانوں اور مقامی باشندوں (جن کی یہ بولی تھی) کے باہمی میل جول سے اس زبان میں عربی اور فارسی کے

رسول حمزہ توف زبان کے بارے میں کہتے ہیں کہ

”میرے نزدیک زبانیں آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی حیثیت رکھتی ہیں اور میں یہ نہیں کہوں گا کہ تمام ستارے ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک بڑے ستارے کا روپ لے لیں۔ کیونکہ اس کے لیے تو سورج موجود ہے۔ لیکن سورج کے وجود کے بعد بھی یہ ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ستارے آسمان پر چمکتے رہیں۔ اور ہر آدمی کے پاس اس کا اپنا ستارہ ہو۔ مجھے اپنے ستارے یعنی اپنی مادری زبان سے محبت ہے۔ میں ارضیات کے ان ماہروں کی بات پر یقین رکھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی پہاڑی میں بھی سونے کی کان نکل سکتی ہے۔“

لہذا شکر بنگال سے بہتی اپنے کیر کی تلاش میں آئی تھیں۔ چونکہ انہیں مراٹھی زبان آتی تھی تو ٹرین میں انہیں کسی نے مشورہ دیا کہ اگر وہ بہتی میں کامیاب کلوکارہ بننا چاہتی ہیں تو اردو سیکھیں۔

لہذا ایک بے حد محنتی لڑکی تھیں۔ انہوں نے اردو سیکھنی شروع کر دی۔ وہ اردو پڑھ نہیں سکتی تھیں اس لیے ان کے جاننے والوں میں ایک مسلم خاتون تھیں جن سے انہوں نے لفظ لفظ کر کے یہ زبان سیکھنی شروع کر دی۔ اور پھر ایسی سیکھی کہ لوگ یہ بھول ہی گئے کہ ان کی اصل زبان کون سی ہے۔ انہوں نے تلفظ اور لہجہ کی زبان ویان میں ایسی مہارت حاصل کی کہ کوئی بھی ان کے گانے سن کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ لہجہ یہ زبان سیکھی ہے۔

آپ لہجہ کا کوئی بھی گانا سن لیں اور اپنا تلفظ ٹھیک کر لیں۔ ایسا لگتا ہے کہ لہجہ اسی زبان کو لے کر پیدا ہوئیں۔ اسی میں پٹی برہیس اور پٹی ان کی مادری زبان ہے۔ زبانیں بولنے سے آ جاتی ہیں یعنی لفظ

کر دیا گیا ہو، چنانچہ ہم کھراٹھے، گھبرانے والوں میں سب سے پہلا آدمی میں تھا۔ اس لیے میں اس باغ تک آ گیا اور (اندرا دھل ہونے کے لیے) اس طرح سمٹ سکا گیا جس طرح لوحی سنٹی سکتی ہے۔ اور لوگ میرے پیچھے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے ابو ہریرہ!“ اور آپ نے مجھے اپنے دونوں جوتے دے کر ارشاد فرمایا:

”جاؤ میرے یہ دونوں جوتے ساتھ لے جاؤ، اس باغ کی دیوار کے باہر جو بھی ملے، جو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس پر اس کے دل میں پورا یقین ہو تو اسے جنت کی خوش خبری دے دو۔“ (اور بھی (پوری) حدیث ذکر کی)۔ (مسلم) فوائد و مسائل:

1- دل کی گہرائی سے اللہ پر ایمان رکھنے والا، اگر اس نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا ہوگا، تو وہ یقیناً جنت میں جائے گا، یا تو پہلے مرحلے ہی میں چلا جائے گا، اگر اللہ کی مشیت ہوگی، بصورت دیگر سزا بھگت کر جنت میں جائے گا۔ اس کا دائرہ گھر جہنم نہیں، جنت ہی ہوگا۔

2- اس حدیث میں خوش خبری کے اثبات کے علاوہ مومن کے بہر حال جنتی ہونے کی نوید ہے۔

بدلہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کافر جب دنیا میں کوئی اچھا عمل کرتا ہے تو اسے اس کا بدلہ دنیا کی کچھ لذتوں میں سے دے دیا جاتا ہے (یعنی آخرت میں اسے کوئی صلہ نہیں ملے گا) لیکن مومن کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس کی نیکیوں کا آخرت میں (صلہ دینے کے لیے) ذخیرہ کر لیتا ہے اور دنیا میں اسے رزق اس کی فرماں برداری کی وجہ سے دیتا ہے۔“

آپ کو شہید کر دیا۔ رضی اللہ عنہا۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے۔

4- حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجرہ عائشہ میں اور حضرت عثمانؓ بقیع الغرقہ (جنت البقیع) میں مدفون ہیں۔

یقین

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھے تھے، اور ہمارے ساتھ (لوگوں میں) حضرت ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

تو (اچانک) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان سے اٹھ کر چلے گئے اور ہمارے پاس واپس آنے میں آپ نے کافی دیر فرمائی تو ہم ڈر گئے کہ ہماری غیر موجودگی میں آپ کو قتل (شہید) نہ کر دیا گیا ہو اور ہم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اور میں سب سے پہلے گھبرانے والا تھا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلا، یہاں تک کہ میں انصار کے قبیلے بنو نضار کے باغ کی چار دیواری پر پہنچ گیا۔ میں اس کے ارد گرد گھومنا کہ مجھے کسی دروازے کا سراغ مل جائے لیکن مجھے کوئی دروازہ نہیں ملا، تاہم ایک چھوٹے سے نالے پر نظر پڑی جو باغ سے باہر ایک کنوئیں سے نکل کر باغ کے اندر جا رہا تھا۔ اور رنج چھوٹی سی نہریا (چھوٹے سے نالے کو کہتے ہیں)۔

میں اس میں سے سمٹ سنا کر اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مجھے دیکھ کر) فرمایا: ”ابو ہریرہ؟“ میں نے کہا: ”جی ہاں یا رسول اللہ!“ فرمایا: ”کیا بات ہے؟“

میں نے کہا: ”آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پس آپ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور واپسی میں آپ نے دیر فرمادی تو ہمیں ڈر محسوس ہوا کہ کہیں آپ کو ہماری غیر موجودگی میں قتل (شہید) نہ

الفاظ داخل ہوئے۔ جس سے اس میں نکھار پیدا ہوا۔ کھڑی بولی کے نکھار کا یہ زمانہ ”اردو“ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ کھڑی بولی کے اس نئے اور کھرے ہوئے روپ کو ہندی، ہندی اور ریختہ کہا گیا۔ اور اسی کو بعد میں ”اردوئے معلیٰ“ پھر ”زبان اردو“ اور پھر ”اردو“ کہا گیا۔ یعنی وہ زبان جو ابتدا میں صرف ایک ذیلی تھی۔ وہ ترقی کرتے کرتے ایک اعلا درجے کی زبان بن گئی اور ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک کہلانے لگی۔

یہ ہے ہماری اردو زبان کی طویل ترین کہانی کا مختصر سا جائزہ۔ آپ نے دیکھا کہ ہماری زبان نے کتنا لمبا سفر طے کیا ہے۔ یہ زبان راتوں رات ہی تکمیل کے مرحلے طے کر کے مکمل نہیں ہوئی بلکہ اسے صدیاں لگی ہیں۔

اکثر لوگ اس عام سی بات کو بھی نہیں جانتے کہ اردو چونکہ سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کے ملاپ سے بنی ہے تو ہماری زبان میں ان سب زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ پھر بھی لوگ اکثر شاعروں ادیبوں وغیرہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ لوگ ہندی کے الفاظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ مجھے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ میں فارسی کا استعمال بہت کرتی ہوں۔ تو مجھے یہ بتانا ہے کہ یہ سب الفاظ ہماری اپنی زبان ”اردو“ کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ ہماری زبان ان زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے۔

تو یہ جو ہماری زبان ہے اردو یہ عام زبان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو جو اتنا طویل سفر کرایا ہے۔ اسے وقت کے ساتھ ساتھ نکھار پھیرا اس کے لہجوں کو سنورا تو اس میں کوئی راز ہی تھا۔ یہی کہ چند صدیوں بعد ایک قوم اور ایک ملک وجود میں آئے گا۔ یہ زبان اس قوم کو تحفے میں دی جائے گی۔

”ہماری زبان اردو“ اس کی ابتدا کا فیصلہ آسانی تھا اور اس کی تکمیل کا بھی۔ ماڈرن ننگ چین کے عظیم لیڈر تھے جن کی وجہ

سے چین نے حیران کن ترقی کی۔ ماڈرن ننگ انگلش زبان کو پوری طرح سے سمجھتے تھے۔ لکھ پڑھ اور بول سکتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں انگلش میں لطیفہ سنایا گیا تو وہ خاموش بیٹھے رہے جیسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ لیکن جب لطیفہ کو چینی زبان میں ترجمہ کر کے انہیں سنایا گیا تو وہ دل کھول کر ہنسے۔ انگلش میں لطیفہ سمجھ لینے پر بھی وہ انجان بن کر نہیں بلکہ اپنی قوی غیرت کو بلند کر کے بیٹھے رہے تھے۔

”جان من! چین کو لگا نہیں ہے۔“ (یعنی

ہمارے پاس ہماری زبان ہے، ہم کسی دوسرے کی زبان میں بات کریں)

ان کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا۔ ساری دنیا نے ماڈرن ننگ کی اس انقلابی سوچ کو سراہا جو قومیں اپنی زبان پر کسی بھی وجہ سے شرمندہ ہوتی رہی ہیں انہیں اس مقولے سے روشناس کروایا گیا۔

اب آپ مجھے بتائیں کہ کیا پاکستان گوٹا ہے؟ ہاں تو کیسے؟

نہیں..... تو کیسے نہیں کیونکہ شاہد کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔

اپنی زبان کے لیے سب سے زیادہ غیرت مند فرانس کے لوگ مانے جاتے ہیں۔ کچھ انگریزوں اور امریکیوں سے ان کی تھوڑی تھنی ہوئی ہے اس لیے کچھ وہ اپنی زبان کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں اس لیے بھی۔ ایک فرانسیسی سے کہا گیا کہ وہ دنیا کے بہترین ملکوں زبانوں لباس ثقافت وغیرہ کی درجہ بندی کرے۔

اس نے کہا کہ دنیا کا سب سے بہترین ملک فرانس ہے۔ بہترین زبان فرانس ہے۔ غرض اس نے پہلے نمبر پر اپنے ملک کی ہر چیز کو نکھار دوسروں کو اپنے بعد میں رکھا۔ آپ کہیں گے اس کی جگہ آپ بھی ہوتے تو یہی کرتے.....

کیا واقعی؟؟ ہم اس کی جگہ ہوتے تو ہم ایسا کیسے کرتے؟

کیونکہ ایسا کرنے کے لیے ہمارے پاس ثبوت کا ہونا ضروری تھا۔ میں جینز پہن کر یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ دنیا کا سب سے خوب صورت لباس میرا لباس ”شلوار قمیص“ ہے۔ میں جاسٹ کو پرل اور ستاروں کو اشارزہ کرتی ہوں تو میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ دنیا کی سب سے خوب صورت زبان اردو ہے؟ میں یہ سچی نہیں مار سکتی۔ ایسی سچی صرف وہی انسان مار سکتا ہے جو پوری طرح سے اپنی زبان بولتا ہے۔ اپنی ثقافت میں جیتا ہے۔

مجھے دنیا کی کوئی زبان ناپسند نہیں ہے لیکن مجھے

اپنی زبان سب سے زیادہ پسند ہے۔ دنیا کی سب زبانیں خوب صورت ہیں لیکن میری زبان اردو سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ کیونکہ یہ ”میری“ ہے۔ ”میں“ فخر ہونا چاہیے کہ ہم اور ہمارا ملک ”گوٹا“ نہیں ہے۔ اس زبان کا لب و لہجہ دل موہ لینے والا ہے۔ اس کے لہجہ اور انداز اتنے پیارے ہیں کہ عام بول چال میں بھی اس پر شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ ہماری زبان کے پاس احترام ”آپ“ میں اور ”بے تکلفی“ تم“ میں ہے۔ اس زبان کے پاس ایسے بے شمار منفرد الفاظ موجود ہیں جو شاید ہی کسی اور زبان کے پاس ہوں۔

گلوں میں رنگ بھرے بادلوں بہار چلے چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔

مندرجہ بالا اور مندرجہ ذیل دونوں اشعار پڑھیں اور دیکھیں کہ ہماری زبان کتنی خوب صورت ہے۔ اس میں کیسے سُر تال اور سارنگیاں بولتی ہیں۔

فرض کرو یہ جی کی بیچتا جی سے جوڑ سنائی ہو فرض کرو دماغی اور ہوائی آدمی ہم نے چھائی ہو قوی اور ماوری زبان وہ تجھ ہوتا ہے جو کسی بھی انسان کو پیدائش کے وقت ملتا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان اسے نکھارے تو وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ہم سب کفرانِ نعمت کر رہے ہیں۔ اگر میں پڑھے لکھے یا ہائی فائی لوگوں کے

گروپ میں ”شام بیچ“ کہتی ہوں تو مجھے حیرت سے کیوں دیکھا جاتا ہے؟ انہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ مجھے ”گڈ ایونگ“ کہنا چاہیے تھا اور نہ اپنا منہ بند رکھنا چاہیے تھا۔ یا مجھے ”میں“ مسٹر یا سر کا راجا جانا چاہیے لیکن ”محترم یا محترمہ“ نہیں۔ کیوں؟ کیونکہ یہ الفاظ پرانے ہو چکے ہیں۔ یہ ٹرینڈ میں نہیں ہیں۔ زبانیں ٹرینڈ میں نہیں ہوتیں وہ فرد کے ذریعے ”زندہ“ ہوتی ہیں۔ اگر وہ مردہ ہونے لگیں تو ”پرانی“ ہونے لگتی ہیں۔

ہماری زبان کسی فیشن کا حصہ نہیں ہے کہ فیشن بدلے گا تو یہ بھی بدل جائے گی۔ زبان تو شناخت ہوتی ہے۔ فخر ہوتی ہے۔ تمنہ ہوتی ہے۔ اسے فخر سے سر کا تاج بنایا جاتا ہے۔ سینے پر سجایا جاتا ہے۔ سینہ ٹھونک کر کہا جاتا ہے کہ یہ ہے ہماری زبان اور ہم گوئے نہیں ہیں۔

”کیا ہم اپنی زبان پر شرمندہ ہیں؟؟ اگر ہاں تو کس لیے؟؟ اگر نہیں تو پھر مجھے ہر جگہ ہر طرف ”اردو“ کی جگہ کوئی تیسری زبان کیوں نظر آتی ہے۔ میں اردو ادب کے نام پر ہونے والی کالفرنس میں چالی ہوں اور وہاں انگلش میں بات ہوتی ہے۔ پیچھے تبصرے، تنقید، آراء سب کچھ۔ سننے والے سب پاکستانی ہوتے ہیں۔ بولنے والے بھی۔ جن کتابوں پر بات کی جاتی ہے وہ بھی اردو کتب ہوتی ہیں۔ سب کچھ موجود ہوتا ہے لیکن وہاں کہیں ”اردو“ موجود نہیں ہوتی۔

اس دور کے والدین اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ وہاں ہم انہیں علم کے لیے کم اور ”انگلش“ کے لیے زیادہ بھیجتے ہیں۔ آپ مائیں یا نہ مائیں لیکن یہی سچ ہے۔ والدین بچوں سے گھر میں انگلش میں بات کرتے ہیں۔ انہیں ایک ایک چیز کا نام انگلش میں بتاتے ہیں۔ میں نے ایسے والدین بھی دیکھے ہیں جو مہمانوں سے خاص طور پر یہ کہتے ہیں کہ پلیز ہمارے

بچوں سے صرف انگلش میں بات کریں، اردو میں بات کر کے انہیں کنفیوز نہ کریں۔ (میں ایسے موقعوں پر خاموش رہنا پسند کرتی ہوں)۔

ترقی کے لیے کامیابی کے لیے اس زبان کی سیرھی کا استعمال ٹھیک ہے۔ یہ ایک گلوبل زبان ہے۔ یہ زبان آتی چاہیے۔ لیکن برائے مہربانی اس سب ٹھیک میں اپنی قومی غیرت کا گلا نہ گھونٹیں۔ میں ایک پاکستانی سے بات کرنے کے لیے اردو میں خط لکھنے کے بجائے انگلش میں کیوں ہتھی ہوں؟؟ یہی کیوں ضروری ہے کہ میری ٹیس بک پوسٹ میرا بیان میرے خیالات، میری ڈائری سب کچھ انگلش میں ہونا چاہیے۔ ہماری اردو کہانیوں کو پڑھ کر ہمیں

انگلش میں تبصرے موصول ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس زبان کے استعمال پر اطمینان محسوس نہیں کرتے۔ ہم شرمندہ ہوتے ہیں تو اب تک بھی ہم نے اسے کیوں اپنایا ہوا ہے؟

دنیا میں کچھ ممالک ایسے ہیں جنہیں کوئی دوسری تیسری زبان چھو کر بھی نہیں گزری۔ پھر بھی یہ ممالک ترقی یافتہ ہیں۔ جیسے چین جرمنی، جاپان، شمالی امریکا، افریقہ وغیرہ کے بہت سے ملک۔ اب ان ملکوں میں سیاح بہت جاتے ہیں لیکن پھر بھی ان ملکوں کی سڑکوں اور ایسی ہی دوسری جگہوں کے نام "ان کی اپنی زبان" میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

کئی ملک ایسے ہیں کہ پورے ملک کا سسٹم ہی ان کی اپنی زبان میں ہے۔ لیکن پھر بھی ان ملکوں نے ترقی کی ہے اور بہت زیادہ کی ہے۔ ہمارے یہاں جو انسان پڑھا لکھا بھی نہیں ہے وہ بھی بیس تیس الفاظ انگلش کے بول ہی لیتا ہے لیکن ان ملکوں میں ایسے لوگ ہیں جو بہت پڑھے لکھے ہیں اور وہ مشکل سے انگلش کے چار پانچ لفظ جانتے ہیں۔

جاپان اس کی زندہ اور سب سے عظیم مثال ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اور خاص طور پر "ایٹم بم" کے دھماکے کے بعد جاپانیوں نے عہد کر لیا تھا کہ

وہ ہمیشہ پرامن رہیں گے۔ ابھی کسی طرح کی جنگ میں نہیں کودیں گے۔ وہ کام، کام اور بس کام کریں گے۔ جنگ کے بعد سارا جاپان اجڑ کر تباہ چکا تھا۔

جاپان کی کمرٹھ چکی تھی۔ ایسا سمجھ لیں جاپان کوڑے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ لیکن ایسا ہوا کہ جاپانیوں کے پاس جو کچھ تھا۔ جو کچھ اپنا تھا انہوں نے اس کے بل بوتے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ تین عشروں کے بعد دنیا بھر سے لوگ بھر بھر کر جاپان جانے لگے ان کی چکا چوند ترقی کا راز جاننے کے لیے۔ ان کی ترقی کا راز تھا۔ "قوی غیرت"۔

ان کا ملک ان کی شرافت، ان کی زبان ان کے اصول ان کا اخلاق، ان کا اپنا "قاعدہ"۔

آج ساری دنیا جاپان کی ترقی کا ان کا اپنے ہاتھوں سے لکھا ہوا "قاعدہ" پڑھ رہی ہے۔

میں ایک ایسے کو بہن کو جانتی ہوں جو فخر سے اپنی زبان اپنیشن (ہسپانوی) بولتا ہے۔ جب مجھے اس سے بات کی ضرورت پیش آتی تو اس نے کہا کہ میں ٹرانسلیٹر کا استعمال کروں۔ اور اپنی زبان کو اس کی زبان اپنیشن میں ترجمہ کر کے اس سے بات کروں۔ میں نے کہا سب کو انگلش آتی ہے آپ کو کیوں نہیں آتی تو اس نے کہا کہ "یہاں کسی کو انگلش نہیں آتی۔ مجھے میری زبان اپنیشن آتی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔"

طے یہ پایا کہ ہم باری باری اپنی اپنی زبان میں بات کریں گے۔ ابھی اپنیشن ترجمہ ہوئی اور بھی اردو۔ لیکن میں یہ خوشی حاصل نہیں کر پائی کہ کوئی غیر ملکی مجھ سے میری زبان میں بات کرے کیونکہ ٹرانسلیٹر اس کی زبان کا ترجمہ تو بہت اچھی طرح سے کر رہا ہے لیکن میری زبان میں۔

جن قوموں نے ترقی کی انہوں نے اپنی زبان کو بھی ترقی دی، اور ان چیزوں کو بھی جن میں ان کی زبان استعمال ہوتی تھی۔ ظاہر ہے اب غیر ملکی انٹرنیٹ کمپنیوں یا ایپ کمپنیوں کو کیا مصیبت پڑی ہے

کہ وہ "اردو ٹرانسلیٹر" بنائیں۔ قرض تو ہم پر ہے کہ ہم ایسا ٹرانسلیٹر بنا میں جو ہماری زبان کو دنیا کی کسی بھی دوسری زبان میں بہترین انداز میں ترجمہ کر سکے اور وہ ان لائن میسر بھی ہو۔

میں اس بات پر بحث کر رہی نہیں رہی کہ ہمارے اسکولوں، نصاب، حکومتی سطح اور فردوں میں غیر ملکی زبان کیوں استعمال ہوتی ہے۔ میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں یا آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ ہمارے دلوں میں اردو کیوں نہیں ہے؟؟ ہماری زبان اسے بولتے ہوئے پہچنتی کیوں ہے۔

دنیا کی کوئی بھی زبان جو سیکھی جاتی ہے وہ کسی خاص مقصد کے تحت سیکھی جاتی ہے۔ آپ بھی زبانیں سیکھیں لیکن مقصد کے لیے۔ یہ ترقی میں مددگار ثابت ہوتی ہیں تو انہیں ترقی کے لیے ہی استعمال کریں اپنی زبان کو کمتر ثابت کرنے کے لیے۔

ایک غور طلب بات ہے کہ اردو کے بہت سے الفاظ ہم سب نے مل ملا کر پرانے کر دیے ہیں۔ انگلش زبان کا لفظ ٹھیک ہو ہماری پوری کی پوری زبان سے زیادہ پرانا ہے۔ لیکن آج بھی یہ لفظ بہت شوق سے ادا کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ زندہ بھی ہے اور تر تازہ بھی۔ لیکن ہمارے یہاں اردو بولنے والوں کو "بڑا چٹلون، محترم، جامنی، ہتھی، وغیرہ کہتے ہوئے بڑا پرانا پن محسوس ہوتا ہے۔

اگر بڑوں نے اپنی زبان نہیں چھوڑی اس لیے ان کی زبان آج بھی زندہ اور تر تازہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ٹیلی ویژن کے وقت کی انگلش اور آج کی انگلش میں بہت فرق ہے لیکن یہ فرق ان کی زبان کا ان کی زبان سے آیا ہے۔ اس میں کوئی تیسری یا چوتھی زبان اگر شامل نہیں ہوگی۔ زبانیں دوسری زبانوں کا اثر لیتی ہیں۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوتی۔ لیکن تب برا ہوتا ہے جب اثر لیتے لیتے زبان خود کو پوری طرح ختم ہی کر لیتی ہے۔

آپ شکر یہ کی جگہ ٹھیک ہو کہہ لیں۔ سیاہ کو

بلیک، کرسی کو چیئر۔ لیکن یہ یاد رکھیں، آج ہم تین لفظوں کو زبان سے نکالیں گے تو کل وہ تیس ہو جائیں گے۔ پرسوں تین سو۔ اور تیس چالیس سالوں کے بعد وہ "تین چار سو" الفاظ بنیں گے جو اردو کے ہوں گے۔ باقی ساری زبان "انگلش" میں دخل چکی ہو گی۔ اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو جہاں آپ بیٹھے ہیں وہاں ہے ایک ایک چیز کا نام لینا شروع کریں۔ اور انہیں کتنی چیزوں کے نام آپ اردو میں لے ہی نہیں سکتے یا لیتے ہی نہیں۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم اپنی زبان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔

اتصل کے پاس کہانیاں آتی ہیں اور وہ ان میں موجود گرائمر زبان و بیان کی غلطیاں درست کر کے انہیں شائع کر دیتی ہیں۔ وہ بھی کبھی کسی سے یہ نہیں کہتیں کہ تمہاری کہانی میں گرائمر اور زبان و بیان کی اتنی غلطیاں تھیں۔ انہیں ٹھیک کر دو۔ یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے۔

نئے لکھنے والے مجھ سے اس خوبی کی امید نہ رکھیں۔ میں صاف صاف آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ اپنی اردو ٹھیک کریں۔ زبان و بیان درست کریں۔ روز کے دو لفظ سیکھیں۔ اگر واقعی میں آپ نے کوئی کمال کرنا ہے تو اپنی زبان کو آج سے ہی سیکھنا شروع کر دیں۔ زیادہ فخر اور زیادہ ذمہ داری ہے۔ آپ کو ان لوگوں میں شامل نہیں ہونا چاہیے جو فخر سے کہتے ہیں کہ "ہمیں تھوڑی سی اردو" آتی ہے۔ آپ کو تھوڑی سی اردو نہ آئے لیکن پوری سے کچھ کم ضرور آتی چاہیے۔ میں پاکستانی ہوں جو زبان اتنا طویل سفر طے کر کے مجھ تک آئی ہے وہ زبان میری ذمہ داری ہے آپ بھی اپنی ذمہ داری نبھائیں اور اس زبان کو اور ترقی دیں۔ دنیا کی خوب صورت ترین زبانوں میں شمار ہونے والی زبان "اردو" کو زبان ہی رہنے دیں اسے دھکیل کر پھر سے بولی نہ بنا دیں۔ جس کی تکمیل کا فیصلہ آسانی تھا اس کی بربادی کا فیصلہ زمین پر نہ کریں۔

☆

س ”شادی کب ہوئی؟“
ج ”15 اپریل ماہ رجب جمعہ المبارک 2016ء۔“

س ”شادی سے پہلے مشاغل؟“
ج ”گھر کے کام کاج - بھائیوں کی ذمہ داری - صفائی ستھرائی - ڈائجسٹ پڑھنا - کتابیں پڑھنا - ٹی وی دیکھنا۔“

س ”رشتے میں مرضی؟“
ج ”ہم سے مرضی پوچھی ہی کب گئی تھی۔ ویسے ہمارے بلوچی ماحول میں عورتوں سے پوچھا نہیں جاتا سراسر والدین کی رضائے رشتہ طے ہوا۔“

س ”جیون ساٹھی کے حوالے سے تصور؟“
ج ”بااخلاق - خوش گفتار - مہذب - نمازی، دین دار پر جو ماں باپ نے چنا تھا۔ دل جان سے قبول کیا تھا اسی وقت۔“

جب تجھ سے تانا جوتا ہے

ع - ۲



س ”دوستی کتنا عرصہ چلی؟“
ج ”پانچ سال۔“

س ”شادی کے لیے قربانی؟“
ج ”کوئی نہیں۔ بس اللہ کی طرف سے اور بڑوں کی مرضی سے رشتہ طے ہوا۔“
س ”رسموں پر کوئی جھگڑا؟“
ج ”جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔“

س ”شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟“
ج ”دیکھ کر ماشاء اللہ کہا اور شروع ہو گئے نصیحتیں کرنے۔ ایسا کرنا دیکھا کرتا۔ میرے ماں باپ بہن بھائیوں کا خیال رکھنا دیکھو وغیرہ۔“

س ”شادی کے بعد تبدیلی؟“
ج ”بہت زیادہ آئی بلکہ لائی گئی زبردستی وہ ایسے کہ اپنی پسند ناپسند چھوڑ کر ان کی پسند کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑا اگر میں پسند ناپسند کا اظہار کرتی تو ہر فرد طنز اور مذاق پر اتر آتا۔ اس لیے خاموشی سے ویسے بدلتی گئی جیسوہ لوگ چاہتے تھے۔“

س ”کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“
ج ”شادی کے تیسرے دن کھیر پکائی۔ چوتھے

دن امی والوں نے دعوت دی۔ پانچویں دن کام شروع کیا تقریباً سارا کام سوائے سائن کے وہ میری ساس نے آج تک پکانے نہیں دیا کیونکہ سر صاحب کی اجازت نہیں۔ وہ میری ساس کے ہاتھ کے علاوہ کسی کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاتے۔ ایک دن ساس کی غیر موجودگی میں سائن بنایا اور تحفہ خوب ساری گالیاں ملیں۔“

س ”میکے اور سسرال کے کھانے میں فرق؟“
ج ”کچھ خاص نہیں۔ بس سادہ سا کھانا ہاں مگر کھانا کھانے میں یہ فرق تھا کہ میکے میں سب کی پسند ناپسند کا خیال رکھا جاتا اور سب اپنی مرضی سے کھاتے ہیں۔ جبکہ یہاں ساس اپنی مرضی سے جودل چاہتا منگوا کے پکائی اور اپنے ہاتھ سے دیتی ہیں پھلے کسی کے لیے کم ہی نہ ہوا اور اپنی تعریف خود ہی سب

سنے زیادہ کرتی اور گھر والے بھی رطب اللسان ہوتے اور دوسرے لوگوں پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔“
س ”سسرال میں کس بات پر تحریف، تنقید ہوئی؟“

ج ”تعریف تو یا نہیں۔ تنقید بے حد اور بے شمار ہوئی۔ بیٹھنے اٹھنے سونے جاگنے کام کرنے غرض ہر چیز پر تنقید کا سامنا ہوا ہاں مگر شوہر ہمیشہ تعریف کرتے ہیں سانسے اور اگر کبھی کبھار گھر والوں کے سانسے کرتے ہیں تو رد کی جاتی ہے۔ پر میرے شوہر ہمیشہ میرے کام کو سراہتے ہیں دل سے کیونکہ میرے میکے والے بھی مجھے ہر کام میں ماہر گردانتے تھے اپنی تعریف نہیں کر رہی سب کہتے تھے۔“

س ”سسرال سے وابستہ توقعات کہاں تک پوری ہوئیں؟“

ج ”ہم توقعات؟ جب تک منافقت کا پردہ نہ ہٹا اور میری آنکھوں سے تصوراتی پٹی نہ کھلی لگتا تھا میری تمام توقعات توقع سے زیادہ پوری ہوئیں (کیونکہ میری ساس بیٹھی چھری تھیں اور وہ جیسا کہتیں سب دیا ہی کرتے) آہستہ آہستہ حقیقت واضح ہوئی اور مکر وہ صورتیں سانسے آئیں اور پھر لگا میں کہاں پھنس گئی جہاں کوئی سننے والا نہیں۔ سب بولنے اور زیادہ بولنے۔ لڑنے جھگڑنے کے شوقین۔“

س ”پہلے بچے کی پیدائش؟“
ج ”دوسرے مہینے ابارش ہوتے ہوتے بچا اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ اتنی تکلیف کے بعد بھی بچا رہا۔ میرے رب کی مہربانی ہے پورے آٹھ ماہ کے بعد بچہ ہوا اور اتنا عرصہ میں نے جیسے گزارا۔ مجھے پتا ہے کنواری نندیں بھی ان ڈائریکٹ طعنے دیتیں اللہ کا شکر ہے بس دعا کریں۔“

س ”سسرال میں مقام؟“
ج ”ابھی تک تو دوسرا درجہ ہی ملا پہلا درجہ ساس اور نندوں کو حاصل ہے۔ چھوٹی نندی بھی ایسے حکم چلاتی ہیں جیسے میں باندی غلام ہوں۔“

س ”سسرال میں مقام؟“
ج ”ابھی تک تو دوسرا درجہ ہی ملا پہلا درجہ ساس اور نندوں کو حاصل ہے۔ چھوٹی نندی بھی ایسے حکم چلاتی ہیں جیسے میں باندی غلام ہوں۔“

س ”میکے اور سسرال میں فرق؟“
ج ”فرق بہت زیادہ محسوس ہوا۔ میکے میں ہر چیز اپنی اور اپنائیت تھی۔ دو غلامین اور مقابلے بازی نہیں تھی جب کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے حتیٰ کہ اپنی چیزیں بھی اپنی مرضی سے استعمال نہیں کر سکتی چائے تک ساس اپنے ہاتھ سے نکال کر دیتی ہیں۔ آدھا کپ سردیوں میں بھی کبھار پورا کپ پینے کی خواہش ہوتی ہے تو خواہش ہی رہ جاتی ہے اور سب کے سانسے کہتی ہیں کہ

”سب کچھ بڑی بہو کا ہے اور اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ گھر بھی اس کا ہم بھی اس کے۔“ میکے میں سب ساتھ ساتھ تھے۔ دوستانہ ماحول تھا۔ بھابیوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ اور یہاں سب نے مل کر مجھے تیار کر دیا۔ کوئی بات ہوئی آغاز ان میں کسی ایک سے ہوتا ہے اور سب مل کر مجھے سناتے ہیں کوئی کالیاں طعنے، جھگڑا طول پکڑ جاتا ہے اور غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی سب سے آخر میں مجھے معافی مانگنی پڑتی ہے۔

پہلی عید پر جب نند شاہنگ کے لیے جاری تھی۔ میں نے کپڑوں کے لیے شوہر سے ایک ہزار مانگا اور سب شروع ہو گئے ساس صاحبہ نے پورا ایک گھنٹہ جھگڑا کیا۔ دیوروں نے کوئٹے طعنے دیے نندوں نے الگ اور پھر ساس صاحبہ بے ہوش ہو گئیں۔ میں اس سب میں کھلے منہ اور کانپتے جسم کے ساتھ حیران پریشان کھڑی رہی اور جب ساس ہوش میں آئیں تو شوہر کے کہنے پر معافی مانگنی پھر بڑی مشکلوں سے اپنے اتنے بڑے کبیرہ گناہ کی معافی ملی۔ شادی سے پہلے یہی ساس نندیں واری صدمہ جاتیں۔ پہلی اور عمدہ شاہنگ کر کے لائیں اور اب اخیر یہ سارے مکر وہ چہرے صرف مجھ پر عیاں ہوئے ہیں۔ دوسرے ان کی خوش اخلاقی کے گرویدہ ہیں جو سب کے سانسے منہ پر ہوتی ہے جیسے یہ وہ دور ہوتے ہیں۔ ان کی غیبتیں شروع ہو جاتی ہیں میں پہلے والے حالات اور بعد والے خیالات دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں۔“

جب تجھ سے نکاح چڑھے

ع-ط

سوال:- ”شادی کب ہوئی؟“

جواب:- ”12 اکتوبر 1978ء“

سوال:- ”شادی سے پہلے کے مشاغل؟“

جواب:- ”مشاغل نہیں، مشغلہ صرف اور

صرف پڑھنا، شاید ہی کوئی رسالہ چھوڑا ہو۔ زندہ می ہارر ناول تھا۔ ساتویں کلاس میں تھی جب نصاب کی کتاب کے اندر چھپا کر کلاس میں بیٹھ کر پڑھا۔ اردو ڈائجسٹ سے لے کر اخبار جہاں، مسٹری میگزین، عمران ڈائجسٹ سب پرچے پڑھے اور بریکنگ شعل اور خواتین پڑھے۔“

ہم نے جس جس کو چاہا تیرے بھراں میں وہ لوگ آتے جاتے موسم تھے، زمانہ تو تھا سوال:- ”رشتے میں مرضی؟“

جواب:- ”سولہ سال کی عمر میں شادی ہوئی، ڈھائی سال کا عرصہ منگنی کا۔“

تو خود ہی اندازہ لگائیں۔ اتنی عمر میں اور اتنے پرانے دور میں مرضی پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر بھی اتنا عرصہ منگنی رہے تو مرضی شامل ہو ہی جاتی ہے۔ طارق میرے ماموں زاد تھے۔ ظاہر ہے، اتنا قریبی رشتہ تھا تو شادیوں وغیرہ یہ آنا سامنا ہو جاتا تھا، پھر سارے کزنز مل کر وہ شہر کرتے کہ پوچھیں مت لڑکیاں مجھے چھپانے میں لگی رہیں اور لڑکے ان کے ساتھ مل کر آخرا کر ڈھونڈ لیے۔ بس اسی لگاچھپی میں ایسی محبت ہوئی، ساری زندگی ایک دوسرے کے بغیر جتنا محال تھا۔“

سوال:- ”منگنی کتنا عرصہ رہی؟“

جواب:- ”منگنی کا عرصہ ڈھائی سال پر محیط تھا۔“

سوال:- ”شادی کے لیے قربانی؟“

جواب:- ”کوئی قربانی نہیں دینی پڑی، بس جو

رسالے بہ بانگ دہل پڑھا کرتی تھی، چھپ کر بڑھنے پڑے، کیوں کہ ماموں چونکہ امام مسجد تھے، گھر کا ماحول مذہبی تھا تو اتنی پابندی تو لگنی ہی تھی، مگر چار دیواری میں پسینے، اوڑھنے کی مکمل آزادی تھی۔“

سوال:- ”رسموں کے لین دین میں کوئی جھگڑا؟“

جواب:- ”ہمارے خاندان میں فرسودہ رسم کی رسمیں ہوتی ہی نہیں تو جھگڑا کیسا۔“

سوال:- ”شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟“

جواب:- ”بس اپنے بارے میں اور سب گھر والوں کے بارے میں بتاتے رہے اور میں سوتی جاگتی کیفیت میں سوتی رہی۔“

سوال:- ”شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟“

جواب:- ”بہت خوش گوار تبدیلیاں آئیں۔ میں اپنے اسی ابو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ادھر ماشاء اللہ دس بہن بھائی تھے جن میں سے تین نندیں اور دو جیٹھ

شادی شدہ تھے اور سب چار چار بچوں کے والدین بن چکے تھے۔ جوائنٹ فیملی تھی۔ مجھے تو بڑا مزہ آیا۔ اتنے ڈھیر سارے بھائی بہن مل گئے، مجھے تو لگتا تھا کہ جانے کس نیکی کے انعام میں مجھے یہ سب مل گئے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ نے میرا خیر ہی محبت کی مٹی سے بنایا تھا۔ سب سے بہت زیادہ محبت کی اور بہت زیادہ مائی بھی۔“

سوال:- ”کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“

جواب:- ”شادی کے ایک ماہ بعد میرا ہاتھ کھیر میں ڈلوایا گیا، بقر عید کی توای جان (ساس) نے دس منٹ کھیر میں چھچھوایا اور کہا۔ ”جاؤ جا کر سو جاؤ۔“

بس یہ کام تھا جو میں نے کیا۔ بعد میں بھی بہت عرصہ میں نے کام نہیں کیا۔ فیملی بہت بڑی تھی۔ بیکے میں تین لوگ اور سسرال میں تقریباً بیس لوگ تھے، چونکہ میں اکلوتی تھی۔ اس وجہ سے ای نے پھیلی کا کھانا بنا کر پالا تھا، تو میں ہلکے ہلکے کام کرنے کی عادی تھی

اور یہاں بڑے بڑے کام۔

جب میں نے پہلی مرتبہ کپڑے دھوئے تو میرے ہاتھ کپڑے دھونے والے صابن سے زخمی ہو گئے تھے۔ پوروں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو گئے جن سے خون رستا تھا۔ امی ہر آنے والے کو میرے ہاتھ دکھاتیں اور کہتیں۔

”دیکھو، آج ہماری دہن نے کپڑے دھوئے اور ہاتھ زخمی ہو گئے۔“

ہنڈیا میں بہت اچھی ہناتی تھی، مگر وہ بھی بناتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ تقریباً سال بعد میں نے سارے کام سیکھے۔ میری چھوٹی دو نندیں کنواری تھیں، ہم نے بالکل بہنوں اور دوستوں کی طرح گزارا اور میں نے اپنی بڑی پیاری بہن اور دوست (صدیقہ) سے سارا پٹہ

سنے سنے سے سیکھا۔ پھر بڑی بڑی دھوتوں کا کھانا بنایا اور اللہ کا شکر ہے بہت محبت اور تفریق پائی۔

سوال:- ”میکے اور سسرال کے کھانوں میں کیا فرق؟“

جواب:- ”کافی فرق تھا، کیونکہ میکے میں ہم تین لوگ تھے، ادھر فیملی بڑی تھی اور پکانے والا ایک ہاتھ نہیں تھا۔ میں میری دو جھانیاں اور ایک

مند (صدیقہ) یوں ہم چار لوگ باری باری ہنڈیا پکاتے تھے، ہر بندے کی چوتھے دن باری آتی تھی۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد کھانا کھایا جاتا تھا۔ اباجی چونکہ امام مسجد تھے۔ انہوں نے مسجد میں اٹھنا ہوتا تھا، تو

دہ عشاء کی نماز کے فوراً بعد سو جاتے تھے، اس لیے مغرب کی نماز کے بعد وہ کھانا کھالیتے تھے۔ چاہے وہ کچا پکا ہی ہوتا، نہک کم ہوتا تو اور ڈال لیتے۔ اگر زیادہ ہوتا تو پانی ڈال لیتے غرض کہ کھانے کے معاملے میں ہمیں کچھ نہیں کہا جاتا اور میرا خیال ہے، جس گھر کے مرد کھانے کے بارے میں اتنے لاپرواہوں وہاں

شاڈ ہی ہنڈیا اچھی بنتی ہے۔ سوال:- ”سسرال میں کن باتوں پر تعریف، تنقید ہوئی؟“

جواب:- ”تعریف اور تنقید دونوں ہی چلتی رہیں، ظاہر ہے پر فیکٹ تو صرف اللہ کی ذات ہے۔

انسان میں لاکھ اچھائیاں ہوں، مگر کوئی ایسا نہیں ہے۔

مجھے غصہ بہت جلدی آتا تھا، تو غلامانہ فطرت میں انسان کو خود پر کنٹرول نہیں رہتا تو تنقید کی۔ ہمیشہ یہی رہی، مگر ایک بات تھی، اگر کسی کا دل ہاتھ نے دکھ جاتا تو فوراً معافی مانگ لیتی تھی۔ منانے میں بھی دیر نہیں کی۔ ہم پندرہ سال جوائنٹ فیملی میں رہے اور ہمارے گھر کا ماحول اتنا اچھا تو تھا جو ہمارے گھر آتا۔

اس کا دل کرتا کہ وہ بیٹیں رہ جائے۔ گھروں میں تو سب ہی رہتے ہیں، ہم سارے ایک دوسرے کے دلوں میں رہتے تھے۔ مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔

بہت سے لوگ دنیا سے جاتے جاتے ہیں، جن میں میرے شوہر بھی ہیں۔ میرا خیال ہے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو فطرتا برے ہوں گے، اگر بڑے محل اور بروہاری سے کام لیں اور چھوٹے عزت و احترام ملحوظ خاطر رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ گھر خوشیوں کے بھوارے نہ

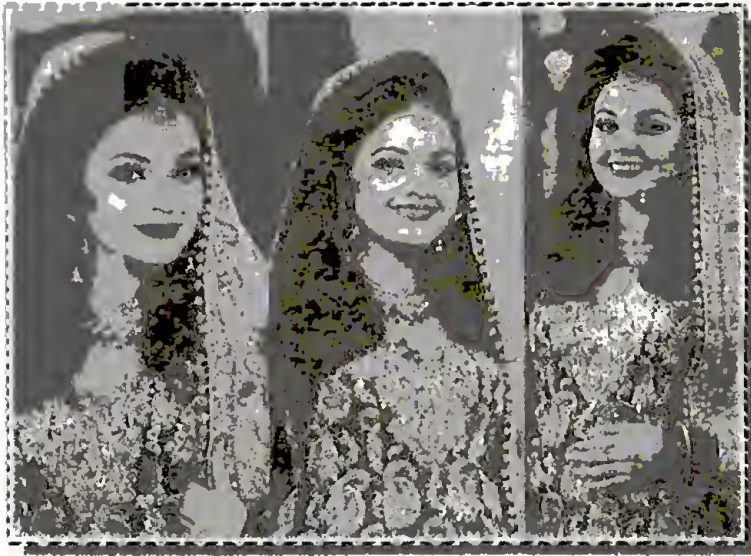
ہوں، جیسا کہ کہتے ہیں۔ ”سب سے بڑا گنی وہ ہے جو اللہ کی تقسیم پر شاکر ہے۔“

اگر بندہ یہ سوچ لے تو پھر کبھی پریشان نہ ہو۔ مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ تجربہ ایسی تھی ہے جو انسان کو تب میسر آتی ہے جب سر پہ کوئی بال نہیں رہتا۔

سوال:- ”سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟“

جواب:- ”چھوٹی عمر میں شادی ہوئی۔ عقل بھی چھوٹی تھی۔ توقعات بھی چھوٹی اور بے ضرر تھیں۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے بہت پیار ملا اور مجھے لگتا ہے محبت سے بڑی دولت نہ ہے، نہ ہوگی، بس یہ ہی توقع رکھی تو اللہ کا شکر ہے کہ محبت ہم سفر رہی، کبھی ماں باپ کی صورت، کبھی بہن بھائیوں اور دیگر رشتوں کی صورت۔

سب رشتوں کا جتنا مجھ پر حق تھا۔ اس سے بہت زیادہ ادا کیا یا وصول کیا گیا۔ اتنا کہ میں خالی دل، خالی ہاتھ رہ گئی۔ شوہر کے بے وقت موت نے جو قیامت ڈھائی۔ وہ علیحدہ اور رشتوں نے جو قیامت ڈھائی وہ



معروف ننگ

عشا نور سے ملاقات

شاہین رشید

”ہاسی اور ملکہ“۔ ”میری ماں“۔ ”ڈیلیز“۔ ”وارث“۔ ”ردگ“۔ ”ہونے لگا تم سے پیار“۔ ”بابا کی اونچی چوٹی“۔ ”صحرا میں سفر“۔ ”بیچاری مہر النساء“۔ ”میرا آئین“ اور نور زندگی ایسے پروڈیوٹس تھے جو بہت زیادہ پسند کیے گئے اور ان سب میں میرا کام، میرے کردار بھی بہت اچھے تھے۔“

”صحافیوں کو انٹرویو دینے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ صحافی کا کردار کرنا کیسا لگا تھا؟“

”بہت اچھا لگا..... اور میرا یہ کردار پسند بھی کیا گیا۔ اور میرے اس کردار نے یا میری پرفارمنس نے میرے لیے مزید راستے ہموار کیے۔ فلم ”راستہ“ میں صحافی کے کردار نے مجھے خاصی شہرت دی۔“

”فلم ”راستہ“ میں تمہارا انتخاب کیسے ہوا؟“

”ساحر لودھی صاحب میرے بارے میں

معصوم اور مشرقی خدوخال کی خوب صورت اداکارہ عشا نور ترقی کا راستہ آہستہ آہستہ طے کرتے ہوئے فلم میں کامیابیاں سنبھالنے کی منتظر ہے اور اپنی پہلی ہی فلم میں صحافی کا رول کر کے کافی حد تک فلم کے لیے اپنی جگہ ہموار کر لی ہے۔

”کیا حال ہیں عشا جی؟“

”الحمد للہ۔“

”کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“

”مصروفیات کے بارے میں کیا بتاؤں..... اس فیلڈ کی ہی مصروفیات ہیں۔ کچھ مکمل ہو چکے ہیں پروڈیکٹ کچھ ہونا باقی ہیں۔ اس لیے کچھ بتا نہیں سکتی۔“

”اب تک آن ایر کیا کیا آچکا ہے؟“

”آن ایر تو ماشاء اللہ بہت کچھ آچکا ہے۔ پھر بھی جو یاد ہیں، وہ آپ کو بتاتی ہوں۔“ خوشبو کا گھر

تو صبر ہی دے، کیونکہ میں بہت روتی تھی بچی کے لیے اور پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے صبر کی نعمت سے مالا مال کر دیا اور مجھے بچی کے لیے روزانہ بھول ہی گیا، کیوں کہ آگے جا کر میرے لیے صرف رونا ہی تھا۔

سوال:- ”جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟“

جواب:- ”جوائنٹ فیملی سسٹم ہی پسند تھا، کیونکہ ہم نے تو بہت اچھا وقت گزارا، مگر جب بیٹوں کی شادیاں کیں تو وہ بات نہیں بنی، جب تک میرے شوہر حیات رہے، سب ٹھیک تھا، مگر ان کے جاتے ہی جو کچھ ہوا۔ اس نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے۔ پھر بھی لکھوں گی، اس لیے کہ موضوع یہ نہیں۔“

سوال:- ”شوہر سے تعلقات؟“

جواب:- ”بہت ہی اچھے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، میں نے تو بھی تصور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“

توں اک ہل دی ہے ریا اس او ہل جینا دی مشکل سی ہن اپنے جین تے حیرت اے کنوے تل تل کے اسی مرنے آں ترجمہ:-

”تم ایک ہل بھی جو ناراض ہوئے وہ ہل جینا کتنا مشکل تھا“

☆

الگ، چونکہ ان باتوں کا اس سروے سے کوئی تعلق نہیں، روائی میں بات کہاں سے کہاں جا چکی، اس کے لیے معذرت۔

سوال:- ”سسرال میں وہ مقام ملا جس کی توقع تھی؟“

جواب:- ”سسرال میں مقام بنانا پڑتا ہے، جب میری شادی ہوئی تو میری دو جھنائیاں تھیں، بہت اچھی تھیں، مگر مجھے لگا کہ کچھ کمی ہے، سو جا جب میں جھنائی بنوں گی تو لوگ مثال دیں گے کہ جھنائیاں ایسی بھی ہوتی ہیں اور صد شکر کہ میں کامیاب رہی۔ میری دو دیورائیاں ہیں، بہت عزت کرنی ہیں۔ سب سے چھوٹی تو مجھے ماؤں جیسا مان ویتی ہے، حالانکہ مجھ سے صرف نو سال چھوٹی ہے، میرے شوہر کی وفات کے بعد صرف وہی نہیں بدلی، اللہ اسے جزا دے۔ (آمین)

سوال:- ”میکے اور سسرال میں فرق؟“

جواب:- ”میکے اور سسرال کا فرق کیا بتاؤں، بڑا تکلیف دہ ہے، سسرال کو چھوڑ کر میکے جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ سب سے اتنا پیار تھا کہ لگتا تھا میں سب کے بغیر جی نہیں پاؤں گی، مگر شوہر کے بعد یہ ہی بات سمجھ میں آئی کہ.....

جب تک ہنستا گانا موسم اپنا ہے، سب اپنے ہیں وقت پڑے تو یاد آ جاتی ہے سب کو اپنی مجبوری شوہر کا جانا ہی میرے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ بعد میں سب کا بدلنا اس سے بھی تکلیف دہ۔ شاید سب کے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے یا میں نے زیادہ محسوس کیا ہے۔

☆



لیتی ہوں۔ ہر آخر پر بہت غور و خوض کے بعد ہاں کرتی ہوں..... اور اگر آپ نے میرے ڈرامے دیکھے ہوں تو آپ نے خود محسوس کیا ہو گا کہ میں نے اب تک جتنے کردار کئے ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے اور آگے بھی آپ ہمیشہ مجھے مختلف رولز میں ہی دیکھیں گی۔“

”بھی تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟“

”سچ بتاؤں..... لوگ مجھ پر تنقید کم اور میری حوصلہ افزائی زیادہ کرتے ہیں۔ کیونکہ اچھا کام سب کو نظر آتا ہے۔ اور مجھے خود بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں نے کہاں غلطی کی ہے اور پھر میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنی غلطیوں کو دور کروں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ اپنی غلطیوں پر نظر رکھتی ہیں؟“

”بالکل جی..... میں اپنی نقاد اور اپنی استاد خود ہوں۔ میں اپنے ڈرامے دیکھتی ہی اس لیے ہوں کہ اپنی غلطیاں دیکھوں، اپنی پر فارمنس کی کمزوریاں دیکھوں اور پھر دور کرنے کی کوشش کروں۔“

”کیا اداکاری سیکھی جاسکتی ہے؟“

”بالکل سیکھی جاسکتی ہے اور لوگ سیکھتے بھی ہیں۔ میں لوگوں سے، ڈائریکٹر سے اور دوسروں کی پر فارمنس سے سیکھتی ہوں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ میں اپنے آپ سے سیکھتی ہوں۔ میں اپنی استاد خود ہوں۔ اور اپنے آپ سے بھی بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”عشما ماشا اللہ آپ اتنی ذہن ہیں۔ اپنی استاد بھی خود ہیں تو پروڈکشن یا ڈائریکشن کی طرف کیوں نہیں آ جاتیں؟“

”بہت دل چاہتا ہے کہ ”عشما نور“ کے نام سے اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولوں..... مگر اس کے لیے پیسہ..... اور میں بہت جلدی اپنی اس خواہش کو پورا کروں گی، اور جب پروڈکشن ہاؤس بن گیا تو پھر ڈائریکشن کی بھی کوشش کروں گی کہ اس جانب بھی

”میرا تو خیال ہے کہ ہمارے ڈراموں کا معیار بہت عمدہ ہے۔ تب ہی تو پروڈی ملک میں بھی ہمارا ڈرامہ بہت دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں ہمارا ڈرامہ بہت دیکھا جاتا ہے۔“

”دیگر جہاز میں تو کہا جاتا ہے کہ محنت کریں..... اداکاری میں بھی محنت ہوگی۔ مگر کس قسم کی؟“

”سب سے بڑھ کر آپ کو پورا اسکرپٹ پتا ہو کہ کیا ہے۔ کہانی کیا ہے۔ آپ کا کردار دوسروں کے ساتھ کتنا لکڑ (Linked) ہے پھر آپ کے کردار کی کیا ڈیمانڈ ہے۔ پوری دل دینی سے کام کریں تو کامیابی یقینی ہے۔ ہم اپنا پیار فارم کریں گے تو رائٹر اور ڈائریکٹر کو بھی خوشی ہوگی اور آگے مزید راستے کھلیں گے۔“

”آپ ڈراموں کے اچھے معیار کی بات کر رہی ہیں جبکہ ڈراموں کے موضوعات تو تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں؟“

”نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ آج کل تو بلکہ نئے نئے اور بولڈ موضوعات پہ ڈرامے بن رہے ہیں۔ پہلے کبھی بولڈ موضوعات پہ ڈرامے نہیں بنے تھے۔ اب کبھی کبھار ہی ڈرامے یکسانیت کا شکار لگتے ہیں مگر ہمیشہ نہیں۔“

”ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ اگر کوئی فنکار کسی ایک کردار میں مقبول ہو گیا ہے تو پھر اسے اسی طرح کے رول کی آفرز ہونے لگتی ہیں؟“

”بالکل ایسا ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے..... بے شک ایک اچھا رول فنکار کی پہچان بن جاتا ہے مگر اگر وہ مسلسل اسی انداز کے رول کرے گا تو اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ نہیں بلکہ کمی ہی آئے گی۔ اس لیے فنکار کو اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔“

”آپ احتیاط سے کام لیتی ہیں؟“

”جی..... جی..... میں تو بہت احتیاط سے کام

جیسے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے مارٹنگ شو میں بلایا اور پھر مجھے اپنی فلم کے لیے منتخب کر لیا..... میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح میرا انتخاب ہو جائے گا۔ جبکہ میں فلم کے لیے کئی آڈیشنز دے چکی تھی۔ تو میں ساحر لودھی بھائی کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے فلم میں کام کرنے کا موقع فراہم کیا اور میری صلاحیتوں پر اعتبار کیا۔“

”انڈیا سے بھی یقیناً آفرز آئی ہوں گی؟“

”بالکل جی..... جھوٹ نہیں بولوں گی۔ فلم ”راستہ“ سے پہلے مجھے انڈیا سے کئی فلموں کی آفرز آ چکی ہیں۔ لیکن وہاں کام کرنے سے پہلے مجھے یہ سوچنا ہے کہ میں ایک پاکستانی اور اسلامی ملک کی مسلمان لڑکی ہوں لہذا میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے میرے ملک پہ کوئی آج آئے یا میرے مذہب کے حوالے سے مجھ پر کوئی آج آئے..... اگر ایسا کوئی کردار ملا جو میری شخصیت اور ملک کو نقصان نہ پہنچائے تو میں ضرور کروں گی۔“

”پاکستانی فلمیں ہیں آپ کے پاس؟“

”فی الحال تو کوئی فلم سائن نہیں کی میں نے۔ آج کل میری ساری توجہ ڈراموں کی طرف ہے اور کئی سیریز انڈیا پروڈکشن ہیں۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی اچھا اور منفرد رول ملا فلم میں تو ضرور کروں گی ڈراموں کو ایک طرف کر کے۔“

”فلم اور ڈرامے میں کیا نمایاں فرق محسوس کرتی ہیں آپ؟“

”فقط یہ..... فرق تو صاف ظاہر ہے۔ فلم کی اسکرین سلور اسکرین کہلاتی ہے اور سب فلم میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ سب کا خواب ہوتا ہے فلم میں کام کرنا..... اور دوسرا فرق یہ کہ ڈرامہ انصاف پر مبنی ہوتا ہے فلم چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ فلم میں گانے، ڈانس اور ٹیکسی بہت ہوتی ہے۔ مجھے تو فلم ڈرامے سے ہر لحاظ سے مختلف ہی نظر آتی ہے۔“

”ڈراموں کے معیار سے آپ مطمئن ہیں؟“

”آؤں.....“

”بھی ٹیلیو رول کیا؟“

”اور ویسے کیا دل چاہتا ہے کہ کس قسم کے رول کروں؟“

”میں تو ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں۔ جو میرے کیے ہوئے پہلے رول سے ملنے جلتے نہ ہوں۔ میں چیلنج رول کرنا چاہتی ہوں۔ اور اپنی صلاحیتوں کو مزید منوانا چاہتی ہوں۔ اور ایک نئے پروڈکشن کے لیے میرا ٹیکو رول ہے۔ جب وہ آن ایر ہو گا تو آپ دیکھ کے بتائیے گا کہ کیسا رہا..... عازہ خان اور عمران عباس اس میں لیڈ رول کر رہے ہیں..... اگر اس رول میں مجھے میرے ناظرین نے پسند کیا تو مزید ٹیکو رولز کی آفر کو قبول کروں گی۔“

”کام کا مزہ کہاں ہے، کراچی یا لاہور؟“

”جہاں مزے کا کام ہو، وہاں ہی مزہ آتا ہے..... ویسے میں کام کے سلسلے میں لاہور ایک ہی بار گئی تھی جب ڈرامہ سیریل ”میں کون ہوں“ کی ریکارڈنگ تھی..... اور بس..... سارا کام تو کراچی میں ہوتا ہے۔ مجھے تو خبر کوئی مسئلہ نہیں۔ پورا پاکستان اپنا

دستک دستک دستک شکایتیں و شہید



آمنہ الیاس
”کیا حال ہیں؟“
”اللہ کا شکر ہے۔“
”ٹی وی اور فلم میں آپ بہت کامیاب ہیں۔
لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مگر سنا ہے کہ آپ ملنا
پسند نہیں کرتیں؟“
”ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں.....
درحقیقت میں فطرتاً بہت شرمیلی ہوں۔ زیادہ لوگوں
کے سامنے بولنا مشکل لگتا ہے۔ بس یہی بات ہے۔
ورنہ مجھے احساس ہے کہ آج جو کچھ بھی ہوں ناظرین
کی وجہ سے ہی ہوں۔“

”فیلڈ میں آنا شوقیہ تھا یا اتفاق؟“
”نہ شوقیہ نہ اتفاقاً..... میں اس فیلڈ میں ضرورتاً
آئی، ہمارے گھر کے حالات بہت اچھے نہیں تھے۔
والد کا انتقال ہماری کم عمری میں ہو گیا تھا۔ لہذا گھر کی
ساری ذمہ داری والدہ پر آ گئی تھی۔ جب میں تھوڑی
باشعور ہوئی تو خیال آیا کہ مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے۔
چنانچہ میں نے ماڈلنگ کی راہ اختیار کی اور اللہ نے
مجھے کامیاب کیا۔“

”امید تھی کہ کامیاب ہو جائیں گی؟ اور والدہ
نے کچھ اعتراض کیا؟“
”مجھے معلوم تھا کہ راستے کٹھن ہوں گے
ضروری نہیں کہ میں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جاؤں.....
ہو سکتا تھا کہ مجھے کوئی پسند ہی نہ کرے مگر۔ اتنا ٹکٹو
نہو جی تو شاید اس فیلڈ میں آئی ہی نہ..... میں پوزیٹو
سوچ کے آئی اور پوزیٹو ہی ہوتا چلا گیا۔ والدہ نے یہ
ضرور کہا کہ تم ابھی کم عمر ہو۔ اعتراض اس لیے نہیں کیا
کہ میری دو بہنیں بھی اس فیلڈ سے وابستہ تھیں.....
بس پھر اللہ کی مدد شامل حال رہی اور سب کچھ ٹھیک ہو

”کیا۔“
”کس نے متعارف کرایا؟..... اور اس وقت
آپ کی عمر کیا تھی؟“
”مجھے اس فیلڈ میں عاکف الیاس صاحب نے
متعارف کرایا۔ یہ ہمارے ملک کے ممتاز فوٹو گرافر
ہیں۔ یہ ہمارے فیملی فرینڈ بھی ہیں..... اس وقت
میری عمر سولہ سال تھی۔ اور ماڈلنگ میری پہچان کا پہلا
زینہ بنا..... اس کے بعد میں نے کافی لوگوں کے
ساتھ کام کیا..... اور میری امی کی سپورٹ نے مجھے
بہت آگے تک پہنچایا۔“
”لگتا ہے، آپ اپنی امی کے بہت قریب
ہیں؟“
”جی..... میں اپنی امی کے بہت قریب ہوں۔
اپنی ہر بات سب سے پہلے اپنی امی کے گوش گزار
کرتی ہوں۔ کیونکہ انہوں نے ہی مجھے بہت سپورٹ

میں کیا کیا کیا؟“
”میں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی دشواری نہیں
ہوئی۔ بہ حیثیت چائلڈ اسٹار کے میں نے اس فیلڈ میں
قدم رکھا اور بہ حیثیت چائلڈ اسٹار کے میرا پہلا ڈرامہ
”میاں کا الیہ“ تھا جو کہ سٹ کام تھا اور میرے ساتھ
بلال قریشی، تبسم عارف، اسماعیل تارا اور سلیم آفریدی
جیسے سینئر فنکار تھے..... پھر ایک پرائیویٹ چینل سے
ایک سال بچوں کے پروگرام کی میزبانی کی، جس نے
میری پہچان کروائی، اس کے بعد ایک سیریل ”کیا
مول ہے“ کیا۔ اس میں میرا کردار ایک دھمی اور مظلوم
لڑکی کا تھا..... اور میں جتنی ہوں کہ میرے ہوش کا یہ
میرا بہترین کردار تھا۔“
”میرے خیال سے آپ کا ڈرامہ سیریل
”روگ“ بھی آپ کے لیے ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا
تھا؟“

”جی یہ میں نے 2011ء میں کیا تھا اور ٹرننگ
پوائنٹ تو نہیں، کیونکہ میں کہیں رکی نہیں..... اللہ کا
شکر ہے کہ میں جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں کام
ہی کر رہی ہوں..... اور اب تو شو بزم کی ہر فیلڈ میں طبع
آزما کر چکی ہوں۔ فلم، اداکاری، ماڈلنگ سب
کچھ..... بس اب پروڈکشن اور ڈائریکشن رہ گئی ہے۔
وہ بھی ضرور کروں گی۔“

”فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں اور فٹ رہنے
کے لیے کیا کرتی ہیں؟“
”فارغ اوقات میں مجھے ٹینس کھیلنا اچھا لگتا ہے
اور فٹ رہنے کے لیے میں بہت ہی سادہ خوراک
استعمال کرتی ہوں۔ مرغن غذائیں استعمال نہیں کرتی
فریش جوسز کا استعمال زیادہ کرتی ہوں ورزش یعنی
ایکسرسائز ضرور کرتی ہوں۔“
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عشاء نور سے
اجازت چاہی۔

☆



ہے اس لیے کام کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“
”گھر والے آپ کی اداکاری کو کتنا پسند کرتے ہیں؟“
”بہت زیادہ پسند کرتے ہیں..... اور سچ بتاؤں
کہ میرے گھر والے تو میری اداکاری میں اتنے انوالو
ہو جاتے ہیں کہ اگر ڈراموں میں میں روتی ہوں تو
میرے گھر والے بھی روتے ہیں..... اور یہی ایک
آرٹسٹ کا حق ہے کہ وہ اپنی اداکاری سے دوسروں کو
اس حد تک متاثر کرے کہ حقیقت کا گمان ہو.....“
”آپ نے بتایا کہ گھر والے آپ کی اداکاری میں
بہت انوالو ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں آپ
کے اس فیلڈ میں آنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا؟“
”جی..... میرے والدین نے مجھ پر اعتبار کیا
اور مجھے اس فیلڈ میں آنے کی اجازت دی..... اور
مجھے ہر موقع پر سپورٹ کیا۔ اور میں بہت خوش نصیب
ہوں کہ مجھے ایسے والدین ملے کہ جنہوں نے مجھے
بہت سپورٹ کیا اور شو بزم میں آنے کی اجازت دی۔
اور میں بھی اس معاملے میں بہت احتیاط کرتی ہوں کہ
ایسا کوئی کام نہ کروں کہ جس سے میرے والدین کے
اعتبار کو ٹھیس پہنچے۔“
”فیلڈ میں آنے میں دشواری ہوئی..... اور ابتدا

”کتنے بہن بھائی ہیں آپ؟“

”ہم چار بہنیں ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ بڑی دو بہنیں اس فیئڈ سے وابستہ ہیں۔ والدہ تعلیم یافتہ اور لبرل ہیں، اس لیے ہم بھی اس فیئڈ میں آئیں۔“

”والدہ کی کوئی خاص بات جو گرہ سے باندھ لی
ہو آپ نے؟“

”میری امی کا ہمیشہ سے یہ کہنا ہے کہ کہیں بھی اس آدمی پہ اعتبار نہ کرنا جو تمہاری بے جا تعریف کرے یا بہت زیادہ تعریف کرے۔ اور میں نے بھی اس بات کوئی بار آزمایا ہے کہ جو آدمی آپ کی خوب صورتی کی تعریف کرے وہ بہت کم قابل اعتبار ہوتا ہے۔“

”کیا یہ ایک آسان فیلڈ ہے؟“

”نہیں جی..... جولوگ یہ سوچ کر آتے ہیں کہ یہ فیذا آسان ہے اور ایک دو ڈراموں میں کام کرنے کے بعد شہرت مل جائے گی تو یہ بہت غلط سوچ ہے ہر کوئی اداکار نہیں بن سکتا۔“

”مگر یہ کہنا کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر شخص اداکار ہے تو کیا غلط ہے؟“

ہنستے ہوئے۔ ”مگر میں جس اداکاری کی بات کر رہی ہوں اس میں ہمیں کسی اور کا کردار پر فارم کرنا

پڑتا ہے۔ اور یہ ایک مشکل کام ہے۔ اگرچہ میرے
 غیر رسمی ابتدا ماڈلنگ سے ہوئی لیکن مجھے اداکاری
 پسند ہے۔ حالانکہ اداکاری ماڈلنگ سے زیادہ مشکل
 کام ہے۔ مگر مجھے مزہ آتا ہے۔“

”ماڈلنگ کتنی آسان ہے..... بہت یا کچھ کم؟“
 ”ماڈلنگ بہت نہیں۔ مگر آسان ہے۔ بہ نسبت
 اداکاری کے۔ ماڈلنگ خواہ کرشل ہو یا ریپ پر.....
 اتنی مشکل نہیں ہے۔ ہاں ریپ پر اپنی انفرادیت کو
 نمایاں کرنا ہوتا ہے جو ایک طرح سے ہلکی چھلکی سی

”اداکاری ہی ہوتی ہے۔“

”یہ ایک وسیع فیلڈ ہے۔ کہاں تک جانے کا ارادہ ہے؟“

”میں ایک فلم کر چکی ہوں۔ مزید کرنا چاہتی ہوں اور کر بھی رہی ہوں..... کیونکہ میں اپنے آپ کو ایک جگہ محدود نہیں کرنا چاہتی۔ میں اداکاری اور ڈاننگ اور فلم سب کو ساتھ لے کر چلوں گی..... آنے والے دنوں میں آپ چند ایسے ڈرامے دیکھیں گی جو بہت یادگار ہوں گے۔ ان میں ایک پر جیکٹ مائیکل ڈیسن کا ڈراما Driven ہے۔ اس میں میرے ساتھ جاوید شیخ ہیں۔ جاوید شیخ کے ساتھ کام کرنا میرے لیے اعزاز ہے۔ اور ہاں فیشن انڈسٹری بھی میری پہچان ہے۔ اسے بھی نہیں چھوڑوں گی..... مجھے بہت اچھے کام ملتے ہیں۔“

”شو بڑا نڈھٹری کے لیے کہا کہیں گی؟“

”شوہزادہ سٹری میں جان آگئی ہے اس کے ہر شعبے میں بہت معیاری کام ہو رہا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ انٹرنیشنل لیول کا کام ہو رہا ہے۔ اور مجھے بہت امید ہے کہ ایک دن آئے گا جب انٹرنیشنل اریکٹ میں پاکستان کی فلم انڈسٹری کا شمار صف اول میں ہوگا۔“

”کوئی ایوارڈ بھی تو آپ کو ملا تھا؟“

”جی..... جی..... مجھے کس اسٹائل ایوارڈ مل چکا ہے اور مزید ایوارڈز بھی لینا چاہتی ہوں اپنی پرفارمنس کی وجہ سے۔“

☆☆☆

عائشہ جہاں زیب

”کیسی ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”خبرناک دونوں کی وجہ سے بہت مقبول ہے۔ ایک آپ اور ایک میر محمد علی..... کیا خیال ہے؟“

’یہ تو دیکھنے والے ہی بتا سکتے ہیں..... البتہ میر

محمد علی تو واقعی خدا داد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔“
 ”کچھ عرصہ آپ اسکرین پہ یعنی اس پروگرام
 میں نظر نہیں آئیں گے۔“

”کوئی خاص نہیں..... کچھ گھریلو مصروفیات تھیں، اس لیے چھٹی پہ چلی گئی تھی۔“

”جے ساختہ اہی..... جے ساختہ پین آپ کا ہی
کمال ہے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ پروگرام میں ری
فلکس کتنے ہوتے ہیں؟“

”بس یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ اس نے عزت دی ہے۔“

”کامیڈی شوز کرنا زیادہ آسان ہے یا سنجیدہ شوز کرنا؟“

”کامیڈی..... دنیا بھر میں کامیڈین کے لیے ایک چیلنج رہی ہے۔ کیونکہ میں جھپٹی ہوں کہ دلانا آسان ہوتا ہے بہ نسبت ہنسانے کے۔ اور ہم اس پروگرام کے ذریعے لوگوں کو ہنساتے ہیں یا ان کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیرتے ہیں تو سمجھیے کہ ہمیں اپنی پرفارمنس کا صلہ مل جاتا ہے۔ میری نظر میں ہنسانا ایک پیشہ کی شکل ترین کام ہے۔“

”خس مزاح کس میں زیادہ ہوتی ہے۔ خواتین میں یا مردوں میں؟“

”میرے خیال میں ابھی ایسا کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہوا کہ یہ بتایا جاسکے کہ کس میں حس مزاح زیادہ ہوتی ہے۔ بے شک خواتین جذباتی اور حساس ہوتی ہیں مگر حس مزاح میں بھی وہ کسی سے کم نہیں ہوتیں۔“

نمایاں تبدیلی آئی آپ میں؟“

”مہڈیا میں آنے سے پہلے میں دوسروں پہ بہت آسانی سے مجھ کو سا کر لیا کرتی تھی۔ مگر اب میں خاصی محتاط ہو گئی ہوں۔ کافی کچھ سیکھ لیا ہے میں نے اس فنلڈ سے۔“

”پہلے سوئٹل زیادہ تھیں یا اب ہیں؟“
”میرے خیال میں نہ پہلے سوئٹل تھی اور نہ ہی

مرحبا
SINCE 1974
مرحبا کی کھانا

پھول پھول کا رس
مرحبا شہر میں گیا بس

f Marhabalaboratoriespk | www.marhaba.com.pk | UAN: 11152152



اب کوئی بہت زیادہ سوشل ہوں۔ میری سوشل لائف صرف میری فیملی اور کچھ فرینڈز تک محدود ہے۔
”ویسے تو آپ اسکرین پر بہت فیس کھاتے اور خوش مزاج نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔۔ عام لائف میں کیسی ہیں۔ غصے کی تیز یا نرم؟“
”میں عام زندگی میں بھی بہت فرینڈلی ہوں۔ مگر غصہ فطری ہوتا ہے اور عموماً نا پسندیدہ باتوں پر ہی آتا ہے۔ مثلاً کسی کا بھلا چاہو اور وہ کوئی اور مطلب لے لے۔“
”آپ کا ایک بیٹا اور ماشاء اللہ دو بیٹیاں ہیں۔ گھریلو زندگی کی روٹین متاثر ہوئی؟“
”نہیں۔ الحمد للہ بالکل بھی متاثر نہیں ہوئی، بچے اسکول جاتے ہیں تو میں ریکارڈنگ کے لیے آجاتی ہوں اور پھر اسکول کی چھٹی کے بعد بچے بھی میرے پاس آ جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور وہ بھی انجوائے کرتے ہیں۔ ہم سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور بس۔“
”کھانا خود بناتی ہیں؟ اور اس پروگرام سے





شہر زاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچی بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک انجین پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک شیخ کے پیچھے رکھ دیا اور خود رین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں مختتم علی اور خاتون علی کا خاندان آباد ہے۔

مختتم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاں، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک بی بی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاتون علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی وہی شارق بیگم سے دو بیٹیاں اتابہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے

ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاتون علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو ان کے دونوں بچے نمبرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمبرہ کو لگائی بھجائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبی اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا اچھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

اتابہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سر دروہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

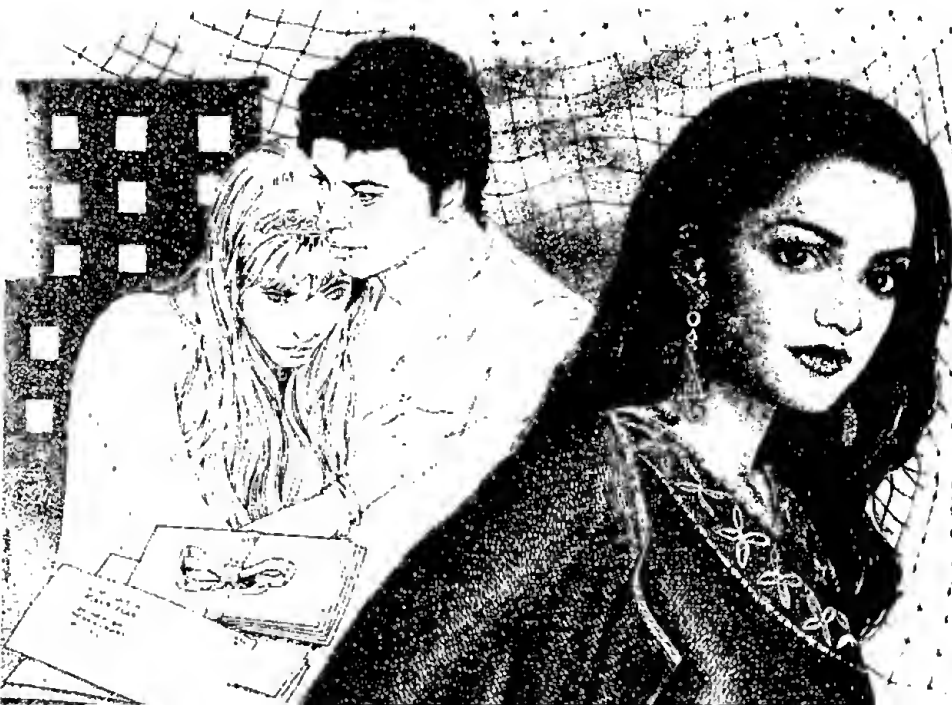
نیٹا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف پیرو کریت سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

بیلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزادہ جے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں جنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خود کشی کی دھمکی دے کر شہزادہ کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزادہ کی آمد نیٹا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزادہ پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبی اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہو گئے تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بچنے میں لے آیا ہے۔

مختتم علی کا بیٹا دھاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمت منسلک پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور نیٹا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزادہ سے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبی طوبی محمد ہادی کے بچنے میں جاتے ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبائیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے



پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان جھنپ جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ منابل، ہادی کی بہن ہے درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ منابل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے انہیں کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی، شہزاد کے پاس سمجھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے منسلک ہو کر بیٹا بیگم کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ شجاع بھی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بار پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا تیار شدہ تریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شہزاد میر طوبی کو پسند کرتا ہے تا جلد اہلیگم کا غصہ گھر میں سب پر اتارتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبی کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان سکتی ہے۔

موزیکا، ذوالفضل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر رات کو ٹیلی جھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیہ کو ارسال بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع بھی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے، شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔ انہیں، درشہوار اور منابل کی بے تکلف گفتگوں کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے درفی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر موزیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔ صندل کے گھر والے، شہزاد کے پوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی خوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

جارج، مارٹھا کو غلامانے کے کونسلر کی حرکتوں کا بتاتا ہے۔ جو وہ اس کا گھر زبردستی تھپانے کے لیے کر رہا ہے۔ دونوں پریشان ہوتے ہیں۔ مائیکل کی آمد پر وہ موزیکا کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ مگر موزیکا، ذوالفضل سے خفیہ نکاح کر کے ہاسٹل ہے اس کے گھر منتقل ہو جاتی ہے۔

تیرہویں قسط

میر ریٹ ہوٹل میں ہونے والے مسز تریبی کے ڈنر کی روایتیں عروج پر تھیں۔

رنگ و بودار درشنیوں کے طوفان کے پیچھے بچتا ہوا اوجھے سرور کا میوزک اب ہادی کے دماغ کو ناگوار کی احساس بخش رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان سب چیزوں پر لعنت بھیج کر خود کو اس منظر سے غائب کر لیتا۔

درشہوار اس کے سامنے تھی، پنک کمر کی میکسی کے ساتھ اس نے اپنے چہرے کے کش نفوس کو بڑی مہارت اور نفاست سے کیے جانے والے میک اپ کے ساتھ اجاگر کرنے کی شعوری کوشش کی تھی۔ آنکھیں اس کی پہلے ہی دلکش تھیں، اوپر سے اس نے اپنی گھٹی پلکوں پر مسکارے کا گہرا کوٹ لگا کر انہیں مزید جاذب نظر بنالیا تھا۔ براؤن کمر کے ٹوپس سوٹ میں میر برہان کی تیار بھی کسی سے کم نہیں تھی لیکن ہادی کو ان دونوں، بہن بھائی سے یکساں بیزاری اور کوفت محسوس ہوتی اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ درشہوار کی نظریں مسلسل اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

”ارے ہادی صاحب آپ.....؟“ برہان کے لہجے سے جھلکتی شناسائی پر منابل چونکی۔

”آپ لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں کیا.....؟“ منابل بے تابی سے گویا ہوئی۔

”مجھے ان کا پڑوسی ہونے کا اعزاز حاصل ہے.....“ ہادی نے جان بوجھ کر طنز پر انداز اختیار کیا۔

”وئس گرہٹ، پھر مجھے تو مستقل طور پر مری میں شفٹ ہو جانا چاہیے.....“ منابل کھلکھلا کر ہنسی۔

”تم جس جگہ پر ہو، وہیں رہو تو بہتر ہوگا.....“ ہادی نے ڈھکے پیچھے الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی، جو اس وقت برہان کو سامنے پا کر خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی اور اس کے رنگ ڈھنگ ایسے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھے۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ منابل ہر وقت جس ہادی کا ذکر کرتی ہے، وہ آپ ہو سکتے ہیں۔“

”جی..... یہ شخص ایک اتفاق ہے۔“ اس کے لہجے میں موجود تنجیدگی اور فراخ پیشانی پر گہرے ہوتے بل درشہوار کے اندر مایوسی کا دھواں پھیلا رہے تھے لیکن اس سے چندفٹ کے فاصلے پر کھڑے ہونے کا احساس بھی فی الحال کافی تھا۔ وہ شعوری طور پر تھوڑا اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی، اس کے لباس سے انشتی قیمتی کولون کی مسحور کن مہک نے درشہوار کو کونہ بھر کے لیے بے بس کیا۔

”آئیں ناں برہان، آپ کو ماموں اور ممانی جان سے ملواتی ہوں۔“ منابل کے لہجے سے جھلکتی بے چینی ہادی کو سخت بری لگی۔

”شیور.....!!!!“ برہان کی گہری نظریں منابل کے چہرے کا حصار کیے ہوئے تھیں۔

”صرف ملو نا، ان سے تعارف مت کرو نا۔“ ہادی نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے منابل کے تھوڑا قریب آ کر ہلکی سی سرگوشی کی۔

منابل نے پلٹ کر پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اور ہادی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، جو منابل سمجھ تو نہیں پائی لیکن اس کے چہرے پر پتیلی تنجیدگی نے اسے لمبے بھر کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”ایکسکو زدی برہان! ایک منٹ۔“

وہ پریشان انداز سے ہادی کے پاس آئی، جو اس وقت ساری دنیا ہی سے خفا خفا سا لگ رہا تھا۔ درشہوار اور برہان دونوں نے چونک کر انہیں دیکھا، لیکن ہال میں بیٹھے ہوئے میوزک کی وجہ سے وہ ان کی گفتگو سمجھنے سے قاصر تھے، البتہ ہادی کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کم از کم خوش گوار نہیں تھی۔

”تم بتا کیوں نہیں رہے ہو، آخر پر اہلکم کیا ہے.....؟“

”کہاناں، بھی پیاسے تعارف مت کرو نا ان لوگوں کا، باقی ڈشیل بعد میں بتا دوں گا۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلا یا۔

منابل نے کچھ لمحے اسے غور سے دیکھا، اور پھر سر جھٹک کر بے نیازی کے ساتھ اپنے انجیل مہمانوں کی طرف بڑھ گئی، جبکہ ہادی کا تو سارا مزاحیہ کرکرا ہو گیا تھا، وہ زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے جاننے والے لوگوں سے ملتے ہوئے نسبتاً ایک خالی گوشے کی طرف آ گیا، جہاں ذرا الگ تھلگ رکھے صوفے پر شہزاد و برہان تھے۔

منابل کی بے تابیوں اور بے چینیوں نے اس کا سکون تو برباد کیا ہی تھا لیکن اسے اس بات پر بھی حیرانی تھی کہ میر برہان ختم اپنی بہن کو لیے اتنے دھڑلے سے انجان لوگوں کی گہر رنگ میں کیسے آسکتے ہیں، اور بہن بھی اس وقت سولہ سگھار کیے کسی بھی اچھے بھلے شخص کے ہوش اڑا سکتی تھی لیکن آگے بھی ہادی تھا جو اپنے دل کے دروازے سختی سے بند کر کے جانی نہیں دہر جنگلوں میں پھینک چکا تھا۔

”پاکل ہیں دونوں بہن بھائی۔“ وہ دل ہی دل میں ان دونوں کو کوسے ہوئے غیر دانستہ طور پر شہر زاد کے عین برابر میں بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان دونوں کے درمیان میں بس چنداچ کا قافصلہ ہے۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ہادی؟“ شہر زاد اس کی غائب دماغی کو بھانپ چکی تھی۔

”اوہ آئی ایم سوری۔“ وہ سخت زدہ انداز میں تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھا۔

”اُس ادکے..... مجھے لگتا ہے، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید۔“ وہ چہرے پر نرم مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”جی، کچھ ایسا ہی ہے، سر میں درد ہے، لگتا ہے کوئی پین کمر لینی پڑے گی۔“ ہادی نے اپنی دو انگلیوں سے ماتھے کو لاشعوری انداز میں مسلا۔

”آپ کسی ویٹر کو بلا کر پوچھیں، مل جائے گی ادھر ہی سے۔“ وہ تھوڑا فکر مند ہوئی۔

”ارے نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں، آپ سنا میں کسی ہیں اور کیا ڈر گئی ہیں میری فیملی سے، جو دوبارہ مری کا رخ ہی نہیں کیا آپ نے۔“ اس نے دانستہ اپنا دھیان منال اور برہان سے ہٹانے کے لیے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ایک بات یاد رکھیے گامح ہادی صاحب! جس دن شہر زاد نے اپنے پروفیشن سے ڈرنا شروع کیا، اس سے اگلے دن وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنی مام کا سیلون سنبھال لے گی، کیونکہ اس کے لیے پھر یہی شعبہ بہتر ہوگا۔“ اس کے پُر اعتماد انداز پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرایا۔

”یہی اسپرٹ ہوئی چاہیے زندگی کے ہر معاملے میں، اور مجھے یقین ہے کہ ایسا دن کم از کم آپ کی زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔“

”اللہ کرے، میں آپ کی امیدوں پر پورا اُتر دوں۔“ شہر زاد نے ویٹر کی ٹرے سے فریش جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”مجھے تو شجاع غنی والے کیس سے بہت امیدیں تھیں کم از کم میری فیملی پر ہاتھ ڈالنے کا ایک مضبوط جواز ہاتھ میں آجائے گا۔“ وہ اب بہت تسلی سے اس سے کپ شپ لگانے کے موڈ میں تھا۔

”امیدیں تو مجھے بھی بہت تھیں لیکن، وہی حضرت علیؑ کا قول ہے ناں۔“ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے خدا کو بیچنا۔“ وہ تھوڑا افسردہ ہوئی۔

”میں آپ کی بات سے متفق ہوں، شجاع غنی کے پیچھے بٹنے کے بعد کوئی اور مضبوط جواز بھی تو نہیں رہا تھا اس کیس کو لڑنے کا، لیکن آپ کو جب موقع ملے اس کیس کا بدلہ ضرور لیجیے گا۔“

”میں کسی ذاتی عناد یا دشمنی پر تو لوگوں پر کیس نہیں کر سکتی، لیکن جب کبھی ان کے خلاف ایسا کچھ ملتا تو پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ شہر زاد نے اسے اپنے ارادوں سے باخبر کیا۔

”ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جائے گا کیونکہ، یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز تو آنے والے ہیں نہیں۔“ ہادی نے کافی فاصلے پر کھڑی درشوار کو نا پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے محل کر کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ مضبوط جواز مل چکا ہو مجھے، جو ان کے پورے خاندان کی سیاست کی بنیادیں ہلا دے۔“ اس کے پُر اعتماد لہجے میں کچھ تھا۔

ہادی ایک دم سنبھل کر بیٹھا اور اسے اپنا سارا سر درد فضاؤں میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

”آر یو شیور.....؟؟؟“ اس نے شہر زاد کا چہرہ کھنسنے کی کوشش کی۔

”آف کورس، میں کوئی ایسی بات اندازوں پر تو کر نہیں سکتی۔“ وہ ابھی بھی پُر اعتماد تھی۔

”اگر ایسی کوئی بات ہے تو میں بے چینی سے اس وقت کا منتظر ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کروائیں گی۔“ ہادی کی بات پر شہر زاد کے لبوں پر ایک جان دار مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

”میں نے مسز عالیہ فریٹی یعنی آپ کی والدہ سے زندگی کا ایک ہی اصول سیکھا ہے ابھی۔“

وہ اس کی بات پر چونکا۔ ”کیا.....؟“

”زندگی بھی شطرنج کی بساط کی مانند ہوتی ہے جہاں درست وقت پر درست مہرے کا استعمال ہی آپ کی کامیابی کی ضمانت بنتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”اور یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے کہ کسی سیاسی خاندان کے لیے الیکشن کے قریب کا وقت ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہوتا ہے، اس وقت پر لگنے والی چوٹ کے اثرات بہت دیر پا ہوتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں موجود چمک پر شہر زاد مسکرائی۔

”مسز فریٹی کی اولاد کو اتنا ہی ذہین ہونا چاہیے جتنا دنیا انہیں سمجھتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، میرا اندازہ درست ہے، آپ بھی اسی وقت کا انتظار کر رہی ہیں۔“ ہادی کی بات کو اس نے مسکرا کر ٹالا۔

اسی ہال میں کچھ فاصلے پر موجود درشوار کی نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں، شہر زاد کا پُر دقار انداز میں مسکراتا اور ہادی کا کھویت کے ساتھ اسے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دینا، یہ سارے رخ مناظر بھولنے کے لیے درشوار کو ہباز جتنا حوصلہ چاہیے تھا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شہر زاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے ہال سے کہیں دُور چمیک آتی یا ہادی کو تھمتی ہوئی وہاں سے کہیں اور لے جاتی۔ اسے دنیا میں کوئی لڑکی اتنی بُری نہیں لگی تھی، جتنی اس وقت ہادی کے ساتھ بیٹھی ہوئی شہر زاد لگ رہی تھی۔

ہادی اسے برابر میں بیٹھے ہوئے کسی جانے والے کے ساتھ محو گفتگو ہو گیا اور شہر زاد کی ساری توجہ اس کے سیل فون پر آنے والے ٹیکسٹ میسج نے اپنی طرف مبذول کروالی، وہ میسج کی مخصوص ہپ سے جان چکی تھی کہ

دوسری طرف ہم زاد ہوگا اور وہی تھا۔ اسکرین پر نظریں دوڑاتے ہوئے اس کے لب خود بخود مسکرائے، کیونکہ سامنے خبر پر تھا۔

الٹنی کیوں نہیں اٹھتی قیامت، ماجرا کیا ہے.....

ہمارے سامنے پہاؤ میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

شہر زاد نے اسکرین پر جھگمگاتے اس کے نام کو مسکراتے ہوئے دیکھا، ایک ساتھ کئی جھنجھو اس کی اپنی بھی آنکھوں میں چمکے اور اس نے شرارت سے فوراً اس کے شعر کا جواب تیزی سے ٹائپ کیا۔

صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

خوب پردہ ہے چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

جیسے ہی شہر زاد کا ٹیکسٹ گیا، اگلے ہی منٹ میں اس کا شاعری کی ہی زبان میں برجستہ میسج کی صورت میں فوراً جواب آیا۔

عشق مثل میں کبھی ہم کو پکارے تو سہی

پابجولاں ہی چلے آئیں گے جھم جھم کرتے

وہ بھی کون سا کسی سے کم تھی، جھٹ سے شان بے نیازی سے اسے لکھ مارا۔

ان قدموں نے تمہارے، ان ہی قدموں کی قسم خاک میں اتنے ملائے ہیں، کہ جی جاتا ہے۔

اس شعر کے بعد چند منٹوں کا سناٹا چھا گیا، اسے پتا تھا کہ یہ بات براہ راست اس کے دل میں کھجی ہوگی، تب ہی دو منٹ اور تیس سیکنڈ کے بعد سیل فون اسکرین پر اس کا جواب آیا۔

کوئی فتنہ، تاقیامت، نہ پھر آشکار ہوتا

تیرے دل یہ کاشِ ظالم، مجھے اختیار ہوتا

شہزاد جان مٹی تھی کہ اس شعر کے اندر اس کی حسرتوں کا جہاں آباد ہے۔ اس نے بھی اس بار امید کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھام لی۔

اسی دنیا کے، اسی دور کے ہیں

ہم تو دلی میں بھی بجنور کے ہیں

شہزاد کو اندازہ نہیں تھا کہ سامنے بھی ہم زاد تھا جس سے چاہہ کر بھی وہ کسی بھی معاملے میں جیت نہیں سکتی تھی۔

تجھ کو دوا ہے محبت میں گرفتاری کا

لا دکھا، پاؤں میں زنجیر ہمارے جیسی

اس نے ہم زاد کے اس دعوے پر تپ کر اسے فوراً لکھا۔

وہ ہر ایک بات کا پہلو نکال لیتا ہے

میں کچھ کہوں تو تراز و نکال لیتا ہے

شہزاد کے اس دل جلے انداز پر اس نے ہنستے ہوئے لکھا۔

آخر میں تیرے کام تو آیا، کسی طرح

آخر میری مثال ہی دینا پڑی تجھے

اسی شعر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

”اب بیت بازی ختم اور جا کر کھانا کھا لیجیے۔“

شہزاد نے چونک کر ہال کی طرف دیکھا، دوا ہی نہیں کب وہاں سے اٹھ کر جا چکا تھا اور اس وقت سب ہی

مہمان ڈنر میں مصروف تھے۔ اس نے بھی اپنا سیل فون بینڈ بیگ میں ڈالا اور مسز فریٹی کے پاس جا کر کھڑی

ہوئی۔

☆☆☆☆

وال کلاک کی سوئیاں اس وقت ایک کے ہندے پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

ہادی اور منال کے درمیان بوجھل خاموشی کا وقفہ کچھ لمحوں کے لیے آ کر ٹھہر گیا، منال نے ہلکا سا جھنجھلا

کر اپنے کزن کو دیکھا، جس کے بارے میں اسے دوا تھا کہ وہ اسے ساری دنیا سے زیادہ جانتی ہے لیکن اس کا یہ

روپ تو اس نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

”تم پوچھنا کیا چاہ رہے ہو ہادی! صاف صاف کہو۔۔۔؟“ وہ ہلکا سا چڑ کر بولی۔

”مجھے تم صرف اتنا بتاؤ تم میرا بہن کی فیملی کے بارے میں کتنا جانتی ہو۔۔۔؟“ اس کا سخت لہجہ منال کی

چونکا گیا۔

”تمہارے لہجے سے تو لگ رہا ہے جیسے مجھ سے زیادہ تم ان کو جانتے ہو۔“ وہ سنجیدہ ہوئی۔

”اسی بات کا تو افسوس ہے، جو بات تمہیں جانی چاہیے تھی، وہ مجھے بتانی پڑ رہی ہے۔“ وہ جتاتے ہوئے

انداز میں گویا ہوا۔

”ایسی کیا بات ہے جو تم اتنا زیادہ سیریس ہو رہے ہو۔“ وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر اس کے عین سامنے

آن کھڑی ہوئی۔

”سوچ لو، شاید سن کر تمہیں اچھا نہ لگے۔“ اس کے طنز یہ انداز پر منال کو جھٹکا لگا۔

”میں براہان کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں اور میں نے ہر لحاظ سے پرفیکٹ پایا ہے انہیں۔“

”اس کے خاندان کو جانتی ہو۔۔۔۔۔؟“ اس نے طنز یہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

”میرا اس کے خاندان سے کیا لینا دینا۔“ اس نے دوہرہ جواب دیا۔

”منال صاحبہ، یہ پاکستان ہے اور یہاں لڑکی کا اپنے شوہر سے زیادہ اپنے سرسرا والوں سے لینا دینا ہوتا

ہے، پھر تم یہ بات کیسے بھول سکتی ہو۔“ اس کا استہزاء انداز اسے اچھا نہیں لگا۔

”جو بات ہے ہادی! تم صاف صاف کیوں نہیں کرتے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”اس سے پہلے تم خود کو راضی کر لو گھنچائی کو شرم کرنے کے لیے۔“

”میرا ہاضمہ اتنا کمزور نہیں ہے، تم جو بھی کہنا چاہتے ہو، کل کر کہو، میرے سامنے پہیلیاں مت بچھاؤ، کیونکہ

مجھے خت ابھرن ہو رہی ہے۔“

”صرف اتنا بتاؤ کہ تم براہان کے علاوہ اس کے خاندان کے کتنے لوگوں کو جانتی ہو۔۔۔۔۔؟“ اس نے غور سے

اس کے چہرے کے تاثرات جانچتے ہوئے کہا اور جواب حسب توقع وہی آیا تھا، جس کی اسے سو فیصد امید تھی۔

”اس کی بہن ورثہ وار سے ایک دو بار ملاقات ہوئی ہے میری، اور اچھی لگی ہے وہ مجھے۔“ منال کی اس

بات نے اس کا موڈ خراب کیا۔

”واہ منو صاحبہ! وہ لڑکی دنیا کی محبت ہے جہاں محبوب کے علاوہ کسی اور چیز کا علم نہیں اور اس کے ساتھ

نئی دنیا بنانے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔“ اس نے اس بار اس کی اچھی خاصی عزت افزائی کی۔

”ہادی! بھول گئے ہو کیا تم نے بھی تو محبت کرتے ہوئے ہر چیز بھلا دی تھی۔“ اس کے طنز پر وہ تڑپ

اٹھا۔

”سب کچھ بھلا دیا ہوتا تو وہ اس وقت میرے گھر میں میرے ساتھ ہوتی، میں ایک طرفہ محبت کی سزا نہ کاٹ

رہا ہوتا۔“

”ہاں تو کر لو ہمت، اب بھی کیا بگڑا ہے۔“ منال کا یہ وار بھی خاصا کاٹ دار تھا۔

”بگڑا تو کچھ بھی نہیں ہے، بس کسی کی دوستی کا مان ٹوٹ جائے گا، اسی چیز کی حیا مار دیتی ہے مجھے۔“ وہ تلخی

سے گویا ہوا۔

”جب تم خود کچھ نہیں کر سکتے تو میرے راستے کی رکاوٹ کیوں بن رہے ہو، کیا پر اہلم ہے

تمہارا۔۔۔۔۔؟“ اس دفعہ وہ بھی برا مان گئی۔

”میرا پر اہلم تم ہونا منال! تمہیں بہن کہا ہی نہیں، ہمیشہ سمجھا بھی ہے اور میں تمہیں کسی اندھے کوئیں میں گرتا

ہاں نہیں دیکھ سکتا۔“ اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا تھا لیکن اس کی اس بات پر منال نے بیزارگی سے اپنے

لہجے میں

”برہان، اندھا کونسا نہیں ہے۔“ منابل نے ٹوکا۔

”میرحاج علی کا خاندان ایک ایسی اندھی کھائی ہے، جہاں اندر گرنے کے تو بے شمار راستے ہیں لیکن باہر نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے موت، یہ لوگ سانسوں پر پہرے لگاتے ہیں، دوسروں کی زندگیوں کا اختیار اپنی مٹیوں میں رکھنے کے قائل ہیں۔“ اس نے نادان لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم یہ بات اتنی تفصیل سے کیسے جانتے ہو.....؟“ منابل مشکوک ہوئی۔

”میں جی نہیں مٹی، پاپا سب جانتے ہیں، پاپا کے پاس ان کی کرپشن کے ڈھیر دل ثبوت ہیں، جا کر دیکھ سکتی ہوں۔“

”سیاست سے تعلق رکھنے والے خاندانوں پر ایسے الزامات لگتے ہی رہتے ہیں، یہ کون سی نئی بات ہے.....“ اس نے اس بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

”اس کا خاندان کرپشن، دھوکا دہی، قتل و غارت، اغوا اور لینڈ مافیا کے حوالے سے بھی مشہور ہے۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلا کر گویا ہوا۔

”بے شک ایسا ہوگا، لیکن برہان ایسا نہیں ہے، وہ بہت مختلف ہے.....“ اس بار اس کی آواز تھوڑی مدہم ہوئی۔

”منو! غلط فہمی ہے تمہاری، وہ سب لوگ اوپر سے لے کر نیچے تک ایک جیسے ہیں، ہمیں ان کا خاندان بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا، ان کے مردوں کے لیے علیحدہ اصول ہیں اور خواتین کے لیے الگ.....“ ہادی نے سی سے کہا۔

”اگر ایسا ہوتا تو برہان بھی پروفیسری کے بجائے اپنی فیملی کے باقی لوگوں کی طرح سیاست کر رہا ہوتا، اس نے پورے خاندان سے بغاوت کر کے یہ پروفیشن اپنایا ہے، اسے نفرت ہے سیاست سے.....“ اس کے پاس بھی دلیل تھی۔

”لیکن وہ تمہارے ساتھ سیاست کر رہا ہے، میری یہ بات لکھ لو تم.....“ ہادی کے طنز پر وہ تڑپ کر بولی۔

”تم اس کی فیملی کے بارے میں غلط بات ضرور کر دینگیں، برہان کے بارے میں نہیں۔ وہ تمہیک ٹھاک بڑا مان گئی۔

”اس لیے کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتی ہو.....“ اس نے غصے سے کہا۔

”میں جانتا بھی نہیں چاہتی، وہ لوگ جو بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، لیکن میں اور برہان ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے.....“ منابل نے اس بار صاف گوئی سے اپنا موقف بتایا، اور ہادی کا ایک بار تو دل چاہا کہ وہ سامنے والی دیوار سے جا کر ٹکڑا کر لے، کیونکہ منابل کوئی بھی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

”کیا کوئی شخص اپنے خاندان، برادری اور رشتے داروں سے کٹ کر رہ سکتا ہے۔؟ کیا وہ ان سب لوگوں کو تمہارے لیے چھوڑ سکتا ہے کیونکہ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ میرے خاندان میں پہلی بہو کا اعزاز صرف ان کے اپنے خاندان کی عورت کو ہی ملتا ہے.....؟“ اس نے استہزاء سے لہجے میں پوچھا۔

”مطلب کیا ہے تمہارا.....“ منابل بیزار سی سے گویا ہوئی۔

”وہ اپنی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہی کرے گا، لکھ لو تم میری یہ بات، اور اس کے بعد تم اس کی دوسری یا تیسری بیوی بننا چاہو تو یہ الگ بات ہے۔“

ہادی کے استہزاء سے انداز پر وہ جذباتی ہو گئی..... ”برہان ایسا کبھی نہیں کر سکتے.....“

”خوش فیموں کی ریت پر اونچے اونچے گل مت بناؤ، اور ہو سکے تو اس موضوع پر اس سے کھل کر بات کرو، تب ہی تم کسی نتیجے پر پہنچو گی.....“ اس نے منابل کو ایک نئی راہ دکھائی تو وہ بھی کچھ انجمن کا شکار ہوئی۔

”بات تو میں کرلوں گی لیکن کیا ماموں اور مہمانی مان جائیں گے؟“ منابل کے لہجے میں کئی اندیشوں نے ایک ساتھ سر اٹھایا۔

”میں ان کی گارنٹی نہیں دے سکتا، کیونکہ می کی اسٹنٹ شہزاد پر فائزنگ برہان کے دادا اور باپ نے کروائی تھی اور یہ بات وہ لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں، اس لیے تمہیں اپنا مقدمہ خود لڑنا ہوگا۔“ ہادی نے اسے کسی خوش فہمی میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکنا نہیں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے کمرے سے نکل گیا۔

”اوہ مائی گاڈ..... اب کیا ہوگا.....؟“ منابل کو قطعاً اس صورت حال کا اندازہ نہیں تھا، اس نے دال کلاک پر وقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے اس نے کچھ سوچ کر برہان کا نمبر ڈائل کیا، چند سیکنڈ بعد یارو ڈ آف کی فیل پر وہ مایوس ہوئی۔ اس نے پریشانی سے سیل فون ایک طرف رکھ دیا، ہادی سے اس ایک گھنٹے کی بحث کے بعد وہ جان چکی تھی کہ اس کے اور برہان کے راستے اتنے بھی آسان نہیں تھے جتنا اس نے سمجھ لیے تھے۔

☆☆☆

میرہاؤس اس وقت تاریکی اور خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔۔۔

درشہوار کے کمرے کی جلتی لائٹ دیکھ کر نیرہ نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر نکل آئی، اسے بتا تھا کہ وہ اور برہان بھائی فنکشن سے ابھی ابھی لوٹے ہیں اور وہ مڑے کے قفسے سننے کے پتھر میں اس کے پاس آئی تھی۔

اس نے ہلکا سا دروازہ کھول کر درشہوار کے کمرے میں جھانکا، اسے دھچکا لگا۔

درشہوار کی ٹی پنک، میکی، جیولری، دوپٹے اور ہارنگھار کی ساری چیزیں لا پر دانی سے زمین پر پڑی ہوئی اپنی بے قسمی کا ماتم کر رہی تھیں اور وہ ڈرینک کے شیشے کے سائے کھڑی گویا اپنے حواسوں میں نہیں تھی، سفید رنگ کی ٹی شرٹ اور فراز میں وہ اپنے مخصوص ٹائٹ ڈریس میں تھی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت اور بے بسی کا ڈیرا تھا، اس نے اپنے بازو کی پشت سے اپنے ہونٹوں کو

رگڑ کر میروں کھرکی لب اسٹک اتارنے کی کوشش کی اور سفید رنگ کی آستین پر میردن رنگ عجیب سا دکھائی دینے لگا، اسے اس چیز سے کٹنی نہیں ہوئی تو اس نے فرش پر بے دردی سے پڑی اپنی میکی کے ساتھ کے گلابی دوپٹے کو اٹھایا اور بے دردی سے اپنا میک اپ رگڑ کر اتارنے لگی۔ نیرہ نے کچھ کھانگا۔

”کیا ہو گیا ہے درشہوار اب گل تو نہیں ہو گئی ہو۔۔۔“ نیرہ نے بھاگ کر اس کا دوپٹہ چھینا۔

”میرا وہ پتہ واپس کرو.....“ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

”پاگل لڑکی! اتنا قیمتی سوٹ برباد کرنا ہے کیا، دیکھو ذرا کتنے داغ لگ گئے ہیں اس پر.....“ نیرہ نے پریشانی سے اس کا قیمتی دوپٹہ دیکھا جو اس کے سیاہ کاجل، اور آئی شیڈز کے مختلف رنگوں کے ساتھ خاصا بد نما ہو چکا تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”داغ خراب ہو گیا ہے میرا، دل کرتا ہے کہ پوری دنیا میں آگ لگا دوں کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑ دوں.....“

وہ اب رہنے لگی۔

”برہان بھائی نے کچھ کہا ہے تمہیں۔؟ فنکشن تو ٹھیک رہا ناں، تم تو اتنی خوش خوش گئی تھیں.....“ وہ پریشان

ہوئی۔

”مجھے جانا ہی نہیں چاہیے تھا، خواہ مخواہ میں منہ اٹھا کر چلی گئی اپنی انسلٹ کروانے۔ پتا نہیں عقل کس دن آئے گی مجھے.....“ وہ اب بلند آواز میں خود کو کوس رہی تھی اور اس کی یہ لعن طعن کمرے میں داخل ہوئی طوبی نے بھائی ہوش دجو اس سنی اور اس کے چہرے پر ایک زہرا لودنسم نے انگریزی لی۔

”تمہاری انسلٹ.....؟ کس نے کی.....؟“ اس کی بات پر نیرہہ بوکھلا گئی۔

”اپنی انسلٹ کروا کر کون بتاتا ہے.....؟“ طوبی نے اس کا مذاق اڑایا۔

”تم کیوں میرے ہر دکھ اور ہر تکلیف پر اتنا خوش ہوتی ہو، شرم آتی چاہیے.....“ درشہوار نے اپنا غصہ طوبی پر اتارا۔

”جو انسان خود دوسروں کے لیے بُرا سوچے، وہ کیسے خوش رہ سکتا ہے.....“ وہ اس کے سامنے آکر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”کس کے لیے بُرا سوچا ہے میں نے.....؟ کس کے ساتھ غلط کیا ہے میں نے۔؟“ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

”یہ تم بیٹھ کر جب ایمان داری کے ساتھ اپنا احتساب کرو گی تو تمہیں خود پتا چل جائے گا.....“ طوبی کی صاف گوئی اس کے تن بدن میں آگ لگا گئی۔

”اٹھو تم دونوں اور ابھی اور اسی وقت نکلو میرے کمرے سے، میں تم لوگوں کی منحوس شکلیں نہیں دیکھنا چاہتی۔“ درشہوار نے دونوں کے بازو پکڑے اور ہٹھکتی ہوئی انہیں دروازے کی طرف لے گئی۔

”یار! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تمہیں.....“ نیرہہ نے بوکھلا کر صفائی دینے کی کوشش کی۔

”مجھے تم میں سے کسی سے بھی بات نہیں کرنی۔“ درشہوار نے ان کو باقاعدہ دھکا دے کر اپنے کمرے سے نکالا۔

”اس کا تو واقعی دماغ خراب ہو گیا ہے اور عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے، بہت اچھا ہوا اس کے ساتھ، جس نے بھی کیا۔“ نیرہہ کو اس کی بدتمیزی پر بے تحاشا غصہ آیا۔ طوبی اس کا ہاتھ پکڑ کر سنگ روم کے صوفے کی طرف لے آئی۔

”جتنی پاگل یہ ہو رہی ہے، لگتا ہے اسی ہمایوں کے لڑکے سے بے عزتی کر داکر آئی ہے کیونکہ وہی اسے اس کی اوقات یاد دلاتا ہے۔“ طوبی کی زبان پھسلی۔

”بادی، وہ اسے کہاں ملا.....؟“ نیرہہ بے اختیار چونکی اور طوبی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”کہیں بھی مل سکتا ہے یار.....“ اس نے بات نالائے کی کوشش کی لیکن آج طوبی کے ساتھ ساتھ درشہوار کے بھی ستارے گردش میں تھے، برہان جو کہ خود درشہوار کے کمرے سے کوئی تین کلرڈ صوفے کے لیے اوپر آ رہے تھے، ان دونوں کی بات پر ان کے قدم ساکت ہوئے۔

”درشہوار اور اس پڑوسی لڑکے ہادی کا کوئی چکر چل رہا ہے ناں۔؟ شک تو مجھے پہلے ہی تھا لیکن آج یقین آ گیا.....“ نیرہہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

”وہ تو گھاس بھی نہیں ڈالتا درشہوار کو، یہ ہی پاگل ہو رہی ہے اس کے پیچھے، ورنہ میرے سامنے کئی دفعہ جھڑا ہے اس نے، یاد نہیں ایک دفعہ شکایت لے کر کبھی آ گیا تھا وہ.....“ طوبی کی بات پر برہان کو یوں لگا جیسے کسی نے ابلتا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں ڈال دیا ہو۔ ”ایسے ہی اپنی قیمت بڑھا رہا ہوگا، ورنہ درشہوار کو کون لڑکا انکار

لے سکتا ہے۔“ نیرہہ کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا جبکہ برہان کا دماغ کھولنے لگا۔

”اس چھوڑی کو عقل سے کام لینا چاہیے جو ہر وقت اس پر غار ہونے کے لیے تیار رہتی ہے، گھنٹوں اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھتی ہے اور اس کا بس نہیں چلتا کہ جا کر اس سے اپنی محبت کی بھیک مانگنے لگے.....“ اس سے زیادہ سننا برہان کے بس میں نہیں تھا، وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ سڑھیاں اتر کر نیچے چلے گئے۔

”ہمیں کتنے نفلوں کا ثواب مل رہا ہے ان دونوں کو آدھی رات کو ڈسکس کر کے، چلو آٹھو، تائی ای آگئیں تو انہیں تو پہلے ہی اعتراض ہوتا ہے کہ ہم ساری رات بدردھوں کی طرح پورے گھر میں گھومتے ہیں.....“ طوبی اپنی بات مکمل کر کے کھڑی ہوئی۔

”ہم تو صرف کھوتے ہیں برہان کی اپنی سگی بیٹی تو ڈریکولا بن چکی ہے، جس کا بس چلے تو ہمارا ہی خون پینا شروع کر دے، دیکھو ذرا کیسے دھکے مار کر نکال دیا کمرے سے، اب اس فضول لڑکی کو منہ لگانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ نیرہہ کا غصہ ابھی بھی کچھ کم نہیں ہوا تھا، تب ہی تو وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مسلسل بولتی رہی جبکہ طوبی کے پاس اب ایک بے ضرری مسکراہٹ کے علاوہ کوئی اور جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

شہر زاد، میڈم عالیہ قریشی کے ڈنر سے ابھی ابھی گھر پہنچی تھی۔

اپنی گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے جیسے ہی وہ باہر نکلی، اس کی نظر لان میں اکیلے بیٹھی ہوئی سندس پر پڑی، جو کہ رشیدہ مائی کی بیٹی تھی، اس کے چہرے پر اس قدر وحشت اور اداسی تھی کہ درشہوار کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو گئے۔

”تم اس وقت رات کے ایک بجے یہاں بیٹھی ہوئی کیا کر رہی ہو.....“

”کچھ نہیں بی بی جی، ویسے ہی اندر دم گھٹ رہا تھا.....“ سندس نے بڑی مہارت سے اپنے آنسو خشک کیے تو شہر زاد کو حیرانی ہوئی، جنوری کے سخت سردی کے موسم میں کسی کو اپنے سروٹ کاوٹر میں گھٹن کا احساس بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا، یہ بات وہ بن کے سمجھ سکتی تھی۔

”کل جب میں آفس سے آؤں تو میرے کمرے میں آنا، اس وقت اٹھو اور جاؤ اپنے کمرے میں، باہر اچھی خاصی ٹھنڈ ہے۔“

شہر زاد اسے اٹھا کر سنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی آئی، سامنے ایکوریم کے پاس رکھے کاؤچ پر ردی لا پرائی سے نیم دراز تھی اور اس کے ہاتھوں میں اس کا سیل فون تھا، جس پر وہ اس وقت کوئی ٹیکسٹ کرنے میں مصروف تھی، شہر زاد نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی۔

”نام نے میڈیسن لی.....؟“

”نہیں.....“ اس کے جواب پر وہ فکر مند ہوئی۔

”ردی! میں جانے سے پہلے کئی دفعہ تمہیں یاد دلا کر گئی تھی کہ مام کو نام پر میڈیسن ضرور دے دینا.....“

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے ان سے نہیں پوچھا ہوگا.....؟ اور اصرار کرنے پر جہاز نہیں کھائی ہوگی؟“ اس نے الٹا اسے لا جواب کیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ آج پھر اسٹرلین کا شکار ہیں.....“ وہ پریشان ہوئی۔

”یہ تو اب روز کا معمول بن چکا ہے اور میرے ساتھ تو شاید انہیں خاص پرائیلم ہے، وہ باتیں پوچھتی ہوں تو تب جا کر وہ کسی ایک بات کا ڈھنگ سے جواب دیتی ہیں، جیسے میں نے ان کا پتا نہیں کیا نقصان کر دیا ہو.....“

رومیہ کا موڈ بھی ٹھیک ٹھاک خراب تھا۔

”تم فینش مت لو، ان کی ذہنی حالت ہی ایسی ہے۔“ اس نے نرمی سے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔
 ”ابھی سیف الرحمن صاحب تشریف لے آئیں تو پھر دیکھنا، کیسے ان کی ساری بیماری ددمٹ میں غائب ہو جاتی ہے۔“

”وہ ان سے ملنے اور بات کرنے سے انکار کر چکی ہیں۔“
 ”تمہارے سامنے ڈرامے بازی کی رہی ہیں، ورنہ مام اور سیف الرحمن کو چھوڑ دیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ رومیہ آج اپنی پرانی جون میں تھی۔
 ”تمہیں کیا پرابلم ہے سیف الرحمن سے؟ کم از کم ہارون رضا سے تو ہزار گنا بہتر ہیں وہ۔“ شہزاد نے تحمل سے کہا۔

”یقیناً وہ بہتر ہوں گے، لیکن مجھے اب اپنے سوشل سرکل کے اس عمر کے مردوں پر تو قطعاً اعتبار نہیں رہا، جو گھر دہلی میں اپنی بیویوں کو رکھے دوسری عورتوں سے انصاف چلا رہے ہوتے ہیں اور اس چیز پر ان کا ضمیر بھی ان کو ملامت نہیں کرتا۔“

”میں اللہ سے دعا کروں گی کہ زندگی میں تمہیں کوئی ایسا مرد نہ ملے۔“ شہزاد نے بات کو جگہ جگہ ہلکے انداز میں ختم کرنے کی کوشش کی، اور اس کے اس جملے پر رومیہ کے چہرے پر بے ساختہ سا گلابی رنگ چھلکا۔
 اس کے ذہن کے پردے پر اسل کا چہرہ نمودار ہوا، جو کل دھڑلے سے اس کے گھر تک پہنچ گیا تھا، اور اس منظر کو یاد کرتے ہی ایک دلکش مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا، شہزاد کی زیرک نگاہوں نے بھی اس کے چہرے کے تاثرات کو تیزی سے پڑھا۔

”کہا ہوا؟“ کیا ایسا کوئی شخص ڈھونڈ لیا ہے تم نے؟“ اس نے دانستہ لاپرواہی سے اسے چھیڑا۔
 ”نہیں تو، بھلا کہاں سے ڈھونڈوں گی؟“ وہ صاف مکر سے ہونے لگی۔ ”دیے ہی تمہاری بات پر تھوڑا غور و فکر کیا تو قسم سے اپنے سوشل سرکل کا ایک بھی بندہ ذہن میں نہیں آیا۔“ رومیہ کے دل جگے انداز پر شہزاد نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی۔

”اچھا تم چھوڑ دو ان باتوں کو، میں جا کر دیکھتی ہوں مام کو۔“ شہزاد مسکراتے ہوئے ٹیٹا بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی، جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، سامنے ٹیٹا بیگم چھت پر نظریں جمائے بالکل ساکت و جامد لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ اتنا سپاٹ تھا کہ اسے ایک لمحے کو خوف سا آیا، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی زندگی سے عاری وجود اس کے سامنے موجود ہو۔

شہزاد کو دیکھ کر بھی ان کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ چلتے چلتے ان کے پاس پہنچ گئی، اور ہلکا سا جھجک کر ان کے ماتھے کا بوسہ لیا، ٹیٹا بیگم کے چہرے پر ہلکا سا غمیر رونما ہوا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ان کی یہ بیٹی محبتوں کے اظہار کے معاملے میں بالکل کوری ہے اور رومیہ تو اپنی بڑی بہن کے لیے اکثر مشین یا روبرو کا لفظ استعمال کرتی تھی۔

”مام! سی جی آپ.....؟ آپ کو پتا ہے، پی سی میں دیک اینڈ پرایک فیشن دیک اشارٹ ہو رہا ہے۔“
 شہزاد نے دانستہ اپنے گچے کو ہلکا جھکا رکھا۔ ٹیٹا بیگم اس کی بات پر پھیکے سے انداز میں ہلکا سا مسکرائیں۔
 شہزاد نے ان سے ہلکی چٹکی سی معمول کی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ان کی میڈیکل فائل اٹھائی اور پھر میڈیسن پر سرسری سی نگاہ ڈال کر لاپرواہی سے پوچھا۔
 ”رات کی ڈونڈ نہیں لی ناں آپ نے؟“ میرا انتظار کر رہی ہوں گی، پتا ہے مجھے۔“ شہزاد نے بڑی محبت

ان لی دوان کی طرف بڑھائی۔

”میرا دل نہیں چاہتا۔“ انہوں نے نظریں چرا کر آہستہ سے کہا۔
 ”آپ سے ہمیشہ میں نے ایک چیز سیکھی ہے کہ زندگی کے فیصلے دل سے نہیں دماغ سے کرنے چاہئیں ہے ناں۔“ اس نے مام کو بولنے کے لیے اکسایا۔
 ”فیصلہ چاہے دل کا ہو یا دماغ کا، جو خواری قسمت میں لکھی ہو، انسان اس سے نہیں بچ سکتا۔“ وہ اس مرد کی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”اگر خواری ہی کاٹنی ہے تو پھر مزے سے کاٹنی چاہیے مام، چلیں انھیں اور فائٹ کھائیں میڈیسن۔“ وہ بڑی مہارت سے ان کو ایک ایک کر کے سب ددائیاں کھلائی گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ اچھی خاصی کپ شپ لگا کر ٹیٹا بیگم کے پاس سے اٹھنے لگی تو انہوں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس نے حیرانی سے اپنی ماں کا زرد چہرہ دیکھا۔ ”کیا ہوا مام؟“
 ”شیری! تم دنیا کی سب سے میٹ بیٹی ہو۔“ ٹیٹا بیگم کے لہجے میں موجود محبت کو محسوس کر کے اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”شاید اس لیے کہ میں دنیا کی سب سے میٹ مام کی اولاد ہوں۔“ اس نے محبت سے ان کا ہاتھ دبایا۔

”میں اچھی ماں ہوتی تو رومی کے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔“ ان کا دماغ اسی ایک پوائنٹ پر آکر رک گیا تھا۔ شہزاد نے ان کی آنکھ کے کونے پر آنکھوں سے بے ساختہ نظریں پڑائیں۔
 ”اگر رومی کی قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا تو میں یا آپ لڑ بھی اسے نہیں بچا سکتے تھے، اس لیے جو ہونا تھا اسے بھول جائیں اور نیکسٹ کے لیے سوچیں، کیونکہ ہم دونوں کو آپ کی ضرورت ہے۔“ اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں پوری کوشش کروں گی۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔
 ”چھینک یو۔“ ہاں اٹکل سیٹی سے بات کر لیجئے گا، بہت اپ سیٹ ہیں وہ آپ کے لیے۔“ شہزاد دروازے کی طرف جاتے ہوئے لاپرواہی سے گویا، دلی

اور اس کی بات پر ٹیٹا بیگم کے چہرے پر نمودار ہونے والی مسکراہٹ ایک پل کو غائب ہوئی اور اس کی جگہ تشکر نے لے لی تھی، وہ جانتی تھیں کہ شہزاد کا دل بہت بڑا ہے اور وہ اپنی ماں کو انسان ہونے کا کافی مارجن دیتی تھی، ورنہ ایسی کسی بات کی توقع وہ رومیہ سے تو ہرگز نہیں کر سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بربان کا دماغ اس وقت شدید کھولنے کی زد میں تھا۔
 ٹھنڈے صبح موسم میں بھی وہ رات کے اس پہر اپنے گھر کے سامنے والے لان میں مسلسل ٹہل رہے تھے۔
 ٹہلنے ہوئے وہ ہادی کے گھر کی طرف غصے سے نگاہ اٹھا کر دیکھتے اور اس کے ساتھ ہی ان کے وجود میں اٹھتا لاوا پھٹنے کے قریب۔ ہو جاتا۔

طوبی اور نمبرہ کی باتوں نے انہیں گویا آسمان سے زمین پر لا پٹا تھا، انہیں درشہوار کا مقابلے کے فنکشن میں اسرار کر کے جانا اور بار بار منامیل سے شادی کے لیے اکسانے کے پیچھے موجود اصل وجہ سمجھ میں آگئی تھی، جو خاصی نا ارا دل دکھا دینے والی تھی۔

میر برہان اور ان کی بہن در شہوار ایک ہی کشتی کے مسافر تھے لیکن برہان کی خاندانی روایات اور نام نہاد غیرت اپنی بہن کے معاملے میں ان کو اپنا ظرف بڑا کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دے رہی تھی تب ہی تو وہ اس وقت آگ بگولہ ہوئے گھوم رہے تھے، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ در شہوار کے کمرے میں کھس کر اس کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دیتے یا اس کی گردن تو ضرور ہی مروڑ دیتے۔

”واہ میر برہان واہ، اپنے لیے زندگی کے اصول الگ اور بہن کے لیے علیحدہ.....“ ان کے اندر موجود ضمیر نامی چیز استہزائیہ انداز میں کہتی۔

”ہاں ہاں، میں اپنے خاندان کی کسی عورت کو اپنی روایات سے بغاوت کی اجازت نہیں دے سکتا، میں بے شک یورپ سے پڑھ کر آیا ہوں لیکن داہی بالکل ٹھیک کہتے ہیں، ہماری کوئی مشرتی اور خاندانی روایات بھی ہیں.....“ انہوں نے ضمیر کی آواز دبانے کی کوشش کی۔

اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑی اتالیق نے یہ منظر انتہائی دکھی انداز سے دیکھا، اسے میر برہان کی پریشانی بے بسی اور افسردگی کے پیچھے بس مسائل قریبی کا ہی چہرہ نظر آ رہا تھا۔ جو اسے بے رات بھر..... دکھی کرنے کے لیے کافی تھا جبکہ برہان کا سوچنے سوچنے دماغ شل ہو گیا تو وہ فیصلہ کن انداز میں کھڑے ہوئے۔

”مجھے امی سے بات کرنی چاہیے، کیونکہ ہمارا خاندان ایسے کسی اسکینڈل کا تحمل نہیں ہو سکتا۔“ وہ تیز تیز قدموں سے لان عبور کر کے گھر کے اندر داخل ہوئے، جس وقت وہ تاجدار بیگم کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہے تھے اس وقت میر ہادس کے ہال کمرے میں لگے گھڑیاں پڑھانی پہنچے کا وقت تھا۔

”برہان تم؟“ خیریت تو ہے ناں بیٹا.....“ تاجدار بیگم انہیں سامنے دیکھ کر بوکھلا گئیں، ان کی آنکھوں سے نیند ایک جھٹکے سے غائب ہوئی۔

”مجھے آپ سے انتہائی ضروری بات کرنی ہے ابھی اور اسی وقت.....“ برہان جانتے تھے کہ میر عتشم اس وقت اسلام آباد والے گھر میں ہیں، اسی لیے وہ بے دھڑک ماں کے کمرے کی طرف چلے آئے۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں.....؟“ وہ پریشانی سے ان کا بازو پکڑ کر اپنے بیڈ کے پاس لے آئیں، ان کا دل انہونی کے خیال سے کاٹنے لگا۔

”امی! جو بات میں آپ کو بتا رہا ہوں، یہ آپ کے اور میرے بیچ رہنا چاہیے، وعدہ کریں مجھ سے.....؟“

”ہاں ہاں بولو۔۔ کیوں پہیلیاں بگھوڑ رہے ہو۔۔؟“ انہوں نے خوف زدہ انداز میں اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، اتنا تو انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر کوئی بم پھوڑنے ہی آئے ہیں۔

”بولو ناں برہان، جب کیوں ہو؟“ انہیں شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر وہ جھنجھلا گئیں تو انہوں نے دل کڑا کر کے اپنا منہ کھول لیا۔ وہ انتہائی سے انہیں در شہوار اور ہادی کے بارے میں سب بتاتے چلے گئے۔

جیسے سنتے ہی تاجدار بیگم کا چہرہ بھی انڈے کی زردی کی مانند پیلا ہو گیا، وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بیڈ پر بیٹھیں، ابھی تو شاہ میر کی لائی ہوئی قیامت کو وہ اپنے اوپر پھیل رہی تھیں اور اب در شہوار کے تازہ ترین کارنامے نے ان کو ہلا دیا تھا۔

”واہ میرے خدایا، یہ میری اولاد کا بے جماعت دماغ کیوں خراب ہو گیا ہے، یہ سب مجھے اباجی کی نظروں میں ذلیل کر کے ہی رہیں گے، اس در شہوار کی تو میں ابھی جا کر طبیعت درست کرتی ہوں۔“ وہ جذباتی انداز میں کھڑی ہوئیں۔

”اسی! خواہ وہ کی جذباتیت سے مسئلہ مت بگاڑیں، تھوڑا تحمل سے کام لیں، یہی سب کچھ کرنا ہوتا تو میں

۱۔ سے بہتر کر سکتا تھا.....“ برہان نے جھنجھلا کر اپنی ماں کا ہاتھ پکڑا اور انہیں بیڈ پر دوبارہ بٹھایا۔

”میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا، اس بے وقوف لڑکی کو نہیں پتا، ہمارے ہاں عورتیں تو دور کی بات مردوں کی شادیوں بھی خاندان سے باہر نہیں کی جاتیں، بھول گئی وہ ماضی کا کتنے قصہ، آدھا گاؤں جل مرا تھا جس میں میرے اور انداز سے گویا ہوئیں۔

”آپ در شہوار کی خمدی طبیعت کو اچھی طرح سے جانتی ہیں، اسے جس کام سے منع کیا جائے، وہ کرنا تو اس پر گویا فریض ہو جاتا ہے، اس لیے میرے خیال میں ہمیں عقل مندی سے اس سارے معاملے کو ہینڈل کرنا ہوگا.....“ برہان نے اپنی ماں کو سمجھایا۔

”اور وہ طریقہ بھی اب تم ہی بتا دو، کیونکہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”مجھے تو حاجی سولی چڑھائی رہے ہیں، ساتھ میں یہ قصہ بھی بنادیں.....“ ایک تلخ مسکراہٹ نے ان کے لبوں کا احاطہ کیا۔

”دہ کیسے؟ کھل کر بتاؤ بیٹا، میرا تو اس وقت دماغ ہی کام نہیں کر رہا.....؟“ انہیں اپنی ماں پر بڑی طرح سے قفس آیا، جنہوں نے ایک اچھی بوہنے کے لیے ساری زندگی داد پر لگا دی تھی لیکن اب ان کی اپنی ہی اولاد ان کی ساری عمر کی عزت کو داؤ پر لگانے کے لیے تلی بیٹھی تھی۔

”در شہوار اور ارسل کا نکاح کر دیں، بلکہ میری مائیں ڈائریکٹ رخصتی بھی کر دیں، کیونکہ ارسل کی تعلیم مکمل ہونے والی ہے اور بابا نے ایک ملٹی مشن کمپنی میں اس کی جاب کے لیے بات بھی کر لی ہے.....“ ان کے مشورے پر تاجدار بیگم کے چہرے پر..... سکون کی کیفیت پیدا ہوئی۔

”لیکن ارسل کے لیے تو ندزنت، طوبی کا سوچے بیٹھی ہے.....“ وہ پریشان ہوئیں۔

”طوبی کی بعد میں دیکھی جائے گی پہلے آپ اپنے گھر میں لگی ہوئی آگ تو بجھائیں، فوراً بات کریں داہی سے بالکل بھی وقت ضائع نہ کریں، ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی.....“ برہان کے لہجے کی سنگینی نے ان کو ایک بار پھر ہلا دیا۔

ان کا ذہن تیزی سے تانے بانے بننے لگا، خاندانی سیاست اور جو توڑ میں ان کا دماغ ویسے ہی بہت تیز

چلتا تھا اور اس بات کا اعتراف تو پورا خاندان کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برہان کو تسلی تھی کہ اس کی والدہ یقیناً بہت جلد اس مسئلے کا حل نکال لیں گی۔

☆☆☆

کانی کاگ لیے شہر زاد کھڑکی کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر آن کھڑی ہوئی۔

اس کے سیل فون کی منہم گھنٹی بجی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل نے بے ربط انداز میں دھڑک کر گواہی دی کہ اس وقت اس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ شہر زاد نے مسکراتے ہوئے..... کال اٹینڈ کی۔

”آج آپ بتا ہی دیں، کب تک یہ آنکھ بھولی کا کھیل جاری رہیں گے میرے ساتھ.....؟“ اس نے طوکیا۔

”جب تک آپ میرے رقبوں کے ساتھ گھومنا پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا بند نہیں کریں گی.....“ دوسری طرف ہم راہی غیر سنجیدہ تھا۔

”آپ کو یہ کیوں لگتا ہے کہ ساری دنیا بس میرے ہی پیچھے ہے.....“ وہ مسکرائی۔

”تم ساری دنیا کو چھوڑ دو، یہ سز قریبی کا بیٹا، کس چکر میں اتنا جڑ کر بیٹھا ہوا تھا تمہارے ساتھ۔؟“ اس کے دل جلے انداز پر وہ بے ساختہ ہنسی۔ وہ۔۔۔ اسے انتہائی احترام سے کبھی ”آپ“ کہہ کر اور کبھی بے تکلفی کی ساری حدیں عبور کر کے ”تم“ پر اتر آتا۔

”آپ بھی تو وہیں موجود تھے ناں، آپ وہاں آکر بیٹھ جاتے، کس نے منع کیا تھا۔۔۔“ وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئی۔

”جس دن میں بیٹھ گیا ناں تمہارے پاس، ساری زندگی کے لیے اٹھنا بھول جاؤ گی۔۔۔“ اس کے ذومعنی انداز پر شہر زاد کی دھڑکن رکی۔

”اور میں جانتی ہوں، وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔۔۔“ اس نے مسکرا کر اطلاع دینے کے انداز میں کہا۔

”وجہ پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟“ وہ ہلکا سا بے چین ہوا۔

”نہ آپ میں اتنی ہمت ہوگی کہ اپنی نقاب کشائی کر سکیں اور نہ آپ زندگی میں کبھی میرے سامنے بیٹھنے کی جرات کر سکیں گے، اس لیے معاملہ بیچ میں ہی انکار ہو گا، ویسے حد ہوتی ہے بردی کی بھی۔۔۔“ وہ سراسر اسے اکسارتی تھی اور دوسری طرف وہ اس کی بات کے اندر چھپے مفہوم کو سمجھ کر ہنسا۔

اسی وقت ہم زاد کے بیڈروم کا دروازہ کھلا اور سیل فون کے ریسپونڈ سے آتی ہوئی ایک اور مردانہ بھاری آواز پر شہر زاد کے کان کھڑے ہوئے، کوئی اس کے بہت قریب آ کر انگلش میں بولا تھا۔

”بیٹا، یہ کنکشن ہیں اور صبح بچے چیک ان شروع ہو جائے گا، ایرپورٹ ٹائم سے پہنچنا ہے، اس لیے ٹائم سے سو جانا۔۔۔“

”ابی! چیک ان کو چھوڑ دے، میرا تازہ ترین نم سنئے، آپ کا دل بھی دہل جائے گا۔۔۔“ وہ شرارت سے اسے سناتے کو بلند آواز میں گویا ہوا۔

”فون پر بات کر رہے ہو تم۔۔۔“ انہوں نے تصدیق جانی۔

”جی ہاں، اور پتا ہے فون کے دوسری طرف موجود لڑکی آپ کے بیٹے کو بزدل اور کم ہمت کہہ رہی ہے۔“ اس نے اپنے باپ کو گھڑکانے کی کوشش کی۔

”اور درہ لڑکی شہر زاد کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔“ اس مردانہ جملے پر وہ ساکت ہوئی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم زاد کے خاندان کا کوئی اور فرد بھی اسے جانتا ہوگا۔ کافی کنگ پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی۔ جب کہ اس کا رواداں درواں جسم سماعت بن گیا۔

”میں اس کے علاوہ اور کس سے بات کرتا ہوں۔؟ ابی کیوں مشکوک کر رہے ہیں آپ اسے میری طرف سے۔۔۔“ وہ شوخ لہجے میں گویا ہوا جبکہ شہر زاد خود کو ایک عجیب سی صورت حال میں پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”اچھا نا لائق انسان! میری بات کرواؤ اس سے۔۔۔“ دوسری طرف سے آنے والی فرمائش پر شہر زاد کا دل بُری طرح سے دھڑکا۔

”بات کرو گی میرے قادر سے۔۔۔؟“ وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔!“ یہ سہری موقع وہ کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔۔۔

”یہ کیس ابی، پیلیز، میری شکایتیں مت لگایے گا۔ ایسا نہ ہو، وہ پھر مجھ سے ڈر کر دوبارہ لندن بھاگ جائے۔۔۔“ اس نے فون ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے نصیحت کی۔

”ہیلو بیٹا! ہاؤ آر یو، اس بلا لائق کی باتوں کو دل پر لینے کی ضرورت نہیں، اسے شروع ہی سے ڈرامے بازی

لے نے کی عادت ہے۔“ وہ امریکن انگلش لہجے میں بہت پیارا اور اپنائیت سے گویا ہوئے۔

”ڈونٹ وری انکل! بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں میں بھی۔۔۔“ اس نے بھی انگلش میں ہی جواب دیا۔

”تم مجھے ابی کہو گی تو اچھا لگے گا مجھے۔۔۔“ ان کی اگلی فرمائش اردو میں آئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا دی۔

”کیسے ہیں آپ۔۔۔؟ اور کیا چل رہا ہے آج کل۔۔۔؟“ اس نے فوراً ہی پوچھا۔

”لائف اگمدا اللہ بہت اسٹبل ہے، کل میں اور یہ تالائق جا رہے ہیں امریکہ، شاید اس نے بتایا ہو تمہیں۔۔۔“ ان کی اس اطلاع پر اس کا دل یکبارگی دھڑکا۔

”نہیں، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”آپ تو زیادہ ہی فری ہو رہے ہیں، ٹائف فون دیں میرا اور جا کر سو جائیں۔۔۔ گڈ نائٹ۔۔۔“ وہ ان سے اپنا فون واپس لے چکا تھا۔

”او کے بیٹا، گڈ نائٹ، الارم نکال دینا، درنہ فلا میٹ نکل جائے گی۔۔۔“ وہ کمرے سے نکلتے نکلتے بولے۔

”کیوں، ڈر گئے، کہیں آپ کی اصلیت نہ بتا دیں مجھے۔۔۔“ شہر زاد نے اسے چھیڑا۔

”تم پوچھ لیتیں تو وہ بھی جھوٹ نہ بولتے۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اچھا تو پھر دوبارہ بات کروائیں میری۔۔۔“ وہ بے تاب ہوئی۔۔۔

”کیوں، میں صبح و شام گھاس کھاتا ہوں کیا۔؟ اتنا پائگل مجھ رکھا ہے مجھے۔۔۔“ اس کا لہجہ شوخ تھا اس لیے اس نے بات ہی پلٹ دی۔

”اچھا پھر اپنی می سے بات کروا دیں۔؟“ اس کو بھی نئی شرارت سوچھی۔

”ضرور کروا دیتا، اگر وہ قبرستان میں دائمی نیند نہ سو رہی ہوگی۔۔۔“

”اوہ سوری۔۔۔ مجھے پتا نہیں تھا۔۔۔“

”اُس او کے ڈونٹ وری۔۔۔“

”اور بہن بھائی۔۔۔؟“ اس نے مختاط انداز میں پوچھا۔

”ایک جھوٹا بھائی کراچی میں پوسٹل ہے ان دنوں اور سب سے چھوٹی بہن اسپیشلائزیشن کرنے امریکہ گئی ہوئی ہے۔“ اس نے پہلی دفعہ اپنی فیملی کے بارے میں اتنی تفصیل سے کھل کر بتایا تھا۔

”اور آپ کیا کرتے ہیں۔۔۔؟“ وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئی۔

”ایک مصروفی بیماری کی لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور دن رات اس کی جھاڑ کھاتا ہوں، اتنے سالوں سے اسے پنانے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن افسوس وہ مجھے گھاس ہی نہیں ڈال رہی، دیکھا۔ میں کتنا مشکل کام کرتا ہوں۔۔۔“ وہ پھر پٹری سے اترا۔

”آپ سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے، انتہائی فضول انسان ہیں آپ۔۔۔“ دوسری طرف موجود شہر زاد اس کی فیئر سنجیدگی پر تپ گئی، اس نے غصے سے فون بند کیا اور اگلے۔۔۔ میں سیکنڈ کے بعد اس کی کال دوبارہ آنے لگی، اس بار شہر زاد نے فون ہی آف کر دیا۔

”میں ہی پاگل ہوں، جو اتنے عرصے سے اس کے ہاتھوں بے وقوف بن رہی ہوں، اگر کسی کو پتا چل جائے تو یقیناً میری عقل پر ماتم ہی کرے۔۔۔“ وہ غصے سے اٹھ کر بیٹھنے لگی۔

”آخر مجھے اس سے بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جو بندہ اپنی شناخت چھپا سکتا ہے، وہ کیسے قابل اعتبار ہو سکتا ہے۔“ ایک اور سوچ نے اس کے دماغ کا احاطہ کیا، اس نے خود کو کونسا چھوڑا اور اپنا لپ ٹاپ اٹھایا، اس کا ارادہ سنجیدگی سے اب کچھ کام کرنے کا تھا۔ اسی وقت ملازمہ ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں کارڈ لیس فون دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ دوسری طرف ہم زاد کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا، اس نے یقیناً اس کا سیل فون آف دیکھ کر اس کے گھر کے نمبر پر کال کر لی تھی۔۔۔

”بی بی جی! کال ہے آپ کی.....“ ملازمہ نے اس کی طرف کارڈ لیس بڑھایا جو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی پکڑنا پڑا۔

”اچھا جاؤ تم.....“ اس کی تیوری کے بل گھرے ہوئے۔

ملازمہ کے کمرے سے نکلے ہی وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑتے ہی ناراضی سے شروع ہو گئی۔ ”ہزار دفعہ میں نے آپ سے کہا ہے، گھر کے نمبر پر کال مت کیا کریں مجھے، لیکن آپ کو یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آتی، کیوں ہاتھ منہ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں میرے.....؟“

”آئی ایم سوری، شیری یہ میں ہوں ارغشی حیدر.....!“

ریسیور کے اندر سے نکلنے والی ارغشی کی آواز سن کر اسے لگا جیسے کسی نے فریج سے ٹھنڈے بخ پانی کی بوتل نکال کر اس کے اوپر الٹ دی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر مٹلی سی جم گئی اور کانوں میں شائیں شائیں کا شور بڑھ گیا۔

”اس سے پہلے تو آپ نے مجھے بھی گھر کے نمبر پر کال کرنے سے منع نہیں کیا۔“ اس کی خفت زدہ آواز سن کر شہر زاد کا شہد سے دل چاہا کہ وہ جا کر اس کے منہ پر مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دے، اس کا ایک ایک لفظ اسے شرمندگی کی گہری دلدل میں پھیل رہا تھا۔

”اوہ آئی ایم سوری، میں کوئی اور بھی تھی.....!“ اس نے پوری طاقت لگا کر چند لفظ بولے۔

”اگر آپ کو کوئی تنگ کر رہا ہے تو مجھے بتائیں، یہ تو کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے، دودن میں حل ہو جائے گا.....“ دوسری طرف موجود ارغشی بھی سمجھ چکا تھا کہ اسے جھاڑ کسی اور کی غلط فہمی کے نتیجے میں پڑی ہے، لیکن اس غلط فہمی نے اس کے سارے حواس چوکس کر دیے تھے۔

”اٹس اوکے ارغشی، آپ نے خیریت ہے اس وقت کال کی.....؟“ اس نے جان بوجھ کر موضوع گفتگو بدلا لیکن اس کا ہاتھ عرق انفعال سے تر تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ فوراً فون بند کر دے لیکن یہ اس سے بھی بڑھ کر بدتر ہی ہوتی۔

”مجھ ردمبھہ کی پیشی ہے اور میں چاہتا ہوں آپ کچھ پوائنٹس انہیں راستے میں اچھی طرح سے سمجھا دیں۔ میں نے آپ کو ابھی ایک ای میل کی ہے، آپ ٹائم نکال کر اسے چیک کر لیجیے گا.....“ وہ بڑے مہذب انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

”جی تھینک یو، میں ابھی دیکھ لیتی ہوں، صبح ان شاء اللہ بات ہوگی.....“

اس نے جیسے ہی فون بند کیا، کارڈ لیس کی گھنٹی ایک دفعہ پھر بج اٹھی۔ اس دفعہ اس نے ذرا احتیاط انداز میں بیلو کہا۔

”اس طرح خفا ہو کر فون بند کر دی تو ساری رات سو نہیں پاؤں گا.....“ ہم زاد کا مخصوص لہجہ سن کر اس کے حلق سے ایک لمبی سانس برآمد ہوئی۔

”اور اتنی لمبی لمبی سانسیں لوگی تو اسلام آباد کا موسم مزید سرد ہو جائے گا۔“

”آپ کو پتا ہے، اس دقت کیا ہوا ہے؟“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔ ”آپ کے فون کال سے پہلے ارغشی کی کال آئی تھی اور میں نے آپ کے پکڑ میں اس بے چارے کو بری طرح سے جھاڑ دیا اور بعد میں پتا چلا وہ آپ نہیں تھے۔“

”دیش گریٹ.....!“ اس کی بات سن کر وہ بے ساختہ ہنس۔ ”گندی گندی گالیاں دی تھیں ناں اس خبیث کو؟ پولیس یو نیفارم پہن کر خود کو دنگ والا ہیرد سلمان خان ہی سمجھنے لگتا ہے گدھا.....“ اس کی شوخی آج عروج پر تھی۔

”کیا چیز ہیں آپ.....“ وہ نہ جانتے ہوئے بھی اس کی باتوں پر ہنس پڑی۔

”تھینک یو، آج رات بہت سکون کی نیند آئے گی مجھے، بس آپ یونہی میرے رقبہ کو جھاڑتی رہا کریں، اب اجازت دیں، ٹیک کبیر، بائے.....“ وہ فون بند کر چکا تھا، شہر زاد نے بھی اپنی فائل اٹھائی اور اس پر نیکسٹ پیشی کے نوٹس لکھنے لگی۔

☆☆☆

”ہادی یار، بات تو خاصی پیچیدہ ہے یہ.....“ سعد نے مخاطب انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”پیچیدہ ہی نہیں باعث رسوائی بھی.....“ ہادی نے اپنا شکل ہوتا ہوا دماغ سنبھالتے ہوئے سعد کی طرف دیکھا، وہ دونوں دوست اس دقت مال ردو کے ایک ریسیورٹ میں موجود تھے اور ان کے سامنے رکھی آکس کریم کافی حد تک پھیل چکی تھی۔

ہادی جب سے مری واپس آیا تھا۔ اس وقت سے شدید قسم کی ٹینشن کا شکار تھا، منائل کی خود سری نے اس کے ہاتھوں کے توتے اڑا دیے تھے اور اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ وہ ضدی لڑکی جس چیز کے لیے اڑ جاتی، اسے حاصل کر کے ہی دم لیتی تھی۔

اس نے کافی غور و فکر کے بعد سعد سے یہ بات ضمیر کرنے کا فیصلہ کیا، اور اسی لیے اسے لے کر یہاں آیا تھا، راستے میں آتے ہوئے وہ اسے کافی تفصیل سے منائل اور برہان کا قصہ سنا چکا تھا۔

”میرے خیال میں تمہیں فوراً آٹنی سے بات کر لینا چاہیے.....“ سعد نے سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا۔

”لیکن اس سے پہلے میں میر برہان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ ہادی کی بات پر وہ چونکا۔

”میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ جب کوئی لڑکی اس حد تک خود سری اور ضد پر اتر آئے تو یقیناً اس کے پیچھے کسی مرد کی دی ہوئی شہہ ہی ہوتی ہے۔“ سعد نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

”تمہارے خیال میں میر برہان سیریس ہے اس کے لیے؟“ اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

”اس کے سیریس ہونے سے کچھ نہیں ہوگا کیونکہ جہاں تک میری معاملات کا تعلق ہے یہ لوگ خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے اور اگر کبھی لیں تو انہیں وہ عزت اور اہمیت نہیں دیتے جو ایک عورت کا بیوی بننے کے بعد ملتی ہوتی ہے.....“

”ہاں میر خاقان علی کے چٹ پٹے قصے کون نہیں جانتا، سوائے میری بے وقوف بہن کے.....“ ہادی نے طعنے انداز میں لقمہ دیا۔

”تمہیں یہ بات تفصیل سے بتانی چاہیے منائل کو.....“

”وہ کچھ سننے کو تیار بھی تو ہو، برہان نے اس کا دماغ کافی خراب کر رکھا ہے، اسے میر فیملی کی غلط ریپورٹیشن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ خاصا تپا ہوا تھا۔

”مجھے لگتا ہے یہ ساری برہان کی، کی ہوئی برہان واشک ہے، بلکہ پورا خاندان ہی اس کام میں ماہر ہے اب اس کی بہن کو بھی دیکھ لو، کتنی کوشش کی اس نے تمہاری توجہ حاصل کرنے کی.....“ سعد نے سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

”حالانکہ اس سے آدمی کوشش تمہارے لیے کرتی تو اب تک تم دونوں بھاگ کر شادی کر چکے ہوتے۔“ ہادی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”بکواس بند کرو، میرا دماغ سیٹ ہو چکا ہے اب، اور ویسے بھی مجھے اتنی منہ زور لڑکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں.....“ وہ پہلی دفعہ اتنا تھل کر بولا۔

”تو صاف صاف کہو! اس کے خاندان کے ساتھ کوئی بڑا اور ڈنہیں کر سکتے.....“ ہادی نے اسے چھیڑا۔

”اتنے بھی پیچھے خان نہیں ہیں وہ، اور شاید ان کا مقابلہ کر بھی لیتا، لیکن سچ پوچھو تو وہ شہواری خود سری اور بے باکی نے دل کھنا کر دیا ہے میرا، اور ویسے بھی اس کے تمام تر نیکی جذبات اب صرف تمہارے لیے ہیں تو میں پھر اس دیوار سے سر کیوں پھوڑوں.....“ سعد کے لہجے کی چٹائی گواہی کی کہ اسے عقل آچکی ہے۔

”اس کا مطلب ہے کہ میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں.....؟“ ہادی ہنوز شرارتی موڈ میں تھا۔

”ہاں۔ اگر تم اس کے ساتھ بھاگنا چاہو تو میں اس کا انتظام کروا سکتا ہوں.....“ سعد نے بھی اپنا حساب پورا کرنے کی کوشش کی

”شٹ اپ.....!“ اس نے نہ اسامہ بنایا۔

”یقین مانو، میرا خاندان سے بدلہ لینے کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے اگر میرا برہان نے منائل کے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کی تو شرط کا یہ بہرہ کھیل کر تم اس خاندان کو ناکوں چنے چوکتے ہو.....“ سعد نے اسے ایک نئی پٹی بڑھانے کی کوشش کی۔

”یہ دیکھو.....!“ ہادی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ”ابھی اتنا بڑا وقت نہیں آیا مجھ پر کہ میں کسی عورت کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاؤں، اگر ایسا کوئی موقع آیا بھی تو میں خود سینہ تان کر ان کے سامنے جاسکتا ہوں.....“ اس نے بیزارگی سے جواب دیا۔

”ہاں ایک بہادر ماں کے بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہیے.....“ سعد اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

”چل اب اٹھ یہاں سے، سردی میری رگوں میں گھسی جا رہی ہے.....“ ہادی اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ گھسا کر کھڑا ہوا۔ وہ دونوں لمبی واک کرتے ہوئے جب مال روڈ سے نکلے تو سعد چلتے چلتے چونکا۔

”شاہ میر کا اس لڑکی کے ساتھ کوئی جکر چل رہا ہے کیا.....؟“

”ایف سی کے عین سامنے کھڑے شاہ میر اور طوبی کو دیکھ کر سعد نے سرگوشی کے انداز میں تبصرہ کیا تو وہ چپ اٹھا۔“ اس خاندان کے لڑکے لڑکیوں کو بھی لگتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے، اب اس سے سلام دعا کرنے مت کھڑے ہو جانا، بس آنکھ بچا کر نکل جاؤ.....“

ہادی اور سعد دونوں کمال کی اداکاری کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوئے، دوسری طرف شاہ میر بڑی دلچسپ اور شرارتی نگاہوں سے طوبی کی طرف دیکھ رہا تھا، جو اس کے دیکھنے پر تھوڑا ہزل ہو رہی تھی۔

”قسم سے طوبی، اس رومانس کا مزالینے کے لیے تو مجھے کافی عرصہ پہلے ہی گھر پھوڑ دینا چاہیے تھا.....“ شاہ میر نے ڈسپوزیبل گلاس میں اسٹرا اٹھاتے ہوئے طوبی کو جان بوجھ کر چھیڑا۔ وہ دونوں آج سب سے نظر بچا کر یہاں اکٹھے تھے۔

”آج تو آگئی ہوں، دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گی.....“ طوبی نے اسے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

”یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلے گا جناب، ویسے بھی اپنی محبت پر اتنا یقین ہے مجھے کہ کچے وھاگے سے چلے میں گے سرکار بندہ.....“ وہ شوخی سے گویا ہوا۔

”آپ کی فضول باتیں ختم ہو گئی ہوں تو کیپٹن صاحب! مجھے گھر چھوڑ آئیں، واجی آگئے تو آپ کا تو پتا نہیں میرا کورٹ مارشل ضرور ہو جائے گا۔“ طوبی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ڈسپوزیبل گلاس ڈسٹ بن میں اچھالا تو شاہ میر نے بھی رسمت واقع پر ناگم دیکھا، شام کے پانچ بج رہے تھے اور اس سے زیادہ باہر رہنا دونوں کے لیے خطرناک تھا۔

☆ ☆ ☆

”غضب خدا کا، پورے میر ہاؤس کا حلیہ بگڑ چکا ہے.....!“

میر حاکم ٹیلیٹ ٹیلیٹ رکتے اور مزید گویا ہوئے۔ ”جس کو دیکھو ہر کوئی اپنا اپنا قبلہ بنائے بیٹھا ہے آج کل“

بہت دن بعد آج میر حاکم کے سامنے تاجدار بیگم کی پیشی تھی، اور وہ جو شاہ میر کے گھر سے نکالے جانے پر احتجاجا سب کا بائیکاٹ کر کے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر چکی تھیں، انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس بار میر حاکم سیدھا ان ہی کے بڈروم میں آکر کچہری سجائیں گے۔

”تایاجی! اس گھر میں میرے علاوہ بھی اور لوگ ہیں.....“ تاجدار بیگم نے ڈھکا چھپا انداز اپنایا۔

”جانتا ہوں میں، تمہارا اشارہ شارقد اور ندرت کی طرف ہے، ان میں اتنی عقل ہوتی تو مل کر خاقان کو نہ سنبھال لیتیں، وہ جگہ جگہ منہ مارتا نہ بھرتا اور نہ ہی اس کی رنگ برنگی راستائیں سننے کو ملتیں۔“ ان کا طنزیہ انداز تاجدار بیگم کے دل و دیاغ پر پھوار بن کر برسا۔

انہوں نے جتنائی ہوئی نگاہوں سے اپنے سامنے خاموش بیٹھے میر مختشم کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہی ہوں کہ سن لیں اس خاندان کی واحد سمجھ دار خاتون کا تاج ان ہی کی بیوی کے سر پر ہے، اور سونے پہ سہاگہ نام بھی تو ان کا تاجدار بیگم تھا۔

”آپ کچھ بھی کہیں تایاجی! اس گھر اور خاندان کے لیے میں نے اپنی ہڈیاں تک گلا لیں لیکن.....“

”نیکین کیا.....؟“

”آج تک میرا کسی نے لحاظ نہ کیا، اور پورے خاندان کے سامنے دو ٹکے کا کر دیا مجھے، آپ اپنے ایمان سے کہیں، میں کس منہ سے اپنے کمرے سے نکلوں اور اپنی دیواروں کے ساتھ جا کر بیٹھوں.....“ انہوں نے جذباتیت کی انتہا کرتے ہوئے آنسو تک نکال لیے۔

”شاہ میر والی بات پر میں ہزار دفعہ معذرت کر چکا ہوں، خدا کے واسطے بس کرو اب.....“ میر مختشم اپنے والد صاحب کے سامنے دوبار ان ہی باتوں پر جھنجھلا سے گئے اور میر حاکم نے اپنی سب سے لاڈلی بہو کا آنسوؤں سے بھرا ہوا چہرہ دیکھا تو ان کا دل تپ چکا گیا۔

”ماں ہوں میں کیسے بس کروں، ساری ساری رات مجھے نیند نہیں آتی، اتنے سالوں سے پوسٹنگ ہو رہی ہے اس کی، پہلی دفعہ تو اپنے گھر کے پاس پوسٹ ہوا تھا اور آپ نے نکال دیا اسے.....“ وہ میر حاکم کو جذباتی کرنے کے لیے ذرا اونچی آواز میں رونے لگیں۔

”اس بے وقوف نے بھی تو ایک دفعہ بھی معافی مانگنا گوارا نہیں کی اپنے باپ سے۔“ میر مختشم ہلکا سا چڑ کر

بولے۔
”اسی سلسلے میں دو تین بار آچکا ہے وہ، لیکن میں نے ہی بھگا دیا کہ تمہارا باپ سخت غصے میں ہے۔“
تاجدار نے آنسو پونچھے ہوئے اپنی طرف سے آدھا جھوٹ اور آدھا سچ بولا، شاہ میر گھر آیا ضرور تھا لیکن صرف اپنی ماں سے ملنے کے لیے۔

”اچھا! ختم تم چھوڑ دو! ناغصہ، اولاد ہی ناہنجار ہو تو انسان کیا کر سکتا ہے، فون کر کے بتا دینا اسے، جب چاہے آسکتا ہے۔“ میر حاکم علی کی بات پر تاجدار کا چہرہ ایک دم مکمل سا اٹھا، ان کے شوہر ختم صاحب نے جھنجھلا کر انہیں دیکھا لیکن مصلحتاً خاموش رہے۔
”تایا! اب ایک اور درخواست کرنی تھی آپ سے۔۔۔۔۔؟“ تاجدار بیگم نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ایک اور کوشش کی۔

”ہاں ہاں۔ بولو۔۔۔۔۔“
”مجھے نہیں پتا، آپ میری اس بات کو کیسے لیتے ہیں، لیکن میری اور برہان کی دلی خواہش ہے کہ اس کی شادی کے ساتھ دروہو اور ارسل کا قصہ بھی بنادیا جائے۔۔۔۔۔“ وہ غلط انداز میں گویا ہوئیں۔
”لیکن دروہو اور ابھی توڑا بیچن میرا خیال ہے اسے گرجویشن کر لینی چاہیے۔“ ختم صاحب نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔

”اس سے بھی چھوٹی عمر تھی میری، جب میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی اور ویسے بھی دو چار سال بعد بھی دروہو کی عقل میں اضافے کی مجھے تو قطعاً بھی امید نظر نہیں آتی تو اچھا ہے لگے ہاتھوں یہ قصہ بھی نبٹ جائے۔“
تاجدار بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے میاں کو وہ ساری داستان سنا دیں جس نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔

”ویسے تاجدار کی بات میں دم تو ہے، اچھا ہے گھر کی بچیوں کے فرض سے ہم جتنی جلدی سبک دوش ہو جائیں، تم کیا کہتے ہو ختم۔؟“ میر حاکم آج اپنی بہو کے چیلن پر ہی چل رہے تھے، ان کی بات پر میر ختم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
”دیکھ لیں بابا جان! جو بات آپ کو مناسب لگے۔۔۔۔۔“

”میری مائیں تو تایا ابا، آپ بس بسم اللہ کریں، تیاری میں ایک ہفتے میں کر لوں گی۔ اس کی فکر مت کیجئے گا۔“ تاجدار بیگم نے بے تابی سے کہا۔

”طیلس بابا جان، اس بھانے آپ کی بہو کے پیروں کی مہندی تو اترے گی ناں، ورنہ گھر کا نظام یوں ہی درہم برہم رہے گا۔“ ختم صاحب نے بھی اپنی بیگم کا موڈ بہتر کرنے کے لیے ہلکے ہلکے انداز میں کہا تو میر حاکم مسکرا دیے اور ان کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی رضامندی نے تاجدار بیگم کے سینے پر دھرا بو جھٹھوڑا کم کر دیا تھا۔

☆☆☆

جشن محمود کے بیٹے روحیل کے قتل کے واقعے میں ایک دلچسپ موڑ آیا تھا۔
رومیہ کی آج صبح عدالت میں پیشی تھی اور وہ شہر زاد اور ارسل کے ساتھ ٹائم پر وہاں موجود تھی۔
اس کے آنے سے پہلے ہی احاطہ عدالت میں مختلف چیئروں کے رپورٹرز کی چیل پہل نظر آرہی تھی، جو آج کسی خاص خبر کے منتظر تھے اور شہر زاد نے بھی ان کو مایوس نہیں کیا۔

کمرہ عدالت میں دیے جانے والے رومیہ کے بیان کے ساتھ روحیل محمود کے بیسٹ فرینڈ صارم خان کی گواہی نے ہر طرف ایک سنسنی سی مجادی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میڈیا میں رنگ برنگی خبروں کا طوفان آگیا۔
صارم خان، شہر زاد کی رومیہ کے توسط سے پہنچا تھا اور اسے یہاں تک لانے میں ساری محنت ارسل کی تھی، جو خود بھی اس وقت کمرہ عدالت میں موجود تھا لیکن اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ میڈیا کے کسی نمائندے کے سامنے نہ آئے، بلکہ صارم اور رومیہ کے علاوہ کوئی بھی ارسل کو نہیں جانتا تھا۔

صارم خان نے دو دو گھنٹوں میں کمرہ عدالت میں بتایا کہ اس رات گاڑی رومیہ نہیں کتنزہ وقار چلا رہی تھی اور چونکہ صارم بھی اپنے دوست کی مدد کے لیے اپنی گاڑی پر اس کے پیچھے تھا، چنانچہ یہ سارا منظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا صارم نے مزید یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ یہ بات اس کلب کے چوکیدار کے علاوہ بھی کچھ اور لوگ جانتے تھے کہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر کتنزہ وقار تھی۔

کورٹ سے پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے رومیہ نے کئی دفعہ ارسل کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں میں اس کے لیے ایک خاموش دلاسا تھا، اس کے دہاں ہونے کا احساس رومیہ کو خاصی تقویت بخش رہا تھا۔
دوسری طرف میڈیا کے نمائندے وقار درانی کے گھر کے باہر براہِ جا کر بیٹھ گئے تھے، اور ان کے خاندان میں ایک ہانچ سی بچ گئی تھی، وقار درانی کا غصے اور پریشانی سے بُرا حال تھا کیونکہ شہر زاد نے ان کی کوئی بھی کال اسٹینڈ نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”ہم ان شاء اللہ یہ کیس جیت جائیں گے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔۔۔“ رومیہ نے ارسل کا یہ ٹیکسٹ صبح گاڑی میں بیٹھے ہوئے پڑھا۔
”تمہاری محبت میری زندگی کے راستوں کو آسان ہی نہیں بلکہ خوبصورت بھی بنائے گی مجھے اس بات کا یقین ہے۔“ اس نے فوراً یہ صبح ارسل کے نمبر پر پیج کر گاڑی کی پشت سے ٹیک لگا لگی تھی۔
شہر زاد اس کے ساتھ بھی مسلسل اپنے ساتھیوں کی کالز اسٹینڈ کر رہی تھی، جو اس کیس میں اس کے ساتھ کھڑے تھے۔

”ویل ڈن شیر۔۔۔۔۔ تم وکٹری اسٹینڈ کے بہت قریب پہنچنے والی ہو۔“ مسز عالیہ قریشی کی کال ہمیشہ اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہے میم۔۔۔۔۔“ اس نے بھی کھلے دل سے اعتراف کیا۔
مسز عالیہ قریشی کی کال جیسے ہی بند ہوئی، انٹرنیشنل نمبر سے آنے والی اگلی فون کال نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ربط کیا، وہ لاکھوں میل کے فاصلے پر بھی اس کی ایک ایک چیز پر نظر رکھے ہوئے تھا۔
”تم نے تو اس بار مجھے حیران کر دیا، کہاں سے ڈھونڈ لائی ہو تم صارم خان کو۔۔۔۔۔“ ہم زاو کے لہجے میں چھپی سٹائش نے اس کا حوصلہ مزید بڑھایا۔

”تم ساری باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ میری یہ مودیسی گئی تھیں۔۔۔۔۔؟“
”بہت زبردست لیکن وقار درانی کے بارے میں بہت زیادہ غلط ہو جاؤ، وہ اب تمہارے سامنے ہر قسم کا چارہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔۔۔۔۔“ وہ امریکہ میں بھی اس کے لیے فکر مند تھا اور یہ بات شہر زاد کو ہلکا چمکا کرنے کے لیے کافی تھی۔

”آپ بس مجھے ایڑی لیتا چھوڑ دیں، باقی چیزیں میں خود سنبھال لوں گی۔“ شہر زاد کے لہجے کی کھنک پر رومیہ نے چونک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا، اور پہلی دفعہ اس کے ذہن میں بھی کوئی الارم گونجا، وہ فون بند کر

جکی تھی لیکن اس کے لیے برائے دلکش مسکراہٹ ابھی بھی موجود تھی۔
دونوں ہمیں گھر پہنچیں تو بیٹا بیگم کو خلاف توقع اپنے بیڈروم سے لاؤنج میں دیکھتے ہی انہیں خوش گوار حیرت ہوئی۔ ان کی نظر ابھی سیف الرحمن پر نہیں پڑی تھی جو سنگ لاؤنج کی دائیں دیوار کے پاس رکھے سنگل صوفے پر براجمان سگار پی رہے تھے۔

”مبارک ہو شیری! درست موقعوں پر درست چیزوں کا استعمال ہی کسی پیر مشرک کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔“
سیف الرحمن کی سنجیدہ آواز پر وہ دونوں چپکے اور رومیسہ کا چہرہ تاد کا شکار ہوا۔
”ٹھیک پوسر.....“ اس نے پُر وقار انداز میں جواب دیا اور بیٹا بیگم کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”مام کسی ہیں آپ.....؟“

”یہ صادم خان کہاں سے ملا تمہیں۔۔۔؟ وہ بے تابی سے گویا ہوئیں، بہت دن بعد انہوں نے معمولات زندگی کے کسی مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اور یقیناً اس کے پیچھے سیف الرحمن کی محنت اور کاوش تھی۔
”رومیسہ کے ریفرنس سے آیا تھا وہ لڑکا۔۔۔“ شہر زاد نے اپنی بہن کی طرف دیکھا، جو سیف الرحمن کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی شہر زاد کو اس کی بد اخلاقی پر تھوڑی شرمندگی ہوئی۔
”سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ روحیل کا بیسٹ فرینڈ ہے تو اس نے رومیسہ کے حق میں گواہی کیوں دی۔۔۔؟“ سیف الرحمن کے اس سوال پر وہ ہلکا سا گڑبڑائی۔

”ہم سچائی کو زیادہ دیر تک بند کروں یا بند نہوں کے پیچھے نہیں چھپا سکتے.....“ وہ بین ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور پُر اعتماد انداز میں گویا ہوئی۔

”لیکن ایسی دل دکھاوینے والی سچائی جس سے اس کے بیسٹ فرینڈ کا سارا خاندان ہرٹ ہو سکتا ہے، اس کے لیے وہ کیسے راضی ہوا؟ میرا یہ مطلب ہے کہ اسے اس پوائنٹ تک کون لے کر آیا اور اس کا کیا مقصد تھا؟ وہ کیوں رومیسہ کی ہیلپ کرنا چاہتا ہے۔؟“ سیف الرحمن نے بیورو کرہی میں اتنے سال کام کیا تھا اور ان کا چیزوں کو دیکھنے کا اپنا ذوق یہ نگاہ تھا۔

”بس کرو سینی، اس بچے کا ضمیر جاگ گیا ہوگا.....“ بیٹا بیگم کو ان کی باتیں بے وقت کی راگنی محسوس ہوئیں اور دوسری طرف انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں شہر زاد ان کی باتوں کا ٹرانسمان جائے۔

”اُس اوکے مام.....“ شہر زاد نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بولنے سے منع کیا۔ وہ سیف الرحمن کے عین سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔؟“ شہر زاد نے سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا، اس کا دماغ اسی پوائنٹ پر چلنے لگا تھا، جس پر سیف الرحمن اسے لانا چاہتے تھے۔

”بیٹا! میں کوئی تنفرم بات تو نہیں کر سکتا، لیکن ان تمام چیزوں کے درمیان میں کوئی کنکشن ایسا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے، اور ہمیں اس کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے کیونکہ ایسا نہ ہو کہ کو خدا نخواستہ ساری بساط پلٹ جائے“ انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک یو انکل، ٹھیک پوسوچ۔ میں آپ کا پوائنٹ بالکل سمجھ چکی ہوں۔ آپ بہت حد تک ٹھیک کہہ رہے ہیں.....“ وہ ایک گہرا سانس لے کر کھڑی ہوئی

اور بیٹا بیگم نے حیرانی سے سیف الرحمن کی طرف دیکھا۔
”بیٹا! تمہاری بیٹی بہت لائق ہے، اور اسی رفتار سے چلتی رہی تو بڑے بڑے لوگوں کے چیمبرز بند کروادے

کی۔“ اس کے لاؤنج سے نکلے ہی انہوں نے کھل کر شہر زاد کو سراہا اور بیٹا بیگم بے ساختہ انداز میں مسکرا دیں کیونکہ وہ بھی اپنی بیٹی کی جبر پورا ازان سے واقف تھیں۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں چاروں طرف خزاں کے زرد پتوں کا راج تھا۔
مناہل کی گاڑی کیسپس کی پارکنگ میں آن رکی اور وہاں پہلے سے موجود برہان کی گاڑی دیکھ کر اس کے دل میں طمانیت کا احساس پیدا ہوا۔ برہان پچھلے دو روز سے یونیورسٹی نہیں آ رہے تھے اور مناہل نے یہ اڑا تلبس کھٹے باقاعدہ کڑھتے ہوئے گزارے تھے کیونکہ ان کا سیل فون بھی مسلسل بند تھا۔

وہ جیسے ہی اپنی گاڑی سے اُتری، ہوا کے رخ جھونکے اس کے چہرے کے ساتھ ٹکرائے، زرد پتوں کو اپنے پیروں سے پکالتی وہ اپنے آفس کی طرف بڑھ رہی تھی، ایک چھوٹی سی منڈ پر پر بھی ہوئی اتنا بیہ نے حسرت بھری نگاہوں سے مناہل کی طرف دیکھا۔ وہ آج برہان کے ساتھ ہی یونیورسٹی آئی تھی اور اس وقت اپنی دوست کرن کے انتظار میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔

بلاشبہ اتنا بیہ اس سے کہیں زیادہ حسین تھی اور اس کے باوجود برہان کی نظریں مناہل قمریشی کے چہرے کا طواف کرتی رہتیں، تب اتنا بیہ کو احساس ہوا کہ محبت جسمانی ساخت اور حلیے سے بے نیاز ہوتی ہے۔

مناہل نے جیسے ہی ڈیپارٹمنٹ میں قدم رکھا، کلاس کے رومزم کے سامنے کھڑے برہان کو دیکھ کر اس کا دل بغاوت کر گیا، وہ کچھ لمحوں کے لیے رکی اور اندر جھانک کر دیکھا، کئی اسٹوڈنٹس کی نظریں اس پر اٹھیں اور وہ ہلکی سی خفت کا شکار ہو کر تیزی سے اپنے آفس کی طرف چل پڑی۔ اپنی اس بے وقوفی پر اس نے خود کو دل ہی دل میں لڑا۔

”میم! تھوڑی دیر پہلے آپ کا یہ کوریئر آیا ہے.....“ چہرہ اسی نے ایک خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔
وہ لفافہ لیے اپنے چھوٹے سے آفس میں لئی، وال کلاک کی طرف دیکھا، اس کی کلاس میں دو گھنٹے کا وقفہ تھا اور وہ اسی ڈیپارٹمنٹ میں وزیٹنگ سکچرار تھی، اور اپنے ٹھیس کے ساتھ ساتھ فرسٹ اور سیکنڈ سسٹر کی کلاسز بھی لیتی تھی۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی احتیاط سے وہ لفافہ کھولا تو اندر سے ایک نفیس ساسلور گرے کلر کا شادی کارڈ نکلا،

مناہل نے بڑی خوش گوار حیرت کے ساتھ وہ دعوت نامہ پڑا، وہ سمجھی تھی کہ شاید کسی فرینڈ یا کلاس فیلو کی طرف سے سر براز ہوگا لیکن کارڈ کھولتے ہی جن ناموں پر اس کی نظر پڑی، ایک لمحے کو اسے حجت اپنے اوپر گر گئی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ رنگ کے دائرے نے اپنے لگے اور دل تو گویا سینے کی پسلیوں توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ قسمت نے اس کے ساتھ کیسا ہولناک مذاق کیا تھا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے گہرا کر کارڈ میز پر رکھا۔ جیسے اس کے اندر کوئی آتش فشاں چھپا ہوا ہو۔ اس نے لمبے لمبے سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔

اس کے بعد اس نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے سامنے میز پر رکھے کارڈ کو دیکھا جہاں ”میم برہان محتشم“ کے نام کے آگے لکھا ”اتنا بیہ خاقان“ کا نام اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گئی تھی کہ یہ اتنا بیہ کون ہے لیکن ابھی اس کا دل و دماغ اس کا حقیقت کو ماننے سے انکاری تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ)

دکانِ دیکے

موسم کی رعنائی اپنے عروج پہ تھی، سرما کی پہلی بارش برسنے کو بے تاب تھی، گہرے بادلوں نے سورج کو اپنی آغوش میں چھپایا تو موسمِ ابر آلود ہو گیا، درخت ہوا سے جھومنے لگے۔ ٹھیلے والوں نے گھر کی راہ لی۔ جب کہ چند دکانوں کے ستونوں تلے جا کھڑے ہوئے، لوگوں نے کچھا کچھ بھرا بازار خالی ہونے لگا۔

گلابی لمبی قمیص اور کالی جینز میں لمبوس افشاں آفس میں بیٹھی گلاس دندو سے نظر آئی افراتفری دیکھنے میں لگن تھی، وہ نہایت خوب صورت لڑکی تھی، اس کے چہرے پہ سب سے زیادہ نمایاں اس کی خوب صورت کالی سیاہ آنکھیں تھیں۔ آفس کی دیواروں پہ بھی خوب صورت تصاویر کو دیکھنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ آفس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا ہے۔

چند تصاویر کے ساتھ لگی ایک تصویر نہایت ہی خوب صورت تھی، کافی ماڈرن ٹائپ انداز کی۔

افشاں اس تصویر کو دیکھتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے ذرا قریب ہوئی۔

خوب صورت مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

اس تصویر میں افشاں خوب صورت اور کاہلار براڈ ویل ساڑھی زیب تن کیے کسی مغرور ملکہ کی طرح کرسی پہ بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں جھپکتے خوابوں کے جگنو اور بوٹوں پہ چلتی۔ کچھ بن جانے کی مسکراہٹ تصویر میں بھی اس کے چہرے سے عیاں تھی، جو دیکھنے والے کو حیر میں جکڑ لیتی۔

”یہ آفتاب عیسیٰ بھی نا۔۔۔۔۔ مجھے ابھی تک نہیں بھول پایا، یقیناً محبت ابھی باقی ہے۔“ اپنی تصویر کو دیکھتے

”افشاں۔۔۔۔۔“

یقیناً۔۔۔ وہ سوچوں میں ابھی سانس روکے کھڑی رہی۔
آنے والا دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آن کھڑا ہوا، اس کے لباس سے اٹھتی پرفیوم کی دلفریب مہک افشاں کی سانسوں میں اترنے لگی۔
”مجھے یقین تھا کہ تم ایک دن ضرور آؤ گی کیونکہ

آنے والے نے نرمی سے اس کا نام پکارا جو سیدھا اس کے دل پہ لگا، لیکن وہ بت بنی اس کی جانب پشت کیے کھڑی رہی۔
کیسے سامنا کروں میں اس کا، جو کبھی میرا محسن تھا اور شاید آج بھی۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ شاید نہیں بلکہ



زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا موڑ لازمی آتا ہے جب ہم اپنی نئی چاہتوں سے اکتا کر پرانی چاہتوں میں لوٹنا چاہتے ہیں۔“

وہ نرم لہجے میں پُر اعتماد طریقے سے بات کرتا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بہت صاف گو تھا، اتنا صاف گو کہ ایسا سچ بولتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتا تھا جس سے سامنے والا شرمندہ ہو جائے۔

نئی چاہتوں والا فقرہ افشاں کے دل میں تیرکی مانند چھا اس نے تڑپ کے سامنے کھڑے مرد کو پلٹیں اٹھا کر اٹھ سالوں بعد دیکھا، وقت گزرنے کے ساتھ وہ اور زیادہ وجہ بہ ہو گیا تھا۔

نیلی ٹی شرٹ اور سفید جینز میں ملبوس کھڑا یہ شخص اس کے دل کے قریب تر تھا۔ خوب صورت گندی صاف رنگت اور چہرے پر چمکتی بادامی ذہن آنکھیں اس پر لگائے اپنی بات مکمل کر کے اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو، وہ اپسر اس کے سامنے موجود تھی، جس کی واپسی کی اس نے نہ جانے کتنی دعائیں مانگی تھیں۔

”محبت ایک ہی سے ہوتی ہے، باقی سب لوگ مجبوری بن جاتے ہیں جن کے ساتھ رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بالکل ان مسافروں کی طرح جو وقت گزراؤں کے لیے ایک دوسرے کا سہارا بن جاتے ہیں، اور منزل قریب آنے پر خوشی سے الگ بھی ہو جاتے ہیں۔“

افشاں نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی اور اس کی نگاہ سے گھبرا کے ایک بار پھر سے نظر گلاس وندو سے جھلکتے کھلے آسمان پر ڈالنی چاہی لیکن بارش کے قطروں نے کھڑکی کے شیشے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا جس سے کھڑکی کے پار کا منظر دھندلا گیا تھا۔ بارش اب بھی پوری رفتار سے جاری تھی۔

”کیا ہوتا اگر تم ہمیشہ قائم رہنے والی محبت کا ہاتھ تھام لیتیں اور وقت گزاری نہ کرتیں۔“ وہ دل ہی دل میں افشاں سے مخاطب ہوا اور غور سے اسے

دیکھنے لگا۔

آفتاب عباسی کو افشاں کا کافی افسردہ سی لگی کیونکہ وہی تھا جو اس کا اندر کا حال جان لیتا تھا، اس نے ماحول پر چھائی اداسی ختم کرنی چاہی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے خوش گوار انداز میں کہا۔

”تمہیں چائے بہت پسند تھی نا؟ میں ابھی تمہارے لیے چائے منگوا رہا ہوں۔“

وہ انٹرکام دبائے چائے منگوانے لگا۔ وہ مسکرا کے ست قدموں سے چلتی ہوئی کرسی پر آ بیٹھی۔ درمیان میں میز اور اس کے عین سامنے کرسی پر بیٹھا اسے دلچسپی سے دیکھتا آفتاب عباسی جبکہ میز کے ایک کونے پر موجود کمرشل گلدان میں ہمیشہ کی طرح سبز تازہ گلاب مہک رہے تھے۔ جن کو دیکھ کے افشاں کے دماغ میں سوچ ابھری، آفتاب عباسی کی پسند آج تک نہیں بدلی، کتنا مستقل مزاج ہے نا، اور ایک میں ہوں کہ سر تا پابدل گئی۔

آفتاب بھی اس پر سوچ لگاؤ ڈالے اسی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا کیا ہوا تھا کہ اس کو لوٹ کے آنا پڑا؟ وہ جاننے کے لیے تاب تھا، لیکن خاموش بیٹھا اس امید پر انتظار کر رہا تھا کہ شاید وہ خود ہی آنے کی وجہ بتا دے، کیونکہ فون پر افشاں نے صرف اتنا کہا تھا کہ تم سے ملنا چاہتی ہوں، کچھ بھی پوچھنے کے بجائے آفتاب نے اسے آفس کا ایڈریس لکھوا دیا تھا۔ اور حیران بھی تھا کہ ابھی تک افشاں نے اس کا نمبر محفوظ کر رکھا تھا۔

اب کسی نہ کسی کو تو خاموشی توڑنا تھی نا، بالآخر افشاں نے پہلی کی جو کہ پہلے بھی نہیں کرتی تھی۔

”آپ نے میری تصویر ابھی تک وال پر لگا رکھی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ مجھے بھولے نہیں، آپ کے دل میں ابھی تک میں زندہ ہوں۔“

وہ بات مکمل کر کے مسکرائی اور ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ سجائے آفتاب کو دیکھا جو اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا یا شاید سمجھ ہی گیا تھا۔

آفتاب کی آنکھوں میں ماضی گھوم گیا۔ اسے آج تک وہ دن یاد تھا جب افشاں ملے کیلے کپڑے پہننے اور ممکن چہرہ لیے اس کے آفس آئی تھی۔

”سر پلیز مجھے یہاں کوئی کام دلا دیں، میری ماں بہت بیمار ہے اس کا علاج کروانا ہے۔“

آفتاب عباسی نے اس کی جانب دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا، اسے ہیرے کی بیچان تھی، ویسے بھی وہ ایک کمرشل کے لیے نئے چہرے کی تلاش میں تھا اور اسے دیکھنے کے بعد تلاش ختم ہوئی دکھائی دی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، تمہیں کام مل گیا ہے اور یہ لو کچھ پیسے ایڈوانس۔ اپنی امی کا علاج کرواؤ۔“ قدرے حیرانگی اور خوشی سے دیکھتی افشاں نے اس کے ہاتھ سے پیسے تھامے اور بچوں کے سے انداز میں بولی۔

”سچی سرا مجھے آپ نے کام دے دیا؟ یا اللہ! مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا۔“ خوشی اس کے انگ انگ سے ٹپ رہی تھی۔

آفتاب کا وہ کمرشل جس میں افشاں نے ماڈلنگ کی تھی ٹاپ لسٹ میں آیا تھا، اچھے لباس اور کام کی وجہ سے افشاں پر ٹوٹ کے نکلا رانے لگا۔ اسی دوران اس کی ماں کی وفات ہوئی تو آفتاب ہی اسے سنبھالنے والا تھا۔

”میں اکیلی نہیں جی سکتی آفتاب! مجھے ڈر لگتا ہے۔“ ماں کی وفات کے غم میں ڈوبی افشاں نے روتے ہوئے ہوئے کہا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب آفتاب کو اپنے دل میں اس کے لیے محبت محسوس ہوئی۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ آفتاب کی بات سن کر وہ اسے دیکھنے لگی اور انکار کر دیا۔

”میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں، آگے بڑھنا چاہتی ہوں، آپ کو صرف دوست سمجھتی ہوں اور کچھ نہیں۔“ آفتاب اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔

پھر افشاں کو ہر جگہ کام ملنے لگا، اس کے کئی اسکینڈل بنے۔ آفتاب نے سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھی، اس کے لیے تو عزت سے بڑھ کر پیسہ اہم تھا، تب

آفتاب دکھ سے ٹوٹ گیا جب افشاں نے بنا اسے بتائے ایک بوڑھے بزنس مین سے شاوی کر لی جو کہ عیاش مشہور تھا۔

”تمہیں جب بھی ضرورت پڑے تو لوٹ کے میرے پاس آنا، میرے دل کے دروازے کھلے رہیں گے۔“ افشاں سے آخری بات کہتے ہوئے وہ پلٹ آیا تھا، لیکن اسے کبھی بھلا نہ سکا۔

”میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ افشاں کی آواز ساعتوں سے لگرائی تو وہ ماضی سے نکل کے حال میں آیا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

”تمہاری تصویر آج تک وال پر اس لیے لگا رکھی ہے کہ دل میں بسنے والے کی نسبت چھوڑ کے جانے والے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، جب وہ نہیں دکھائی نہ دیں اور ان کی تصویر ذہن میں دھندلی پڑنے لگے تو مجبوری کے طور پر ان کی تصویر دیوار پر ٹانگ دیتے ہیں۔“

وہ شگوہ بھری نگاہ اس پر ڈالے چائے کے گھونٹ لینے لگا۔

وہ شرمندگی سے سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی، سچ ہی تو کہہ رہا ہے آفتاب، میں چھوڑ ہی تو گئی تھی، وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

”چائے پیو، ٹھنڈی ہو رہی ہے اور تمہارا شوہر کیسا ہے؟ سچے ہوئے کر نہیں؟“

اس کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے آفتاب نے پوچھا تو اس کے چہرے پر وہ دکھ کا سایا سا لہرایا جس کو آفتاب نے محسوس بھی کر لیا۔

وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ممکن لہجے میں بولی۔

”وہ شوہر کم اور زندہ زیادہ تھا، شکی طبیعت کی بنا پر مجھ پر پابندیاں لگا دیں۔ بس اس نے مرتے وقت ایک احسان کیا مجھ پر کہ اپنی جائداد میں کچھ حصہ میرے نام کر گیا اور مجھے پھر سے آزادی مل گئی، لیکن میں تنہا نہیں رہ سکتی، مجھے اب احساس ہو گیا ہے کہ تم واقعی محبت کرتے تھے مجھ سے لیکن میں ہی بری تھی۔“

آنسو قطرہ قطرہ افشاں کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ بارش اب رک چکی تھی لیکن افشاں کی آنکھوں سے برقی



شمینہ فرحان

کچھ اقبالی کا لکھ

سے اخبار چھپتے ہوئے میں نے مزید تصدیق چاہی۔
”جاؤ، اماں سے خود پوچھ لو بلکہ یہ اخبار مجھے دو
اور جا کے اماں کا شکریہ ادا کرو۔“
”لیں اب اس میں شکریہ ادا کرنے والی کون سی
بات ہے۔“ میں حیرت سے بولی۔
”بھئی اماں خوش ہو جائیں گی۔“ انہوں نے
جیسے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

”سنو میں نے اماں سے وہ جاب والی بات
کر لی۔“ اخبار کو فولڈ کر کے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے
ہوئے اصرار نے مجھے مخاطب کیا۔
میں جو چائے کے خالی برتن سینے کمرے میں
آئی تھی اور ٹرے میں کپ گلاس اور شکر دان رکھتے
ہوئے یہاں وہاں کی چیزیں بھی سمیٹ رہی تھی۔
سب کچھ دہیں پہ چھوڑ چھاڑ کے بیڈ کے قریب پڑی
کر سی پے تنگ تھی۔
”کب کی آپ نے اماں سے بات؟ صبح سے تو
آپ اخبار میں سر دیے بیٹھے ہیں۔“ اپنی حد درجہ بے
چینی کے باوجود بھی میں طنز کرنا نہ بھولی تھی۔ ”اور کہا
کیا اماں نے؟“

میری بے تالی کے جواب میں انہوں نے اپنا
چشمہ بھی اتار کے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور اپنے
ناک کے اوپری حصے پہ چشمہ سے بننے والے نشان گو
عادتا سہلاتے ہوئے کہنے لگے۔
”کہہ رہی تھیں کہ تمہیں ضرورت تو نہیں ہے
نو کری کی اور ویسے بھی شایان ابھی بہت چھوٹا ہے۔“
”دیکھا!“ میں جھٹ سے بولی۔ ”اپنی بیٹی کو تو
ڈاکٹر بنا رہی ہیں اور میں کسی اسکول میں ٹیچر تک کی
نو کری نہیں کر سکتی۔“

”بھئی ایک تو تم پوری بات سنتی ہو نہیں اور
شروع ہو جاتی ہو۔“ اصرار نے جھلاتے ہوئے مجھے
چپ کرایا پھر ایک لمبے کوٹھڑ کر بولے ”جب میں نے
اماں کو بتایا کہ تمہیں عالیان بی کے اسکول میں نو کری
ملی ہے اور گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد شایان کا بھی
وہیں انٹرنیشن ہو جائے گا تو وہ بھی تمہارے ساتھ ہی
چلا جایا کرے گا تو انہوں نے کہا کہ جیسے تم لوگوں کی
مرسی۔“

”تو اماں کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے
بے یقینی سے اصرار کو دیکھا۔
”ہاں ظاہر ہے۔“ ڈھلے ڈھالے انداز میں
کہتے ہوئے انہوں نے دوبارہ اخبار اٹھانا چاہا۔
”آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“؟“ ان کے ہاتھ

اس کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔
”تمہارے چھوڑ جانے کے بعد میں ٹوٹ سا
گیا تھا، میرا بزنس فلاپ ہونے لگا۔ سارا دن بولا یا
بولا یا پھرتا رہتا۔ میری خالہ زاد کزن زویا میری
راز دار تھی، تب اس نے مجھے سہارا دیا اور بتایا کہ میں
تم سے محبت کرتی ہوں تب میں نے اسے اپنا لیا
کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا جو دکھ تم نے مجھے دیا تھا وہ
میں اس کو دوں، اس کے ساتھ بھی وہی ہو جو میرے
ساتھ ہوا اور آج تک اس نے مجھے تمہارے حوالے
سے کوئی طعنہ نہیں دیا، بہت بڑے دل کی ہے وہ۔“
اس کا ذکر کرتے ہوئے آفتاب کے لہجے میں
محبت در آئی۔

”میرا کیا ہوگا؟“ روتی ہوئی افشاں نے پھر
سے سوال کیا۔
”میرے دل میں تمہارے لیے محبت کے
بجائے عزت موجود ہے۔ بہتر یہ ہی ہے کہ تم کوئی اچھا
سا انسان ڈھونڈ کے پھر سے شادی کر لو۔“ یہ کہہ کر وہ
موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھائے اٹھ کھڑا ہوا۔
وہ بھی واپس جانے کے لیے خاموشی سے آفس
سے باہر نکل گئی مزید کوئی بھی بات یا سوال کیے اور وہ
اسے جاتا دیکھتا رہا۔
زندگی کے اس سفر میں افشاں کے ہاتھ کچھ نہیں
آیا تھا، خالی کھر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ویران درختے
اس کی راہ تک رہے تھے، وہ خزاں رسیدہ پتے کی
مانند اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔

ایک خاموشی تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں
لے رکھا تھا۔
جبکہ آفتاب تنہا نہیں تھا، ایک اچھے فیصلے نے اس
کی زندگی خوشیوں سے بھر دی تھی لیکن اندر سے وہ بھی
افشاں کے لیے افسردہ تھا۔ سچی وہ بھی تو اس کے دل میں
بستی تھی، اس نے دل سے افشاں کے لیے خوشیوں
کی دعا مانگی اور گھر کی جانب جانے والی سڑک پہ گاڑی
موڑ لی جہاں پہ اس کی دفا شعار بیوی اور بیٹی کھانے پہ
اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ☆☆

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، اس کی حالت
جان کے آفتاب عیاسی بھی بے چین ہو گیا اور ایک
ہمدرد اور نرم نگاہ اس پہ ڈالی۔
”بہت دکھ ہوا جان کے، میں نے تمہیں سمجھایا
تھا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔“
وہ بے یقینی سے افشاں کی جانب دیکھتے ہوئے
بولا اور چائے کا آدھا کپ بنائے ہی چھوڑ دیا۔
”یاد ہے آپ نے کہا تھا کہ میرے دل کے
دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے تم جب جاؤ۔“ افشاں
کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی آفتاب کا موبائل بج اٹھا،
اسکرین پہ چمکتے نمبر کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ مسکراہٹ
اُبھر آئی، اس نے جلدی سے کال لی۔
”جی جناب، خیریت؟“ افشاں نے غور کیا کہ
آفتاب کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا، جیسے وہ کسی
خاص کی کال ہو،
کچھ دیر آفتاب مسکرا کے فون کرنے والی کی
بات سن رہا پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔
”کیوں پریشان ہوتی ہو؟ بس آرہا ہوں، پھر
مل کر ہی کھانا کھاتے ہیں۔“
یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور قدرے خوش
گوار انداز میں افشاں کی جانب دیکھا جو شاکی
نظر سے اس کی بیٹھی تھی۔
”ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟“ وہ اس کی جانب
متوجہ ہوا۔
”کال کس کی تھی؟“ افشاں نے ڈرتے ڈرتے
پوچھا۔
میری بیوی کی تھی، شادی کر لی ہے میں نے۔
ماشاء اللہ سے ایک بیٹی کا باپ بھی ہوں۔“ آفتاب
نے اس پہ ہم چھوڑا۔
افشاں کی حالت ایسی تھی کہ کاتو تو بدن میں لہو
نہیں۔ وہ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے
ٹوٹے لہجے میں بولی۔
”لیکن آ..... آفتاب..... تم..... تم نے تو کہا تھا
کہ میں ہمیشہ تمہارا انتظار کروں گا..... پھر اب.....“

”ہاں تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ جیسے میں ان کے حکم کی غلام ہوں۔“ میں فٹ سے بولی۔
”ارے تو ہفتہ بھر سے جان کیوں انکی ہوئی تھی تمہاری.....؟“ میرے خیالات پہ انہیں قہقہہ ہوا۔
”وہ تو ویسے ہی۔“ میں نے چائے کے خالی برتن ٹرے میں اکٹھے کیے۔ ”اماں انکار کر دیتیں تو مسئلہ ہو جاتا نا!“

”چلو خیر، اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے نا؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا اور میرے چہرے پہ پھوٹی طمانیت ان کو جواب دے گئی۔
”آپ کو کچھ اور تو نہیں چاہیے؟“ میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

”آں نہیں..... پر اماں سے پوچھ لینا۔ وہ اس وقت دوبارہ چائے پیتی ہیں..... اور وہ کچھ لینا انہوں نے بلڈ پریشر کی دوائی لے لی ہے..... کل بھی بھول گئی تھیں۔“

”جی وہ میں دیکھ لیتی ہوں۔“ میں سرورسی کمرے سے نکل آئی۔

رات کو فون پہ ساری روداد میں نے اپنی چھوٹی بہن ندا کو سنائی۔ وہ لاہور میں رہتی تھی لیکن موبائل فون کے نیٹ سے ٹیکسٹر کی وجہ سے تقریباً روز ہی بات ہو جایا کرتی تھی۔

”ویسے تمہاری ساس ہیں ابھی۔ میری جی جی، تو کبھی اتنے آرام سے نوکری کرنے کی اجازت نہ دیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں خوشی سے چبکی۔ ”ویسے احمد تو کہہ رہے تھے کہ مجھے اماں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے شکریہ دکر یہ کرنے کی۔“ ندا ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”ارے کوئی جائیداد کیا تمہارے نام کر دی ہے انہوں نے جو تم شکریہ ادا کرنے چلی ہو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اتنا سر پہ چڑھانے کی۔“

”وہی تو!“ میں جھٹ سے بولی۔ ”میں نے تو

احمر سے کہہ دیا۔ کیا میں ان کے حکم کی غلام ہوں.....“
”بہت اچھا کیا۔“ ندا نے داد دی۔ ”سسرال والوں کو ویسے بھی ذرا قافلے پر ہی رکھنا چاہیے..... اور سنو عائشہ وہ جو تمہاری ساس صاحبہ تھیں مشورہ دے رہی ہیں تاکہ تم اپنی بڑی نند کے شادی سے پہلے کے کپڑوں کو اپنے سائز کے مطابق کر لو اسکول پہننے کے کام آئیں گے اس پر نہ کہیں عمل کر لیا!“

”کیوں یار؟“ میں نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ”اچھے سوٹ ہیں کچھ تو بالکل نئے ہیں۔ ابھی تین مہینے ہی تو ہوئے ہیں اس کی شادی کو اور چھوٹی نند باہن کا تو تمہیں پتا ہے۔ اسے تو اپنی پڑھائی کے علاوہ کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ اس نے تو کسی ایک سوٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور ویسے بھی اسے تو بہت ڈھیلے ہوں گے۔“

”دیکھو..... وہ ان کی چھوٹی بیٹی پہنے یادہ کسی ماسی کو دیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے..... تمہیں کیا کمی ہے کپڑوں کی۔ ارے ایک سے ایک برانڈ کے کپڑے مل رہے ہیں بازار میں اور اب جبکہ تم خود کماد گی تو اپنے اوپر دل کھول کے لگاؤ بھی..... آٹھ دس لان کے نئے خوب صورت سے سوٹ بناؤ تمہیں کیا ضرورت ہے کسی کی اترن پہننے کی۔“

ندا نے روانی سے مشورے سے نوازا اور فون بند کرنے تک لان کے خوب صورت رنگوں سے مزین دلفریب ڈیزائنوں سے آراستہ خوب صورت نئے جوڑے آنکھوں کے آگے منڈلاتے دل کو قائل کر چکے تھے۔

چوٹھی اور پانچویں جماعت کو اردو پڑھانا کوئی خاص مشکل کام نہ تھا اور مجھ سے زیادہ تو عالیان خوش تھا کہ اس کی تو کلاس ٹیچر بھی میں ہی تھی! اسکول کا اسٹاف میری امیدوں سے بڑھ کر پر خلوص اور ملنسار ثابت ہوا۔ چند ہی دنوں میں سب ٹیچرز سے میں مکمل مل گئی خاص طور پہ شازیہ سے تو میری ابھی خاصی دوستی ہو گئی۔ وہ پانچویں کلاس کی اسلامیات کی ٹیچر بھی اور اسے اپنے سبیکٹ پر عبور حاصل تھا وہ اکثر ہی

موبائل پر قرآن پاک کی تفسیر کے ٹیکسٹ کی نظر آتی بلکہ مجھے بھی فارورڈ کر دیا کرتی، دل تو میرا بھی کرتا تھا کہ میں بھی باقاعدگی سے قرآن کی تفسیر کی کلاس لوں پر گھر کے کاموں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی بس بھی بھار شازیہ کا موبائل پر بھیجا ہوا کوئی ٹیکسٹ لیا کرتی۔

آج چھٹی کا دن تھا..... ناشتہ پہنچو! اہتمام کیا تھا تو سینے سینے دیر ہو گئی تھی، میں برتن دھوتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ عالیان کو ہوم ورک کروا کے ندا کو فون کروں گی۔ جب سے اسکول جو ان کیا تھا ان دو ڈھائی مہینوں میں مصروفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ندا سے کہیں لگانے کا تاہم ہی نہ ملتا تھا۔ جلدی جلدی عالیان کو ہوم ورک کا سمجھا کے میں نے ندا کو فون ملا یا، آج بہت دنوں بعد ندا سے بات ہو رہی تھی۔

”تو تمہاری ساس نے کھانا پکانے والی کو کیوں نکال دیا؟ اب دیکھو نا..... کھانا پکانے کی ساری ذمہ داری تمہارے کندھوں پہ آن پڑی..... ان کو کیا تکلیف تھی اس سے بس چاہتی ہوں گی کہ تم اسکول سے ٹیکسٹ ہاری آؤ اور آتے ہی گھر کے کاموں میں جُت جاؤ۔“

”نہیں یار!“ میں بیڈ پہ آرام دہ پوزیشن میں بیٹھے ہوئے بولی۔ ”دو پہر کاساں تو اماں ہی پکاتی ہیں جو اکثر رات میں بھی کام آ جاتا ہے۔ میں تو بس رات کا ہی کھانا بناتی ہوں وہ بھی اکثر اماں ہی سبزی کاٹ دیتی ہیں۔“

”بس رہنے ہی دو، یہ سب ان ساسوں کے بہوؤں کو تنگ کرنے کے طریقے ہیں تاکہ میاں تو کبھی تمہاری قدر ہی نہ کر سکے بلکہ اپنی اماں کا ہی ہمدرد بنا رہے کہ اس عمر میں سارا گھر خود سنبھالا ہوا ہے۔ بیوی تو صبح سویرے گھر سے نکل جاتی ہے..... وہ کھانا پکانے والی جیسا تیسرا کوروی بھی نا..... کام تو چل رہا تھا نا تمہارا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی اماں جان کا احسان لینے کی۔“ ندا نے سنسنی سے کہا۔

”ویسے انہوں نے بھی احسان جتایا تو نہیں۔“ میں نے خیالوں میں اپنی ساس کا کوئی طنزیہ جملہ

ڈھونڈنے کی کوشش کی۔
”تم تو ہو ہی بدھو۔“ موبائل سے آتی ندا کی جلی کئی آواز میرا دل ہی جلا گئی۔

آپ سے چار سال چھوٹی بہن جب آپ کے منہ پہ آپ کو بدھو کہتے تو دل پہ کیا گزرتی ہے یہ تو وہ ہی جان سکتا ہے جس کی چھوٹی بہن ندا کی طرح پٹا نہ ہو یا وہ میری طرح بدھو ہو۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ میرے کچھ نہ بولنے پہ ندا کی آواز آئی۔
”اُں ہاں کچھ نہیں!“ میرے منہ سے بس یہ ہی نکلا۔

”اور سنو عائشہ!“ ندا سابقہ جوش سے پھر شروع ہوئی۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے ماہین کو کپڑے سی کی کر دینے کی۔“ اس نے رعب جھاڑا۔
”لو میں کب سی کی کر دے رہی ہوں۔“ میری مری مری سی آواز نکلی۔

”وہ تو وہی سوٹ ہیں نا جو شرمین کے شادی سے پہلے کے تھے۔ ان میں سے ایک سوٹ ماہین کو کالج کے فنکشن میں پہننا تھا۔ درزی تو پورے سوٹ کی سلائی کے پیسے لے رہا تھا تو میں نے کہا کہ میں سلائیوں لگا کے اس کے سائز کے مطابق کر دوں گی۔“

”ہاں تم تو جیسے فارغ بیٹھی ہو نا!“ ندا کو جیسے غصہ آیا۔

”نہیں یار! پورا سوٹ تقریباً دو گھنٹے میں اس کے ناپ کے مطابق ہوا۔ دو دفعہ تو جج میں بجلی چلی گئی۔ گرمی نے الگ حشر کر دیا۔“ میں نے اپنی پٹا سنائی۔

”غضب خدا کا! یہ تمہارے سسرال والے بھی نا! اتنی مہنگی میڈیکل کی تعلیم دلواسکتے ہیں اپنی لاڈلی کو پردرزی کو پیسے دیتے ہوئے جان جاتی ہے ان کی۔“
”اور کیا؟“ میں نے بھی منہ بنایا۔ ”میں کون سا فارغ بیٹھی ہوں..... ابھی تو ماہین نے دو اور قمیصوں کا بھی کہا ہوا ہے کہ بھابھی ان کو بھی میرے ناپ کے

مطابق کر دیں، ہند کب سے سوچ رہی ہوں کہ قرآن کی تفسیر کی کلاس لوں پر فرصت ملے تب نا..... عدا کی کال مجھے دل کے پھپھو لے ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھوڑنے کا بھرپور موقع فراہم کیا کرتی۔

”سچ کہہ رہی ہو عاشری.....!“ عدا نے سرد آہ بھرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”بندہ فارغ ہو تو کوئی اللہ رسول کا بھی نام لے اب اس گرمی میں قمیض ٹائیٹ کر کر کے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا تمہیں۔“

”چھانیر، میری دیورانی کی سنو۔“ عدا کو جیسے کوئی اچانک بات یاد آئی اور ایسا اکثر ہی ہوتا تھا۔ ندا کی باتوں کی چٹاری میں ایک سے ایک پناہہ کسی دلچسپ اور سنسنی خیز واقعہ کی صورت میں موجود رہتا۔ ”ہمارے محلے میں ایک بیوی پارل کھلا ہے۔“ ندانے مزہ لیتے ہوئے سنا شروع کیا۔ ”ان محترمہ کو بھی شوق چرایا کہ وہ بھی طبع آزمائی کریں، فرمانے لگیں۔“ عدا دیورانی کی نقل اتارتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بھابی..... اگر آپ سعد کو سنبھال لیں تو میں بھی بیوی پارل کر کورس کروں..... اور سنو کوئی ایک نہ دو پورے مین مینے کا کورس..... بھلا تیار..... کوئی آسان ہے دوسال کے بچے کو سنبھالنا!“

”تو تم نے صاف انکار کر دیا؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”میں کوئی تمہاری طرح پاگل ہوں.....“ ندانے مجھے چٹایا۔

”تو پھر.....؟“ مجھے تعجب ہوا۔

”بھئی..... میں نے طریقے سے بات بنائی..... میں نے کہا کہ تمہیں کیا ضرورت ہے کورس کرنے کی، تمہیں کون سا چار پارل چلانا ہے الٹا خاندان کی بر تقریب میں ساری خواتین تمہارے ہی سر ہو جایا کریں گی کہ ہمارا میک اپ کر دو..... بیوی پارل کا کورس تو خیر کیا ہی کرنا ہے..... میں نے تو ایسا خوفناک نقشہ کھینچا کہ وہ الٹا میری ہی ممنون ہوئی کہ بھابی آپ نے سچ وقت پہنچ مشورہ دے دیا۔“

”ہیں.....!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”تو اور کیا.....!“ عدا اتر کے بولی۔ ”کسی بات کو منع کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے کوئی لٹھ مار کے تو نہیں کسی کو انکار کیا جاتا اور جب کام بیٹھا بن کے نکل رہا ہو تو کڑوا بننے کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی ہمارے دل میں تو نہیں چھپا بیٹھا کہ جان لے کہ یہ بات کس لیے کی جا رہی ہے۔“

”جا ہے کسی کا نقصان ہی ہو جائے۔“ میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”ہاں، تمہیں تو جیسے بڑا فائدہ ہو گیا..... اب اگر تم اپنی ہند کو پیار سے سمجھاتیں کہ چند ہی تمہاری آنی کے کپڑے تو پرانے فیشن کے ہیں۔ تم اپنے کالج فنکشن کے لیے کوئی اچھا سا سوٹ لے لو کسی بوتیک سے..... تو تمہیں تو گرمی میں خوار نہیں ہو یا پڑنا۔“

”کہاں کی بات عدا کہاں ملا رہی تھی اور میری سوئی ابھی تک اس کی دیورانی ہی ابھی ہوئی تھی۔ عدا کے دیور کی اتنی اچھی آمدنی والی نوکری نہ تھی..... ایسے مین شاید وہ اپنے گھر کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کچھ کرنا چاہ رہی ہو، میں سوچے گی۔“

”چلو، تم اس کا بچہ نہ سنبھالتیں۔ پر اسے کورس تو کرنے دیتیں۔“ مجھے ندا کی چالاکی ایک آنکھ نہ بھائی۔

”جی نہیں! خام خیالی ہے آپ کی، وہ میرے ہی سر آ نکلتا۔ بھئی میرے صبح ہزاروں کام دھندے ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا بچہ سنبھال کے کتنے نفلوں کا ثواب ملتا اور بھئی جی بات ہے اتنا فارغ نام نہیں ہے کسی کے پاس۔“ ندانے تو جیسے بات ہی ختم کر دی۔

”عسیر کا لپچر سننے لگی جس میں کوئی عالم دین قرآن کو سمجھنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کر رہے تھے۔ میں ہینڈ فری لگائے انہماک سے لپچر سن رہی تھی جب آخر نے مجھے ذکیہ چیچی کی آمد کے بارے میں بتایا۔ ذکیہ چیچی ہمارے ہی علاقے میں رہتی تھیں اور گھر قریب ہونے کی وجہ سے اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا!

میں چائے کی ٹرے لے کر رے کی طرف جا رہی تھی اماں کے کمرے کی کھڑکی باہر برآمدے میں کھلتی تھی میں ذرا رک کر اپنا دھوپا ٹھیک کرنے لگی تب ہی ذکیہ چیچی کی آواز میرے کانوں سے نکل گئی۔

”تو تم عاشرہ سے کہو نا کہ اگر اتنا ہی نوکری کرنے کا شوق ہے تو صبح جلدی اٹھ کے کھانا پکا کے جایا کرے۔“

”لو، اب وہ صبح اٹھ کے کیا کیا کرے؟ بچوں کو تیار کرے۔ ناشتہ بنائے کہ دوپہر کا کھانا بنائے۔“

”یہ خوب کہی تم نے..... اس کو تو نوکرائی مل گئی مفت کی۔“

”ارے نہیں ذکیہ! اس نے تو کھانا پکانے کے لیے ملازمہ کا بندوبست کیا تھا پر وہ ایسا بد مزہ سالن بناتی تھی کہ کیا تباؤں میں نے خود ہی کہا۔ اس سے اچھا تو میں پکالیا کروں گی۔“

”تو تم نے تو خود اپنے پیروں پہ کلبازی مار لی اس کے تو عیش ہو گئے۔“ ذکیہ چیچی کا طنزیہ جملے میرا دل دکھا گیا۔

”ارے عاشری بے چاری بھی سارا دن لگی ہی رہتی ہے۔ دوپہر کے کھانے کے برتن دھونا، کچن کا پھیلا واسمیٹنا، ماس سے صفائی کر دانا، بچوں کو پڑھانا۔ رات کا کھانا بنانا اسے سکون کہاں ملتا ہے۔“

اماں کا سادہ سا..... ریاسے پاک، جھوٹ سے مبرا لہجہ جیسے دکھے دل پہ بچانے کی طرح محسوس ہوا..... ذکیہ چیچی منہ پہ کتنا پیار جتاتی ہیں..... چہرے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ لہجہ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ میں سوچنے لگی۔

”تو اس سے کہو کہ نوکری چھوڑ کے اپنا گھر سنبھالے ادھر بھلا جتاؤ تمہیں اس عمر میں ہینڈ یارڈی کر کے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا۔“ ذکیہ چیچی کہاں چپ رہنے والی تھیں۔

”شاید مل ہی جائے!“ اماں کی کسی گمان میں ڈوبی آواز مجھے سنائی دی اور نجانے یہ اور اک کا..... آگئی کا کون سا لٹھ تھا! میرے کانوں میں چند لمحوں پہلے سنے ہوئے لپچر کے الفاظ گونجنے جس میں عالم دین کسی ایک آیت کو سمجھنے کے ثواب کے بارے میں بتا رہے تھے..... اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے کام آنے، ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی جگہ جگہ تلقین کی ہے۔“

”بھابی! اس میں میری بھی چائے ہے؟“

ماہین میرے سر پہ کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”آں..... نہیں۔“ میں جیسے ہوش میں آئی۔

”تم یہ ٹرے اندر لے جاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بنا دوں گی ہوں..... اور سنو مائی! تم نے جو قمیض ٹھیک کرانی ہے وہ بھی نکال دینا۔ میں ٹھیک کر دوں گی۔“

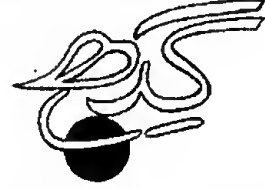
”ٹھیک پو سوچ بھابی..... وہ خوشی سے چبکی۔“ اچھا بھابی! آپ یہ چائے اندر لے جائیں۔ میں اسے اور آپ کے لیے بھی چائے بنا کر لائی ہوں سب مل کر پیئیں گے۔“

”یہ مجھے شامل کیے بغیر کون سی سازشیں ہو رہی ہیں؟“ آخر جو ابھی اپنی اپنے کمرے سے نکلے تھے ہمارے قریب آتے ہوئے کہنے لگے۔

”بس یہ ہمارا سیکریٹ ہے آپ کو کیوں بتائیں۔“ ماہین کچن کی طرف جاتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی جس پر آخر مصنوعی خنکی سے گھوڑنے لگے۔

”چلو مائی! تم ان کی بھی چائے بنا دینا! کیا یاد کریں گے۔“

”بھابی! میں دودھ اور پتی کی چائے بناتی ہوں۔ انسانوں کی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے ماہین جھپاک سے کچن میں گھس گئی..... اور اس کی بات پہ ہم دونوں بے اختیار ہنس دیے۔



”زیبہ! استری کے لیے کپڑے ہی دے دو، کب سے آواز دے رہی ہوں۔“ شہر بانو جب دور سے آوازیں دے دے کر تھک گئی تو قریب آ کر جھنجھلا کے بولی۔

”یار! میرا شادی میں جانے کا موڈ نہیں، تم ایسا کرنا کسی بچے کے ہاتھ جیکے سے برائی کی پلٹ مجھے بھیج دینا۔ میں دروازہ کھلا رکھوں گی۔“ زیبہ نے کمال لاپرواہی سے کہتے ہوئے نظریں اسکرین پر ہی جمائے رکھیں۔ وہ بہت انہماک سے ایل ای ڈی اسکرین پر نیشنل جوگرافک چینل دیکھ رہی تھی۔

”میں اتنی فضول حرکت نہیں کروں گی، بہتر ہے کہ تم اٹھ کر مجھے کپڑے نکال کر دے دو جو مجھے پہننے ہیں تاکہ میں استری کر دوں پھر لائٹ چلی گئی تو بیٹی روٹی رہنا۔“ شہر بانو نے اسے ٹوڈ شیڈنگ کا ڈراوا دیا مگر اس کے انہماک میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

گدھوں کا چھنڈ کسی مردار جانور پر پل پڑا تھا اور ان کی تعداد اتنی تھی کہ جانور چھپ سا گیا تھا۔ بس ان گدھوں کے گھنے سر اور مڑی ہوئی چونچیں نظر آ رہی تھیں جن میں مردار کی بوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔

”استغفر اللہ! کیا فضولیات دیکھ رہی ہو، لیکن نہیں آ رہی تمہیں؟“ شہر بانو نے منہ پر ہاتھ رکھ کر آتی ایکائی کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گردن بھی گھمائی۔

”شہر بانو! یہ گدھ ابھی دنیا میں ہیں یا ڈانسوسار کی طرح ناپاب ہو گئے؟“ شہر بانو کی باتوں سے قطع نظر اس نے سوال کیا

تھا کہ شہر بانو کو ہر طرح کی معلومات سے خاصا لگاؤ تھا اور اکثر وہ اسے سوال گوئل پر سرچ کرنے سے پہلے شہر بانو سے کر لیتی تھی اور جواب بھی مل جاتے تھے۔

”چند ماہ ہوئے خبر سنی تھی کہ ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ جھانگ مانگا میں گدھوں کی افزائش نسل کر رہا ہے۔ نوے کی دہائی میں پاکستان، ہندوستان اور نیپال سے گدھ غائب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ حال ہی میں ایک گدھ کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے ہیں اور یقیناً ان

پر حکمہ جنگلات داری صدفے ہو رہا ہوگا تاکہ ان کا وجود رہے تاکہ گدھ سارے مردار چٹ کر جائیں گوکہ چیل، کونے بھی یہ کام بخوبی انجام دیتے ہیں لیکن گدھوں کی بات ہی الگ ہے۔“

شہر بانو انسائیکلو پیڈیا بی اے معلومات دے رہی تھی اور وہ نظریں اسکرین پر جمائے اسے سختی سر ہلا رہی تھی۔

”اب اٹھو اور مجھے کپڑے نکال کر دو جلدی۔“ شہر بانو زور دے کر جا چکی تھی۔

گدھوں نے جب آخری لقمہ بھی ہڑپ کر لیا تو اس کی نظریں بھی اسکرین سے نہیں ایل ای ڈی بند کر کے اس نے کمرے کی راہ لی تاکہ کپڑوں کے انتخاب کا کام انجام دیا جاسکے۔



اماں کے ساتھ وہ دونوں پنڈال میں پہنچیں تب تک بارات آ چکی تھی۔ شادی مٹی میں ہو رہی تھی اور بارات آنے کا شور اور چٹاخوں کی آوازیں وہ گھر میں



ہی سن چکی تھیں۔ مردانے کا الگ انتظام تھا اس لیے اب مردانے میں ہی تھے۔

ان کے گھر کے عین سامنے ہی ماہ نور کی شادی تھی۔ ماہ نور اور اس کی ماں ثانیہ چند سال سے ان کے محلے میں مقیم تھیں۔ ثانیہ کسی آفس میں جاب کرتی تھیں، صبح کی کئی شام کو آتی تھیں۔ ماہ نور بھی کالج کے لیے نکلتی اور واپس آتی نظر آتی تھی، بلا ضرورت انہیں آتے جاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

چوں کہ ان کے گھر کوئی مرد نہیں تھا اس لیے محلے والے انہیں عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کا بھی محلے میں کسی سے میل ملاپ نہیں تھا۔ زیبہ اور شہر بانو کی بھی ان پر گھر سامنے ہونے کی وجہ سے نظر پڑ جاتی تو بس ایک رکی سی مسکراہٹ کا تبادلہ ہوتا تھا

اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسے میں جب ماہ نور کی شادی کا کارڈ محلے والوں کی طرح انہیں ملا تو وہ سب بھی ہسائیگی کا حق ادا کرنے شادی میں شرکت کے لیے آ گئے۔

کراج ہو چکا تھا، ماہ نور کو اسٹیج پر لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ بی بی حد حسین تھی اور دلہن بن کر تو اس کی چھب ہی نہ رہی تھی۔ خود ثانیہ بہت پیاری لگ رہی تھیں، شینون کی جاما اور بلو ساڑھی میں ادھر سے ادھر پھرتی وہ کہیں سے بھی جوان بیٹی کی ماں نہیں لگ رہی تھیں۔

بالا خرد دلہا کو بھی اسٹیج تک لایا گیا تاکہ مودی اور تصاویر کا کوٹا بھی پوا کیا جائے۔ سب کی نظریں اسٹیج پر جان محفل جیسی دلہا اور دلہن پر اٹھی ہوئی تھیں تب ہی دلہا کی پھوپھو کو دلہا کے ابا اپنے بازوؤں کے

کھیرے میں اسٹج کی طرف لے جاتے نظر آئے تھے۔ پھوپھو صاحبہ کا منہ بے حد بڑا ہوا تھا، جلد ہی ان کے موڈ کا خلاصہ بھی ہو گیا کہ رشتہ طے کرتے ہوئے ان کی رضا مندی کو اولیت نہیں دی گئی تھی اور نہ ہی انہیں دلہن کی فہمی سے ملوایا گیا تھا اور اب بھائی صاحب اپنی روٹی آپا کو مناکر بہو کا دیدار کروانے لے جا رہے تھے۔

”آپا! آپ ایک بار بہو کو تو دیکھ لیں، آپ کا موڈ اچھا ہو جائے گا۔ ماشاء اللہ چاند کا گلزار ہے ہماری بہو!“ بھائی صاحب آپا کو پچکارے ہوئے اسٹج کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

”آئیں آپا! بیٹھیں اپنی بہو کے پاس۔“ دولہا کی اماں نے سمہن ثانیہ کے کان میں بھی روٹی مندا کا قصہ۔ کھڑے کھڑے ڈال دیا تھا تب اسٹج کے اوپر سے ثانیہ نے ہاتھ بڑھا کر آپا بیگم کا ہاتھ تھام کر انہیں اوپر آنے میں مدد دی تھی۔

”تم..... تم ثانیہ ہو نا..... گانیکہ ثانیہ..... جو جوانی میں شادی، بیاہ کی تقریبات میں جا چاکر شو کرتی تھی۔ ایک بار تم ہمارے گھر بھی آئی تھیں شادی میں۔“

اسٹج پر چڑھنے کے بعد آپا بیگم نے ثانیہ کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے مزید گرفت مضبوط کر لی تھی۔ ان کی تیز نظر اور یادداشت غضب کی تھی۔ ثانیہ جو سب کچھ چھوڑ کر تم نامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں، انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کے ماضی سے ایک جھٹکے میں پروہ اٹھ جائے گا۔

ثانیہ جو مسکرا مسکرا کر سب سے خندہ پیشانی سے پیش آرہی تھیں، گھر میں مرد نہ ہونے کے باوجود شادی کے ایک ایک معاملات کو دیکھ رہی تھیں، مانتے پر ایک حکم نہیں آنے دے رہی تھیں لیکن آپا بیگم کی بات سنتے ہی نہ صرف ان کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی بلکہ ان کا رنگ بھی فق ہو گیا۔

کر تم نے خوب میرے مرحوم عزت دار باپ، دادا کا نام روشن کیا۔“

آپا بیگم بھائی کو پلٹ کر اونچی آواز میں صلواتیں سناتے لگیں۔ دولہا بھی چونک کر بھی دلہن بنی پہلو میں بیٹھی بیوی کو دیکھنے لگتا، بھی اپنی پھوپھو، باپ اور ثانیہ کو۔ رئیس صاحب بھی بے یقینی سے سمہن ثانیہ کو دیکھ رہے تھے۔

”ہم خاندانی لوگوں کو یہ..... یہ تم نے کہاں میرا شیوں میں پھنسا دیا..... اب کیا ایک میرانی کی بیٹی ہماری بہو بنے گی جس کا یہ نہیں پتا کہ جائز ہے بھی یا نہیں۔“

آپا بیگم پورے زور و شور سے شروع ہو چکی تھیں۔ خاندانی لوگ میرانی کی بیٹی کو بہو نہیں بناتے لیکن یہ ہی خاندانی لوگ میرا شیوں کو بلا کر اپنی تقریبات میں رنگ بڑے ذوق و شوق سے بھرتے ہیں۔

پنڈال میں جھنڈناہٹ شروع ہو گئی تھی لوگ دلچسپی لیتے ہوئے اسٹج سے مزید قریب ہو کر مزے لے رہے تھے۔

”آپا بیگم! پلیز ایسی باتیں مت کریں۔ گانیکہ میری مجبوری تھی شوہر کے طلاق دینے کے بعد بچی کی پرورش کے لیے.....“ ثانیہ دھیمی آواز سے گویا تھیں۔

”کیوں یقین کریں ہم تم جیسی دو لکے کی میرا شن کا.....“ آپا بیگم اتنے خوشوار لہجے میں بولیں کہ ثانیہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہو گئیں۔

”بھئی رئیس! میں یہ شادی نہیں مانتی۔“ آپا بیگم فرعون بنی ثانیہ کو تیز نظروں سے دیکھتی اب رئیس صاحب سے ہم کلام تھیں۔

ہو چکا ہے..... میں قرآن اٹھانے کو تیار ہوں کہ میری حلال بنی ہے۔“ بنی سنواری ثانیہ کھنگھار رہی تھیں اور مرد حضرات دھچکی سے ان کے آنسو دیکھ رہے تھے۔

”بھاڑ میں جائے ایسی شادی جس لڑکی کے حسب نسب کا پتا نہ ہو، اس کی کیا گارنٹی..... رئیس میاں اپنے بیٹے سے کہو، ابھی اور اسی وقت اس کا بیکہ کی بیٹی کو طلاق دے ورنہ تم نے بہو رخصت کر دانی تو میرا امر ناجینا ختم تم سے.....“

ثانیہ نے کہم کر التجا یہ نگاہ سے سمہن کی طرف دیکھا مگر اب ان کی نگاہ بھی بدل چکی تھی۔

”آپا بیگم ابھی اور اسی وقت طلاق..... مہر کی رقم ایک لاکھ روپے ہیں، کہاں سے لائیں گے؟“ رئیس صاحب دھیرے سے اپنی پریشانی پتارے تھے۔ طلاق کا سن کر ثانیہ مزید کھانپنے لگی تھیں۔ ماہ نور کے آنسو بہہ رہے تھے۔ دو عورتیں اتنے سارے لوگوں کے بیچ تماشائی بیٹھی تھیں اور کسی میں کچھ کہنے سننے کی جرأت نہ تھی۔ کسی نے مرد و عورت کے پورشن کے بیچ کا شامیانہ بھی گرا دیا تھا تاکہ دوسری طرف کے حضرات بھی لطف اٹھا سکیں۔

”مہر کی رقم میں تمہیں دے دوں گی، بھجوا دینا بعد میں انہیں۔“ آپا بیگم کے کہنے کی دہر تھی، رئیس میاں نے دولہا سے سعادت مند خاندانی بیٹے کو دیکھا جس کی رگوں میں اتنا نیچلے درجے کا خون بہہ رہا تھا کہ وہ اپنی منکوحہ، اپنی بیوی کی عزت کے لیے ایک لفظ نہ بول سکا اور باپ کا اشارہ ملتے ہی اس نے تین بول، بول کر دو عورتوں کو زندہ دو کر دیا اور بار بار تہوں کے ساتھ دایس چل دیا۔

”اکیلی عورتیں راتیں تھیں۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ہی اور دیکھو آج کیسے بات چلی۔“ سب چہ گوئیاں کرتے رہے۔ لوگوں کی نظروں اور باتوں سے جب وہیں بنی ماہ نور کا کایہ چھلنی ہونے لگا تو وہ اسٹج سے اٹھ گئی۔ اس کے اٹھتے ہی چوڑیوں

اور بازو کا ایک جلتیگ سا سناج اٹھا۔ بالوں میں لگا گچرا ڈل کر تختوں سے ٹکرایا تو اس کی خوشبو دماغ پر چڑھ گئی۔ گجروں کی خوشبو اور جیولری کے تال میل سے نظر جراتے اس نے ایک کرسی پر ڈھسے جانے والی ثانیہ کو بمشکل اٹھایا اور تینکے سے ابھتی بمشکل انہیں لے کر اسٹج سے نیچے اتر آئی۔

جس آنگن سے رخصت ہونے کے ارادے سے وہ اسٹج تک آئی تھی، طلاق کا ٹکد لگانے کے بعد دوبارہ اسی آنگن میں قدم رکھ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

”ادھوا تورو دیکھے دلہن رانی کے.....“ محلے کے کسی شخص نے ہنسی اڑائی تھی۔

”کیا عالی شان جہیز بھجویا تھا بیٹی کا اس کا بیکہ نے، دیکھا تھا.....؟ بھلا کوئی پوچھے تو اکیلی عورت

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبین	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ لگیاں یہ چو بارے	فائزہ افتخار	400/-
دست میجا	نکبت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی



Your Herbal Dentist

English[®] Herbal

گی اور جانے ایسولینس کے لوگ کیسے ہوں۔“ وہ دکھیا ری، بارات لوٹنے کا تم، طلاق کا دارغ فراموش کیے اپنی ماں کی سکھائی بات کا پاس کر رہی تھی۔

”اماں، ابا آپ دونوں چلے جائیں پلیز۔“

زینیہ نے قریب آ کر کہا تو ماہ نور مشکور نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! تم چلو ہم آتے ہیں۔“ ابا نے کہا تو وہ شکر یہ ادا کرتی ہوئی تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ اماں کے کہنے پر شہر بانو ان کی چادر لے آئی۔

انہیں گیٹ اچھی طرح بند کرنے کی ہدایت کرتے اماں ابا، ماہ نور کے ساتھ ایسولینس میں تائی کو اسپتال کی طرف لے جانے لگے تھے۔ محلے کی کھڑکیاں دروازے ایسولینس کے سائرن سے کھلنے لگے تھے۔

”گدھ نایاب نہیں ہوئے ہیں شہر بانو! بس ان کے گھنے سر اور مڑی ہوئی چونچیں بدل گئی ہیں۔ وہ ہمارے آس پاس ہی ہیں، ہم پر لپکتے ہیں، ہماری قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ جیسے آ پائیکم نے ماہ نور کے ماتھے پر طلاق لکھ دی، محلے والے جو اس انتظار میں ہیں کہ کب انہیں موقع ملے اور وہ ماہ نور اور تائی جیسی عورتوں کو ہڑپ کر جائیں۔ گدھ نایاب نہیں ہوئے بس انہوں نے شکلیں بدل لی ہیں، ٹھکانا بدل لیا ہے۔“ وہ ہمارے بیچ میں ہی ہیں۔“

چادر کے اندر سے زینیہ کی آواز آ رہی تھی۔ شہر بانو نے اس کا ایک ایک لفظ بغور سنا تھا۔ زینیہ کی سسکی پر اس کے لبوں سے بھی ایک تنگی سانس آہ کی صورت نکلتی تھی۔

کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ رہا ہے؟“ محلے کی بی بی سی، تو یہ تو یہ کرنی اماں کے سامنے ساری کہانی کو پھر سے دہرا کر اماں کو تنبیہ کر رہی تھیں کہ ہمارا گھر سامنے ہے، ہم ان سے میل جول نہ رکھیں۔ تب ہی ابا نے ہمیں گھر کی راہ لینے کا اشارہ کیا۔

”رب معاف کر دیتا ہے لیکن لوگ معاف نہیں کرتے۔“ ابا گھر کا تالا کھولتے ہوئے افسردہ تھے۔

”سچ کہہ رہے ہیں، بہت افسوس ہوا، چند گھنٹوں میں بچی نے نکاح سے طلاق تک کا سفر کر لیا۔ بہت زیادتی ہوئی بچی کے ساتھ۔“ اماں نے بھی ہاں ملاتی۔

”کتنی پیاری ہے ماہ نور! لیکن نصیب دیکھو۔“ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتی شہر بانو دنگی تھی۔

زینیہ اپنی جگہ خاموش تھی، جو کچھ دیکھا اور سنا وہ اسے دنگی کر گیا تھا، نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا، جب اس کی آنکھ کھل گئی، شہر بانو بھی جاگ گئی تھی، دونوں اٹھ کر آئیں تب تک ابا اور اماں دروازہ کھول چکے تھے۔

عام سے لان کے سوٹ میں ماہ نور دھلے منہ سے دو چانس پر لیے کھڑی تھی۔ ہاتھوں پیروں پر لگی مہندی کو دیکھ کر زینیہ کا دل ایک بار پھر دکھ سے بھر گیا۔ ابا اور اماں بھی اتنی رات گئے اسے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

”مہربانی کر کے میری مدد کریں، امی کو ہارٹ ایک ہوا ہے۔“ انہیں اسپتال لے جانا ہے لیکن کوئی میری مدد نہیں کر رہا۔ میں نے محلے کے کسی دروازے کا کھٹکھٹانے سب نے منع کر دیا۔ پلیز آپ منع نہ کیجیے گا، میری امی کو کچھ ہو جائے گا۔“ وہ بری طرح رورہی تھی، اماں ابا نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”پلیز اکل آپ کی بھی پیٹیاں ہیں۔“ میں اکیلی ایسولینس میں امی کو لے کر گئی تو وہ ٹھیک ہونے کے بعد میری اس حرکت پر مجھ سے ناراض ہو جائیں

ناؤلیٹ

شریا کے ہلکے خراٹوں نے اس کی بندھوئی
پلکوں کو کھول دیا۔ اس نے کروٹ بدلے بنا گردن
سوڑ کر ماں کو دیکھا۔ وہ چارپائی پر چب پڑی گہری
نیند میں جا چکی تھی ہارش کے باعث ہلکی نکل میں سب
بچوں کو اس نے اوپر اوڑھنے کو چادریں دے دی
تھیں۔ مگر خود ہر چیز سے بے نیاز تھی۔
اب وہ بہن بھائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سب
ایک دوسرے سے لپٹے پچانے نہیں جاتے تھے کہ کس
کی ٹانگ کون سی۔ اور کس کا ہاتھ کون سا۔ بس ایک
اسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔
صبح سے جاری ہارش اب جا کے تھی تھی۔ فضا
میں گہری خاموشی تھی۔ کبھی جھینگ بول پڑتے۔ پیلے
بلب کے گرد پروانے چکر کاٹ رہے تھے اس نے کئی
کوئل بھن کر گرتے دیکھا۔ اس نے دوسری چارپائی
پر نظر ڈالی۔
پتا نہیں ماں کو اتنی پرسکون نیند کیسے آ جاتی ہے۔

سانہ رضا

سیرا کی دیکھ



صبح کا نکلا شوہر گھر نہیں لوٹا تھا۔

صبح سے خبروں میں بتایا جا رہا تھا۔ طوفانی بارش میں ہونے والی ہلاکتوں و حادثات کے بارے میں۔ مکالموں کی چھتیں گر گئیں۔ دیواریں۔ درخت۔ پل۔ پورے۔ مین کی چھتیں اڑ گئیں۔ کرنٹ لگ کر بھی کتنے لوگ مرے۔ اس کا دل دہلتا رہا۔

کتنے کھنبوں کے گرنے کی بھی خبر تھی۔ کھنبے کے نیچے ہی ابھیٹھا لگا تھا۔ اس نے پھولتی سانسوں کے ساتھ ماں کو بتایا کہ کھنبے گر رہے ہیں۔ وہ اب کوفن کرے۔ ثریا نے چونک کر دیکھا۔ پھر اسے اس کی فکر کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔ اور اسے آگن میں نیا رب رکھنے کا حکم دے کر خود دھواں پکانے لگی۔

ثریا نے یکدم بھونچال ہی برپا کر دیا۔ اس نے منٹ کے اندر شب، بالٹیاں، ہر چھوٹا بڑا برتن آگن کے بیچ ڈنچ رکھ دیا۔ اور اسے اور چھوٹے والے بیٹے کو حکم دیا کہ جیسے ہی برتن بارش کے پانی سے بھرتے جائیں وہ انہیں پلاسٹک کے خالی ڈبرموں میں ڈالتے جائیں۔ ساتھ ہی وہ مسلسل بول رہی تھی کہ گڑیا یعنی وہ ذرا کچھ دار لڑکی ہوتی تو کب کا یہ کام ہو جاتا۔ پتا بھی ہے کہ ایک ایک گدھا گاڑی کتنے میں بڑنی ہے۔ وہ بھی گندرا مکین پانی۔ (وہ گدھا گاڑی جسکے پیچھے پانی کی ٹنگی رکھ کر پانی سپلائی کیا جاتا ہے) ماں کی محنت کی کمائی کا خیال ہوتا تو اتنی محنت آتی ناں۔ مگر نہیں۔ سارے ہی بے حس بے درد ہیں۔

بہن بھائیوں کی تو مونج ہو گئی۔ یہ عین ان کی دلچسپی کا کام تھا۔ آیا دھاپی لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈرم بھر گئے۔ ثریا کے حکم پر اس نے تمام برتن بھر کے

برآمدے میں رکھ دیے۔

ثریا نے چائے بنا کر پاپوں کے ساتھ بچوں کو پیش کر دی۔ اتنے دیر بھگتے رہے تھے بے چارے، بچوں کی تو گویا دعوت ہو گئی۔ مگر خود ثریا کو چین نہیں تھا۔ اس نے بچوں کے اتارے کپڑوں کو آگن کے بیچ رکھ کر فرش پر ہی دھونا شروع کر دیا تھا۔ پھر برستی بارش ہی میں تاریں بھر دیں۔

طیبہ نے دیکھا۔ ثریا کپڑے بدل کر چائے کے دو کپ چڑھانے کے باوجود بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ اس برستی بارش سے اور کیا فائدے اٹھا سکتی ہے۔ مگر طیبہ جانتی تھی۔ کچھ بھی نہیں۔

پچھلی دو بارشوں میں وہ گھر کے سارے بستر، کمرے حتیٰ کہ فرش پر بچھادری نما کارپٹ تک دھوپ چکی تھی۔ وہ بہت جفاکش اور سخت جان تھی۔ اس کے ماتھے پر ابھری سلوٹیں بتاتی تھیں کہ کسی ایسی سوچ میں مبتلا ہے جو اس کے جسم و جان کو اس مشقت میں ڈال رہی ہے۔ جیسی مشقت کدال سے زمین کھودنے

مزدور کی بڑیوں پر تیتی ہے۔ کیا سوچ رہی تھی ماں۔ ”ابو نہیں آئے اب تک؟“ چھوٹے والے کو اچانک ہی یاد آگیا۔

یہ سوال گڑیا دل میں بار بار کر چکی تھی۔ سب کے ساتھ اس کی نظر سبھی ماں کی سمت اٹھیں۔ ماں نے چونک کر چھوٹے کو گھورا۔

اس نے سوال دہرایا۔ جواب میں ثریا نے ایسی سرد نگاہ کی مظاہرہ کیا کہ بچہ دہک کر رہ گیا۔ ثریا کے چہرے پر ایسا تنفر اُٹھ آیا تھا۔ جس نے اسے چپ کر دیا۔

بعد میں کسی نے جرات نہیں کی کہ وہ ابو کہاں ہے۔ بارے میں سوچے بھی۔ لیکن وہ۔ یعنی گڑیا۔ اس کے دل میں ماں کے خلاف گلہ ایسے بڑھتا لگا جیسے آٹے میں خمیر بڑھتا ہے۔ پو پلاسار۔ کھلاسار۔

بلبلے مارتا ہوا۔

ہاں ابا ایسا۔ ویسا اور کیسا تھا مگر۔ ایسی برستی خطرناک، بارش میں اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اور حجاب ہے جو ماں کو زرا پردہا ہو۔

کسی ماہر رنگرین نے آسمان کو سیاہ رنگ میں رنگ کر رہی تھی دوپٹے کی طرح پھیلا دیا تھا۔ جس میں سلوٹ کا شاہینک نہ تھا۔

اور ایسے میں ابا۔ اس کا دل سکڑا۔ پھر پھیلا۔ ہاں پر کچھ بھی ہو۔ رات جتنی بھی بیت جائے۔ یا راتیں۔ وہ دیا جا رہا لوٹ آتا تھا۔ وہ صبح اٹھتی تو ابا ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑے، منہ کھول کر خرائے لے رہا ہوتا۔ ثریا کی چڑچڑی غلت زدہ پکاریں۔ گرتے پڑتے برتن۔ لٹیریں جانے والوں کی دہائیاں۔

گڑیا کو پراٹھے تھوپنے کی آواز سے ثریا کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا وہ جیسے اپنے اندر کا سارا کشش پراشوں میں بھردیتی۔

مگر ابا۔ اس کے کھلمنہ پر ہونے والی کھیوں کی یلغار بھی خواب غفلت کے بیچ حائل نہیں ہوتی تھی۔ بہت ہوا تو وہ فضا میں ہاتھ چلا دیتا۔ کر وٹ بدل لیتا۔ یا پھر منہ پر تکیہ رکھ لیتا۔

مگر آج تو ہر جگہ بارش ہے۔ ابا جن تھڑوں پر بیٹھتا تھا وہ بھی بھیکے ہوں گے تو پھر کہاں ہوگا ابا۔ اس کا دھیان ایک بار دن بھر ہونے والے حادثات کی سمت چلا گیا۔ اس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ داوی کہتی تھیں کلمہ سے دل کی بے چینی کو فرما آتا ہے۔ اور تھوڑی دیر میں اسے سکون محسوس ہونے لگا۔

اس نے منہ پر دو چار رکھ لیا۔ نیند بس آنے کو تھی۔ آئی آئی۔ مگر ابا۔ ہاں ابا۔ ترتر۔ ہوں ہوں۔ اور ہلکی سی چیخاؤں میں یہ میٹھی کی آواز تھی۔

برسات کے موسم میں، تنہائی کے عالم میں۔ میں گھر سے نکل آیا، بوتل بھی اٹھا لیا۔ ابھی زندہ ہوں تو جی لینے دو۔ جی لینے دو۔

بھری برسات میں۔ آہ۔ بھری برسات میں۔ اوہو۔

بھری برسات میں جی لینے دو۔

ہاں ابا۔ یہ ابائی کی آواز تھی۔ گمان نہیں تھا۔ ابا نے اس وقت دروازہ نہیں بجانا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اور بوجھ بھی لیتا تو ابا سمیت سارا حملہ جانتا تھا۔

ثریا نے کھولنا نہیں تھا۔ داوی بتاتی تھی۔ ایک بار ثریا نے کھول کر گرم پانی پھینک دیا تھا دروازہ کھولنے ہی ابا پر۔ وہ اس وقت بہت چھوٹی ہی ہوگی۔ مگر سوچتی ابا کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔

تو ابھی منٹ میں ابا دیوار ٹاپ کر اندر ہوگا۔ اس کے صبح سے بے چین دل کو قرار آنے لگا۔ اس کی چلیں ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔ اس کا لاشعور ابا کی آدھی کا متکثر تھا۔ اس نے ایک بار شعوری کوشش سے آنکھیں کھولی تھی۔ اسے ابا آگن سے برآمدے کی طرف آتا۔ دکھائی دیتا تھا مگر پھر۔ وہ سو گئی۔ ہاں۔

ندیاری نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ ابھی تو آنکھ لگی تھی۔ پھر کیسے حل گئی۔ وہ ساکت لیٹی حیرت سے سوچ رہی تھی۔ ہاں برتنوں کی اٹھا بیچ، ابا یقیناً کچھ کھانے کو ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اسے تسلی ہوئی۔ ماں نے بالخصوص روٹی نہیں بنائی تھی۔ مگر

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ گلیاں چھپارے

نغمہ نگار

اپریل 2007ء

ملکتی عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:
32735021

37، اردو بازار، کراچی

پاپوں سے پپٹ بھرے بچوں نے رات کے کھانے میں اتنی رغبت نہیں دکھائی۔

سو دسترخوان میں دو ثابت روٹیاں اور بچوں کے چھوڑے آدھے ادھورے ٹکڑے موجود تھے۔ آلو کی بھجیا بھی دیے کی ویسی تھی۔

اس پر پھر سے نیند طاری ہوئی۔ اباشم سیری کے بعد اب پھر گنگنا رہا تھا۔

”تیرے بچے بدن کی خوشبو سے، لہریں بھی ہوئی مستانی سی۔“

ابا کی آواز اچھی تھی۔ اسے ہزاروں گانے یاد تھے۔

ابا کا گانا جیسے لوری کا کام کرنے لگا۔ میٹھی میٹھی بہت میٹھی نیند۔

اس نے ابا کو ماں کی چارپائی کی جانب آتا دیکھا۔ ابانے پائنتی پر بیٹھ کر ماں کے پیچھے تھائے۔

وہ جیسے اب خواب دیکھ رہی تھی۔ ابا کا مسکراتا چہرہ بھی نمایاں تھا۔ ابا کی گنگنا نہیں۔ برسی رات۔

ٹپ ٹپ کرتے ٹینگے۔ بارش کی سلین زدہ مہک اور گلتے سڑتے کچرے کی بدبو۔

سب نے مل کر کیا ساں باندھ دیا تھا۔ اسے اپنے اندر سرشاری سی اترتی محسوس ہوئی۔ مگر یہ کیا۔

یہ کیا ہوا۔ ماں نے پائنتی پر ذرا سی جگہ بنا کر بیٹھے ابا جن کے ہاتھ میں ان کے پیروں تھے۔ انہی پیروں سے ایسی طاقت کا دھکا مارا تھا کہ ابا کو لمبے کے

مل دور جا کر۔ خود ماں اچھل کر بیٹھی تھی اور خون خوار نظروں سے ابا کو گھور رہی تھی جیسے کچا چا جائے گی۔

ابانے اپنی حیران آنکھوں میں ٹیش بھرتا چاہا۔ مگر ماں کو ذرا ڈرنے لگا تو۔ آ۔ آ۔ میں سناتی ہوں گانا۔

وہ پہلوان لگنے لگی جو مقابل کو جان سے مار دینے کے لیے لڑنے کی دعوت دیتا ہے۔

ابا دونوں ہاتھوں کے سہارے کھڑا ہوا اب ہاتھ جھاڑ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں میچ لیں۔ جڑے بھینچ لیے اب کیا ابا ماں کو مارے گا۔

یا۔ یاں ابا کو۔

اس کا دل بولا۔ ”اگر ایسی مارم پٹی (مارکنائی) شروع ہو جاتی تو خدا کی قسم ماں ابا کو دھول چٹا دیتی۔“

ابا کھڑا تو جارحانہ تیور لیے ہوئے تھا۔ مگر ماں کی آنکھوں میں اترے خون نے اسے جھپسا کر دیا۔ مگر

تب ہی سب سے چھوٹی والی سمسائی اور رونے لگی۔ اس نے ماں کی آنکھوں کو سوجا ہوا درخ دیکھا۔

دیر تک سونے والا ابا بھی آج صبح ہی جاگ چکا تھا۔ اور پتے خان بنا مسلسل ٹریا کو گھورتا جاتا تھا۔

ماں باپ کے توروں کے سب سہم سے گئے گلی سے کسی بچے نے آواز لگائی۔ ”آج اسکول کی چھٹی ہے۔ سارے اسکول میں پانی بھرا ہے۔“ ساتھ

والے گھر سے دادی نے بھی ہانک لگائی۔ متوجہ کرنے کے لیے وہ درمیان دیوار پر ہاتھ بھی مارتی جاتی تھی۔

”ارے ٹریا خیروں میں بتا رہے ہیں۔ سب اسکولوں کی چھٹی ہے۔ یہ کارڈی پرائیویٹ سب۔“

دادی کی آواز میں بھی خوشی تھی۔ بچوں نے تو خوشی سے چھلانگیں لگائیں۔ مگر

اس نے ماں کی آنکھوں میں تسکین اترتی دیکھی۔ ”ناشتہ ملے گا کہ ایسے ہی بھوکا نکل جاؤں۔“

ابا کا بولنا ناگزیر تھا۔ کچھ دیر پہلے تک تو اس کا خیال تھا کہ سب گھر سے نکل جائیں گے تو وہ خود آرام

سے ناشتہ کرے گا۔ مگر اب تو ٹریا کو گھر میں رہنا تھا۔ تو اب بھوکا بیٹھے سے بہتر ہے وہ رعب سے مانگ

لے۔ وہ مستعدی سے کھڑی ہوئی۔ اس نے چنگیر پکڑی، مگر ٹریا نے جھپٹ لی۔

”نہیں۔“ اس نے ابا کو ناشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ گڑیا کا دل ڈوب گیا۔ رات کو ختم جانے

والی لڑائی اب شروع ہوئی تو رات تک جاری رہتی۔ آج تو ٹریا گھر بھی تھی۔ اور لڑنے کے لیے ابا چھٹی بھی

کر لیا کرتا تھا۔ خیر ابانے کبھی رات تو نہیں۔ پاں ماں ہی چٹا،

چوکی، چکلا، یا جو ہاتھ لگتا مار دیا کرتی تھی۔ اس نے سہم کر ابا کو دیکھا جو سخت جارحانہ عزائم

لیے کھڑا ہوا تھا۔ ٹریا نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ تو لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

چند منٹ ہی گزرے ہوں گے۔ جب دادی کی مگر باری آواز ابھری۔ ”ٹریا۔ اسے ٹریا۔ اور ریاض۔“

لڑ رہے ہو؟ او مالک۔“ وہ ساتھ ساتھ دیوار پر پہلے ہلکے پھر زور زور

کے ہاتھ مارنے لگیں۔ اس کی توجہ کے عین مطابق۔ اگلے منٹوں میں وہ سخت پریشانی کے عالم میں ان کے

آنکھوں میں موجود تھیں۔ بغیر لے سنے انہیں منصف کا رتبہ بھی فوراً مل

گیا۔ ٹریا اور ریاض اب ان کی طرف منہ کر کے ٹھکڑے شکایات کر رہے تھے۔

گڑیا جانتی تھی۔ دادی دل سے، ضمیر سے، عقل و ہوش سے ماں کی طرف دار نہیں مگر ریاض نکما، ٹھکڑا، ہڈ

حرام بے ہدایت سب کچھ ہے۔ دادی نے یہ بات پوت کے پاؤں پالنے کے زمانے ہی سے بھانپ لی

تھی۔ جو ان ہونے پر جیسے خوبوں پر چار چاند لگ گئے تھے۔ بہت زیادہ نکما۔ بے حد ٹھکڑا۔ بے ہدایت، بے

پناہ اور ہڈ حرام (ٹریا نے بعد میں نمک حرام کا اضافہ کر دیا)

مگر وہی ہر ماں کی طرح دادی کو یقین بلکہ کامل ایمان تھا کہ شادی کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک

اچھی لڑکی اسے بدل دے گی۔ اور ٹریا واقعی بہت اچھی لڑکی تھی۔ سلیمہ بیگم کی

سب سے بڑی ہونہار سلیقہ شعار صاحبزادی تھی اور اس جیسی ساری مثالوں کے ساتھ ٹریا۔

پیاری ٹریا۔ بے چاری ٹریا۔ پیاری تو وہ اب رہی نہیں تھی۔

تو شادی نے پیاری ٹریا کو کچھ نہیں دیا۔ ہاں باغ بچے۔ ایک پرائیویٹ اسکول میں دو ششوں کی

ماسی گیری، آیا گیری، اور مصائب و آلام کا ایک پہاڑ۔ جہاں وہ خود کی دست گیر خود ہی تھی۔

اور ریاض؟؟؟ رشتہ طے ہونے کے زمانے میں اس نے اتفاقی

ٹریا کی صورت دیکھ لی۔ دادی نے ریاض کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی اور حیرت بھانپ لی۔

”ایسے ہی نہیں دیں گے اگلے اپنی لڑکی۔ جہاں پھٹک کر دائیں گے۔ لڑکا کیا کھاتا کھاتا ہے۔“

ان کی بیٹی کو عزت سے گھر بٹھا کر کھلا سکے گا یا نہیں۔ تسلی ہوئی تو رشتہ ملے گا۔

”کر تو رہا ہوں نوکری۔“ ریاض نے نروٹھے پن سے کہا۔

”چھوڑنی کب ہے؟؟“ دادی نے جھٹکے لہجے میں کہا۔

”کیوں چھوڑ دوں گا۔ ابھی تو سیٹ ہوا ہوں۔“ دراصل ریاض کی ہڈی میں ٹک کر بیٹھنا نہیں

تھا۔ وہ جلد اکتا جاتا تھا۔ کون سا شعبہ ہوگا جس میں اس نے ہاتھ نہ

مارے ہوں۔ بات کر دو تو اس سے زیادہ تجربہ کار اور عقل مند دوسرا کوئی نہیں۔ مگر عملی طور پر نہیں؟

تو ٹریا کی پیاری صورت اور دادی کے جھوٹ سچ ریاض کو مجبور کر رہی دیا کہ وہ ذرا سنجیدگی سے کام

کرے، شادی سے پہلے کے آٹھ نو مہینے اور بعد کے پورے نو مہینے وہ تن دہی سے کام کرتا رہا۔

دادی کا ٹکا فٹ بیٹھ گیا تھا۔ شادی کے بعد لڑکے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا بھی تو ٹھیک

ہو گیا ناں۔ تو جب شادی کے نو مہینے بعد اس نے ملازمت

چھوڑ کر آنے کا بتایا تو دادی سمیت سب نے یقین کر لیا۔ مالکان ہی غیبت ہوں گے۔ ریاض نے اس

بار ایمان داری سے کام کیا تھا۔ صبح نو بجے لکھتا۔ دوپہر کو کھانا کھانے آتا۔ اور

پھر رات کو ریاض کی آمد سے چاہیں تو گھڑی کا وقت سیٹ کر لیں۔

سارے دوستوں کو جنہیں وہ جانی کہتا تھا۔ ٹریا کی قربت میں انہیں بھی بھلا چکا تھا۔ ایسا لگتا اسے ٹریا

کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ٹریا کے چہرے کی طمانیت اس کی جھکی پلکیں۔

بالوں میں لگے گجرے۔ اور ریاض کے لئے اس نکلے۔ گرم گلاب جاسن کی چٹیلی۔ تلی چھلی کے بیجے لکھے کاٹنے اور نکلے کا چکنا کونے کی خوشبو دینا اخبار۔ ریاض کی ماں۔ کا دل باغ باغ ہوا تھا۔

وہ تصور کی آنکھ سے منظر کشی کرتی تھی۔ وہ آنگن ہی میں چار پائی ڈال کر پڑی ہوتی تھیں۔ جب ریاض گھر کو شام تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی ہوتے تھے۔ یعنی وہ کھانے کی چیزیں یا گجرے ماں سے چھپائے ہوئے ہوتا۔ چیکٹ کے اندر، یا پھر کہاں۔ پھر وہ سوچتیں۔ اس نے کسی راز داری سے دروازہ بھیڑ کر ثریا کے بالوں میں گجرے لگائے ہوں گے۔ یا گرم گلاب جاسن اپنے ہاتھوں سے کھلائے ہوں گے۔ بوزخی۔ ہونے کے باوجود ریاض کی ماں کو لگدگی ہونے کا حساس ہوتا۔ وہ آنکھیں موند کر سرشار سا ہو کر بار بار منظر کو دیکھ دیکھ کر کہتی تھیں جیسے ”تم خوش ہونا؟؟ وہ ثریا کو ٹوٹتیں۔“

”جی۔“ ثریا کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ مگر انہیں لگتا جیسے یہ اثبات باز گشت بن کر سارے جہاں میں پھیل گیا۔ آسمان کو چھو کر لوٹا ہوا۔ ”جی۔“ ثریا ملازمت کے ختم ہونے کی تمہید کرتا کو سمجھ نہیں پاری تھی۔ اللہ خیر دو بار مل جاتی تو کری۔ لیکن فی الوقت تو ریاض اٹھارہ ماہ کی ملازمت کی تھکان اتار رہا تھا۔

اور ریاض کی تھکان پہلا بچہ پیدا کرنے کے بعد دعوت کی کمر میں رہ جانے والے اس تھکان اور درد کی طرح تھی۔ جو آخری سانس تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔

جب تک ثریا صحیح صورت حال کو سمجھتی وہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ریاض کی ماں بے حد مشتاق اور دردمند عورت تھی۔ وہ ثریا کو گلے لگاتے روئی اور معافی مانگتی کہ اس نے تو بھلا ہی سوچا تھا۔ ثریا کو ساس کی صاف دلی اور نرم زوہ ہونے اور شرم سار ہونے پر یقین آ گیا۔

ریاض کو سمجھاتے ڈانٹتے اور کوستے دیکھ کر کوئی

یقین نہ کرتا کہ وہ اس کی ماں ہے۔ وہ ثریا ہی کی ماں لگتی تھی۔

مگر اس اخلاقی سہارے سے پیٹ تو نہیں بھرتا تھا۔ ریاض محنت سے جی چراتا تھا۔ من پسند نوکری ملتی نہیں تھی۔ ملتی تو نکلتا نہیں تھا اور تک جاتا تو دوستوں کی منڈلی مچھلتی۔ مگر کم کم ہوتا عورت کو صحتی ہے مگر کم کم تا ہی نہ ہوتا۔؟؟

ریاض کو ملا کر ساس کے تین بیٹے تھے۔ ساس کا گھر کھلے آنگن کے سامنے بنے۔ کسی اسکول کا منظر پیش کرتے تین کمروں پر مشتمل تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ۔ ریاض تو کما کر لاتا نہیں تھا۔ مشترکہ باورچی خانے کی ہانڈی پر ثریا بھی بیچے سمیٹ کر بیٹھ جاتی۔ پہلے جیشانیوں نے منہ بنایا پھر جیشانیوں نے بھی بچوں کو دسترخوان پر شور۔ بچانے اور نمیز نہ دکھانے پر ٹوکنا شروع کر دیا۔ سب کا۔۔ خیال تھا۔ ثریا کے بیچے روئی کو نمیز بے پن سے دیکھتے ہیں اور کھانے پر پل پڑتے ہیں جیسے۔۔۔۔۔

بعض جملے فصد آدھو رے چھوڑے جاتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ زیادہ پر اثر ثابت ہوتے ہیں۔

شروع میں ساس نے سب کو شرم دلانے کی کوشش کی۔ کہ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سیکھتے ہیں اور ابھی وہ زندہ ہے۔ اور وہی سائن ورتانی (تقسیم کرنا) ہے۔ اور گھر اس کا ہے۔ خیر دار۔ ”سب دیک گئے۔

واقعی گھر کی مالکن تو وہی تھی۔ مگر ایک روز دونوں جیشانیوں نے ایک کر لیا۔ گھر بھلے سے ساس کی ملکیت ہے اور وہی ہانڈی ورتانی ہے۔ مگر کم کم تو ان کے شو ہر لاتے ہیں۔ ریاض بھی لائے اور حق سے بیٹھے۔ ساس کے لیے یہ جملہ چشم کشا تھا۔

اگلی صبح تین کمروں کی سیدھ میں دیواریں کھینچ گئیں۔ تین بھائیوں کے تین گھر، ایک ایک حصے میں مانو پچاس پچاس گز جگہ آئی۔ مگر امن ہو گیا۔ ہاں ٹھیک ہے اپنا کماؤ اپنا کھاؤ۔

ساس نے اپنے لیے درمیان والے گھر کے صحن میں چار پائی ڈال لی۔ جہاں سے وہ باقی دو کی خبر

گیری کرتی۔ ساتھ ہی حفظ ماتقدم کے طور پر پوچھ لیا۔ کہ وہ تو کچھ کمائی نہیں ہے۔ تو کیا اپنے لیے چولہا بھی چار پائی کے ساتھ رکھ لے۔ دونوں بڑے بیٹے اور بہنیں بیروں پر جھک آئے۔

”اماں کیسی باس کرتی ہیں۔ اس روز کے سخت جملے تو صرف ایک کوشش تھی کہ ریاض عقل پکڑے اور کمائے۔ میرا گھر تو آب ہی نے چلانا ہے۔ میں جو پیسے آپ کو دیتا ہوں راتوں کے ویسے ہی دوں گا۔“ اس کی بیوی نے بھی زور شور سے سر ہلایا۔ یہ تو سراسر فائدے کا سودا تھا۔ ساس کے سر بھی ساری ذمہ داری۔ وہ سستا اور اچھا سامان ڈھونڈنے صبح سویرے ہی نکل جاتی۔ اس مہنگائی کے زمانے میں پیسے بچا کر بھی لاتی تھی۔

ساس کا دل بڑا ہوا۔ مگر وہ جو سوچ بیٹھی تھی۔ اس سے اب پیچھے ہٹنے کو نہ تھی۔ اس نے اپنی وصیت بھی لکھوائی اس کے مرنے کے بعد مکان تینوں بیٹوں کا ہوگا۔ ہاں مگر ریاض کا کھہر ثریا کے نام لگا دیا۔ جس نے سنا دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔

”بائے مائی غیر لڑکی پر بھروسہ کر لیا۔ اپنے گئے بیٹے کو ہاتھ دکھا گئی۔ وہ جو سب لے کر بھاگ گئی؟“ فکر نہ کی ریاض کی۔

خود ثریا بھی ہکا بکا تھی۔ ساس نے سب کے اعتراضات گل سے نئے لبوں پر زخمی مسکراہٹ ورتائی۔ آنکھ میں نمی نے بھی چمک ماری۔

”غیر نہیں ہے۔ بہو ہے، میرے پوتے پوتیوں کی ماں۔

اور ریاض کی فکر ہے۔ محبت ہے۔ اسی لیے تو یہ قدم اٹھایا ہے۔

اور وہی ثریا۔ وہ بھانجے والی بیٹھ دکھانے والی ہے ہی نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ”سب ہکا بکا ہو گئے۔ سب کا دل ساس کے یقین پر ایمان لے آیا۔ ثریا کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ سب کے برائیاں میں ہلنے لگے تھے۔ اس کے جیٹھ نے سب سے پہلے بڑھ کر ماں کے اقدام کو سراہا اور ثریا کے سر

پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو۔ ثریا کا سر جھک گیا۔ اسی جیٹھ نے اس کے بچوں کو نمدیدہ کہا تھا۔ جیشانی ہم خیال فوراً ہو جاتی تھی۔ ہاں ہاں کرتی اس کے ساتھ چمک کر بیٹھتی۔ ڈھارس کے طور پر اس کا ہاتھ بھی تمام لیا۔

”ان ہی ہاتھوں سے اس نے آٹا گوند حتی ثریا کے ہاتھ سے پراٹ چھٹی تھی۔

دوسرے جیٹھ جیشانی نے فقط سر کو ہلانے پر اکتفا کیا۔ جاں چھوئی لاکھوں پائے ثریا کے حصے میں اب ایک بڑا کمرہ۔ آگے بڑا آمدہ۔

دروازے کے ساتھ غسل خانہ وغیرہ۔ باروچی خانہ برآمدے کے ایک جانب بنادیا گیا۔ اور ثریا اسی باروچی خانے میں کھڑی خالی برتنوں اور ٹھنڈے چوہے کو دیکھتی رہی۔ اتنے بڑے بڑے فیصلوں کے باوجود اس کا باروچی خانہ خالی تھا۔ ٹھنڈا پھولا۔

ایک جیٹھ نے ٹرے بھر کے چنوں کا پلاؤ بھیج دیا۔ دوسرے نے کبھی قیسم کی پلاٹ راستے کے ہمراہ۔ چار روٹیاں بھی دسترخوان میں پٹی تھیں۔

ادھر دعوت منائی جارہی تھی اور ادھر۔

صبح سے نئے گھر کو سجاتے اس کے چھوٹے چھوٹے بیچے واقعی کھانے پر بل پڑے ویسے ہی

جیسے ابھی تو بتایا تھا بعض جملوں کو ادھورا چھوڑنا زیادہ بامعنی ہوتا ہے۔

ثریا نے بھی نگاہیں چڑھیں۔ کل۔ یہ دو حرف سوالیہ نشان تھے۔ کل۔ کل کیا ہوگا؟“

ریاض تو ماں کی اس نا انصافی و ظلم پر احتجاجا گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ ساس درمیانی گھر سے دو کپ چائے لیے آئیں۔

اسے اپنے سامنے بٹھا کر لپٹی بغیر کہنا شروع ہو گئیں۔

ان کی تمام تر گفتگو جس میں دکھ۔ معذرت شرمندگی اور درد کا عکس تھا۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ اب اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے

TV ONE

#TvOnePK



تو جو نہیں

TU JO NAHI

کاسٹ: دانیال راجیل، عامر محمود، سحر افضل، حارث وحید، قتلیہ امیس، شرمایہ الدین،
 نسیم طاہر، تارہ محمود، اورنگ زیب لغاری، بینا پتہ ہدیری اور خالد بن شاہین
 تحریر: جہاں زیب قمر، حنیف بڑا، فیلل اللہ قادری اور امیر اعظم مرزا
 پروڈیوسر: اللہ بڑج میڈیا ایگریگیشن پروڈکشنز، سیمہ طاہر مرزا

قربوں کو فاصلوں میں بدلتی محبت کی کہانی

یہ کہانی بنیادی طور پر رشتہ کے گرد گھومتی ہے۔ رشتہ کی واہمہ کے
 انکسار کے بعد اس کے والد نے دوسری شادی کر لی اور اپنی نئی
 بیوی کے ساتھ شادی کو تسلیم کر لیا۔ وہاں ملک جانے لگے تو بہن
 شفیقہ تالی اور تالی نے مناسب سمجھا کہ سبیل مال کے رحم و کرم پر
 چھوڑنے سے بچانے چاہیے۔ اس لیے ان کے پاس رہ کر رہا۔ اس کی
 پرورش کریں۔ رشتہ کے خود پسند اور گارڈ آپ اور سبیل مال
 نے تالی کی یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ تالی اور تالی کے دو بیٹے
 آج کل اور کس ہیں جو شادی سے بڑے ہیں۔ جیسے بچپن کے ساتھی
 ہیں ایک دن چست بریل کے دوران شادی کر لیا۔ وہاں اس کے
 کے لیے اس کے لیے چھپا چھپا رہتا ہے اور اس کے دماغ سے
 محسن چست سے مراد معذور ہو چکا ہے۔ اب اس کی زندگی ذلیل
 چھتری میں مقنا ہے۔ تالیوں جو انہیں دوسرے ہیں۔ شادی اپنی سادگی
 معمولیت اور بیماری کا دوا کی جگہ سے گھر گھر کی جاتی ہے۔ وہ
 محسن کا سیدھا خیال کو کھتی ہے۔ سادہ بن کر ساتھ زندگی ہے۔ محسن
 اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی، اچھے مستقبل کی امید اور
 اپنے وجود کا لازمی حصہ سمجھتا تھا ہے۔ وہ ایک طرف حضور پرورش سے
 محبت کرتا ہے مگر بھی مکمل کرنا نہیں کرتا اور تالی میں اپنے دل
 کی کیفیت کا اندازہ پر منتقل کرتا رہتا ہے۔ شادی محسن کو اپنا بھروسہ
 دوست سمجھتی ہے۔ آج اور کس، ایک دوسرے سے بہت دور ہے
 ہیں مگر تالی کا دل کی وجہ سے ہے جو تالی میں۔ محسن اس بات
 سے بے خبر ہے کہ صرف تالی ہی اس بات سے میں چاہتی ہیں۔ اس
 موقع پر کہانی میں ایک سٹے کر اور تالی کا اضافہ ہوتا ہے جو شادی کا
 ناموں زور ہے۔ مگر وہوں ایک اور سٹے کے صورت اختیار بھی
 نہیں۔ شادی کے ختم ہونے والوں نے اس کے والد سے شادی
 اختلافات تھے جو تالی کے تعلق کا موجب بنے۔ شادی کے تالی نے
 جیتے ہوئے اس کے والد کی وصیت کی کہ ان کی خواہش کو ملاحظہ

کر جائیں۔ وہیں اس کا حصہ اس کے حوالے کیا جائے۔ یہی
 خواہش شادی کے ماموں و سرپرستوں سے آتی ہے۔ ان کی بیوی اور
 بیٹا یہ رشتہ ایک اور کھیل کے تحت چھپا ہے۔ یہ سبیل مال
 سے پہلی بات ایک ناخوشگوار حادثے کی صورت میں ہوئی
 ہے جہاں شادی کے بھائی اور تالی کی بیوی تالی کی طرف سے
 عزتی کر رہی ہے۔ یہ شادی کے لیے اپنی اپنا کام کیا ہے اور
 شادی کو قریب کر لیا۔ اس کے لیے تالی کے ساتھیوں کے چال
 بنے۔ کہانی میں اس وقت میں شادی کے لیے جب اس
 اللہ کا ہے۔ والدین کی جھگڑوں کے لیے ہیں اس کے والد
 جہاں ان کے والدین کی طرف سے فیصلہ کن انداز میں لیتے ہیں کہ شادی
 کی شادی محسن سے ہوگی۔ یہ شادی کے لیے تالی کی کہیں
 صرف شادی محسن کی کہیں کی کہیں ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھتی
 ہے اور اس کا سبب مدد نہیں دیتی ہے۔ اس موقع پر وہی سے
 احتجاج وہ باہل خاطر میں نہیں آتے۔ اس جو خود کو اس کی
 معذوری کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ یہ جانے کے بعد کہ محسن ہی شادی
 سے محبت کرتا ہے اور اسے اپنی زبان سے کہتا ہے کہ شادی کا خواب دیکھ رہا ہے
 اس کے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ وہ تالی کی خاطر قربانی دینے کا فیصلہ کرتا
 ہے اور محسن کو چارہ مان کر اس کے لیے پروان ملک سے آئی
 ہوئی اس کی سوتیلی بہن کی طرف نکل ہوئے۔ تالی نے جو پہلی
 نکل تالی محسن پر عرض ہے۔ اچھا شادی کے ذمہ دل پر وہ
 بچا یاں گرتی ہیں۔ محسن کی سبب تالی، بے رشتہ اور پھر یہ شادی
 اسے محسن سے ہے یا تالی کے منصوبے بن رہے ہیں۔ یہ
 صورت حال شادی کے دل پر طوفان بن چکا ہے۔ تالی اور پھر شادی
 طرح قوم واپس لیا۔ شادی کے تالی ہے اور محسن سے تالی ایک
 متعلق بننے والی طرف بدلتی ہے۔

#TvOnePK

Monday 8:00 pm

ٹریا کو کمر کسنی ہوگی۔

ٹریا کو۔ مگر کیا۔ اور کیسے؟؟

وہ بھونچکی رہ گئی۔ ساس کی چندھی نظریں غیر مرنی نقطوں پر جمی تھیں۔ اس نے جو کہا تھا بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔

☆☆☆

اپنی خود ساختہ ناراضی یا لافلتی ختم کر کے ریاض نے ڈیڑھ ماہ بعد گھر میں قدم رکھا۔ تو سارے آگن میں آلو کے برائٹوں کی خوشبو پکرا رہی تھی۔ باورچی خانے سے انتی دھوپ کی لکیر پر سورج کی روشنی تھی۔ ایسے لگتا تھا جسے مرغولے اڑ رہے ہوں۔ ریاض نے لمبا سانس بھرا۔ بھوک جاگ اٹھی۔

”مجھے دہی میں چٹنی ڈال دیں ائی پھولے ڈالا کھہر ہاتھا۔“

”اچھا بیٹا۔“ ٹریا کی آواز میں طمانیت اور شیرینی تھی۔

”آلو کے پرائے اور دہی۔ کیا میرے پیچھے بڑے برسنے لگا ہے۔“

اس کی آواز ایک بیک گھر میں پھیل گئی۔ دیوار کے اس پار بیٹھی ماں بھی اپنی جگہ پر سُن رہ گئی۔ ٹریا بھی۔ پرائے کے سارے سنہری پھول جل کر سیاہ ہو گئے۔ وہ باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔

دونوں ہاتھ سر سے اوپر کر کے چوکت میں دھرے تھے۔ اور خمار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یا پھر۔ اول ل ل۔ ہاں لو فرانہ نظروں سے۔ یہ ٹھیک تشبیہ ہے۔

”تو پھر اس نے آگے بڑھ کر جلتے پرائے کو تو سے اتار دیا۔ اور ہاتھ جھٹکنے لگا۔ اتنا گرم وہ پوروں پر پھونکیں مار رہا تھا۔“

پھر اس نے جلتے آلو کے پرائے کو چٹکی سے پکڑ کر درمیان سے بھاڑ دیا۔ جلتے حلقے کو چھوڑ کر دوسری پرت کو دو ٹوکوں میں ختم کر دیا۔

”اسنے دن دہی چیزیں یاد رہیں۔“ تو۔ اس

نے اس کے شانے پر بازو پھیلا لیا۔ ”اور تیرے ہاتھ کے پرائے۔“

وہ یاد کی کک مٹانے کو عملی کوشش کرنے کو جھکا۔ مگر ٹریا کے ہاتھ جھٹکنے سے پہلے تینوں بچے دروازے پر اکھڑے ہوئے تھے۔

وہ بدگ کر پیچھے ہٹا۔ اور چھوٹے دالے کو گود میں اٹھا کر بے توجہ شاؤچ کرنے لگا۔

دو بچے ناگنوں سے لپٹے تھے۔ ٹریا کے وجود کی تپتی ہوئی ڈوریاں ڈھیلی ہو گئیں۔ اس کے چہرے کا تغیر کھینچنے لگا۔ جیسے تو بے رنگی پھلتا ہے۔

دنیا کی ہر عورت کی طرح شوہر کو بچوں سے لاڈ کرنا دیکھ اسے خود پر فخر ہونے لگا۔ جیسے بچے ہی اس کا اصل کارنامہ رہے ہوں۔

تو اس کی ناراضی ختم ہو گئی (دہی جو مکان ٹریا کے نام لگایا تھا۔ اور جو ریاض کی ماں صرف ٹریا کی ماں لگتی تھی۔ شکوہ) وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی کہ ماں تو وہ ریاض ہی کی ہیں۔ اور یہ کہ وہ غصہ تھوک دے (تھکا دوا لگ تو رہا تھا)

وہ اسے لے کر بیٹھنا چاہتی تھی کہنا سننا چاہتی تھی۔

مگر وقت نہیں تھا۔ ساڑھے اٹھ بجنے کو تھے۔ بس آچا چاہتی تھی اسے گارمنٹ فیکٹری میں لے جانے کے لیے۔

”میری بیوی اور فیکٹری میں کام۔“ ریاض کے اٹھائے طوفان نے سارے ہمسایوں کو اس کے آگن میں پھینچا دیا۔

وہ ٹریا کا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا۔ جس نے اس کی عزت کا جنازہ چوک پر رکھ دیا۔ وہ اچھل اچھل کر ٹریا کو مارنے دوڑتا تھا۔ ٹریا بھٹکنے بتا پالی کہ یہ تو ساس کا فیصلہ تھا۔ بلکہ اس نے ملازمت ڈھونڈی۔ بات کر دانی۔

ریاض نے اعلان کیا کہ وہ ماں کی پچھلی ساری خطائیں تو معاف کر سکتا ہے۔ مگر یہ والی۔ وہ باؤلے کتنے کی طرح سردائیں بائیں مار رہا تھا۔ تماشا دیکھنے

کے شائق بھی استا گئے۔ محلے کے ایک بزرگ لقلعیت سے کھڑے ہوئے۔

”ٹھیک ہے۔ تمہاری غیر حاضری میں دو عورتوں کی عقل نے جو بہتر سمجھا دیا۔ اب تم آگے ہونا۔ کما کما گھر بٹھا کر کھلاؤ بیوی کو۔“

کون یا کل عورت ہوگی جس کی روٹی پوری ہوتی ہو تو وہ صبح سے شام تک فیکٹری میں خود کو رگڑے۔ شوقیہ کرنے والی نوکریاں اور بولی ہیں میاں۔

”کیوں بھی ٹریا۔ یہ کہا کر لائے گا تو تم پھر بھی جاؤ گی فیکٹری؟“ بزرگ آر پار دالا مزاج رکھتے تھے۔

ٹریا نے سب کی طرف نظر کی۔ وہ ابھی تک فیکٹری جانے والی سیاہ چادر اور بند جوتی میں آگن کے بیچ چار پائی پر بیٹھی اسے جرم سن رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سستا پارس بھی تھا۔

ریاض کے انداز کی حیرت اور عملیت نے اسے موقع ہی نہ دیا تھا۔ کہ وہ یہ سب اتار کر رکھ دیتی۔ ”امی فیکٹری جاتی ہیں ناں کام پر۔“ انہیں لینے بس آتی ہے۔

بیچ کا جملہ ہی تو باعث طوفان تھا۔ بزرگ سمیت سب کی نگاہیں ٹریا پر تھیں۔ ٹریا نے ساس کو دیکھا جو گریبان میں منہ ڈالے بیٹھی تھیں۔ ٹریا نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ سیاہ چادر اتار دی۔ جوتی بھی اور پارس بھی۔ فیصلہ ہو گیا۔ وہ واقعی شوقیہ نوکری نہیں تھی۔

اس بار ملازمت فوراً مل گئی۔ سب کو لگا ریاض مددہر گیا ہے۔ مگر جتنی فوری ملازمت ملی تھی۔ اتنی ہی فوری چھوٹ بھی گئی۔ جیسے ہاتھ سے دھکی کی گیلی جھوٹ جاتی ہے۔

ٹریا کی فیکٹری سے کمائے پیسوں کا راشن اس نے ڈیڑھ ماہ تک بچھ کر ریکارڈ قائم کر لیا۔ (مگر انہیں گینتربک دالے بے خبر رہے)

فیکٹری جانے کا تو سوال نہیں تھا۔ ساس نے

کہیں سے تھیلے۔ سلائی کرنے کا کام لا دیا۔ سیدی سیدی سلائیاں۔ مگر اتنی محنت کے بعد اتنا کم معاوضہ۔ ریاض نے سراپا۔ ہاں یہ کام ٹھیک ہے۔

ٹریا کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ وہ چوتھا بچہ پیدا کرنے جا رہی تھی۔ ریاض کو خود ہی احساس ہو گیا اس نے بتایا کہ عدالت کے باہر چائے کے کھونٹے کا کام بہت چلتا ہے۔ ٹریا نے اگلی بیچ کر کھوکھا دلوا لیا۔ اور چائے بنانے کے لیے گھر کے تیلے برتن فراہم کر دیے۔

اب آگے اللہ جانے کیا ہوا۔ تیسرے روز عدالت تو دہی کی دہی تھی مگر کھوکھا نادر۔ کے ایم سی دالے اٹھالے گئے تھے یا پہلے سے موجود چائے والوں نے رات درات کھوکھا اٹھا لیا تھا۔

یا پھر۔ ریاض نے خود ہی مال ٹھکانے لگا دیا تھا۔ کیونکہ وہ شغل شغل میں بازی بھی لگاتا تھا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں رہی کہ کبھی بکھار لگائی جانے والی بازی وہ اکثر دیشتر بار جاتا تھا۔

اور گھر میں ٹریا لڑے نہیں۔ فساد نہ ہو کوئی بھی اس کی قسم کا الزام نہ رکھے۔ انوائی کھٹوائی لے کر پڑ گیا۔ دنوں لوگ پُرس دینے آتے رہے۔

بڑے جیٹھ نے راشن ڈلوادیا۔ چھوٹے نے ریاض کی جیب میں پیسے۔ مگر ان دونوں چیزوں کی سب سے بڑی غامی یہ ہے۔

بہی راشن اور پیسے۔ جتنی بھی احتیاط سے استعمال کر دکم بخت ختم ہو جاتے ہیں۔

ریاض سگریٹ بھی پیتا تھا۔ نشہ پورا نہ ہوا تو جسم ٹوٹنے لگا۔ ٹریا کے پاس ٹھیلوں کی سلائی آئی تو ڈبیا مٹکا کر دینا پڑی۔ پہلا سلا بھرتے ہی ریاض کے تخیل کی پرداز شاہین کو مات دینے لگی۔ وہ ٹریا کو خواب دکھانے لگا۔

اس بار وہ پلمبری کے لیے جائے گا۔ اس کے کسی دوست نے بلڈنگ میں ٹھکانا لیا ہے۔ جاگتی آنکھوں کے خواب پلاسٹک کی تھیلی کی طرح ہوتے ہیں۔ اڑتے ہیں اور اڑتے اڑتے کسی کھمبے سے

نکرا کر خُص ہو جاتے ہیں۔ مگر جب تک اڑ رہے ہوں تو بڑا مزہ دیتے ہیں۔ ثریا کو بھی مزہ آنے لگا۔

☆☆☆

زندگی کا سب سے مایوس کن لمحہ وہ ہوتا ہے جب انسان امید چھوڑ دیتا ہے۔

ثریائے بھی چھوڑ دی۔ ریاض کے سدھر جانے کی امید۔ اس خیال کو خیال بد کی طرح جھٹک دیا۔

داوی نے ثریا کے لیے ملازمت کا فیصلہ اس کے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا تھا۔ اس سے

سب زیادہ فلاح اگر کسی نے پائی تو وہ داوی کا بچہ ریاض تھا۔

تھیلوں کی سلائی سے ہونے والی آمدنی اونٹ کے منہ میں زیرے کے صداق تھی۔ سو ریاض کی

فنا خاندان اجازت کے بعد ثریا نے اسکول میں ملازمت شروع کر دی جو ایک شفٹ سے شروع ہو کر دوسری

شفٹ کے اختتام پر جا رہی۔ اور ساتھ ریاض کی ملازمت ڈھونڈنے یا

کرنے کی جھوٹی سچی کوشش یا خواہش کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے کندھے سے گھر چلانے کا بوجھ اتر گیا۔

ثریا کا یہی ہے ناں۔ دو شفٹوں کی تنخواہ کیا کم ہوتی۔ سلیقے سے خرچ کیا کرے۔ وہ بستر پر سوا ہوتا

جب ثریا منہ اندر ہرے گھر سے نکلتی۔ اسے اسکول لگنے سے آدھا گھنٹہ پہلے پہنچنا ہوتا تھا۔

اور پھر دن بھر اسکول کی منزلوں کے چکر۔ ثریا گمن نہ پانی کر وہ کتنی بار اوپر نیچے چڑھتی اترتی تھی۔

اس کی تنخواہ اچھی تھی۔ دو اسکول نیچر زاپے شیر خوار بچوں کو سنبھالنے

کے الگ سے پیسے بھی دیتیں۔ راشن کے ڈبے بھرنے لگے۔ ثریا کا وزن گھٹنے لگا۔ اس کا خیال تھا۔

معاشی آسودگی اس کے دلی قرار و سکون کا باعث ہوگی۔ جب بچے پیٹ بھر کے سویں گے اور پیٹ بھر کے ناشتہ کریں گے۔ تو زندگی کے سارے دکھوں کو وہ

فراموش کر دے گی۔

مگر پیٹ بھرنے کی فکر سے ذرا تسلی ہوئی۔ تو اپنی زندگی پر غور کرنے کا موقع مل گیا۔ دن بھر کا تھکا بدن وہ بستر پر ایسے ڈالتی تھی۔

جیسے گندم کے دانوں کی بھری پوری کا منہ کھل جائے تو دانے اٹھان سے ڈھلوان کی طرف پھیل

سے جاتے ہیں۔ کیا ملازمتی سے۔ کیا ملازمتی سے۔ کیا ملازمتی سے۔

اسے عزیز جان بچوں کی شکلیں بھول جاتیں وہ خود تری کا شکار ہو کر شفٹ سے سانس بھرتی۔

چ تو یہ تھا کہ اس کے برسر روزگار ہونے نے ریاض کے دل در در کر دیے تھے۔ اس کی رہی سہی۔

پردہ بھی جانی رہی۔ وہ ثریا کے کماے تر توالوں کو اس حق سے کھاتا جیسے نان نفقے کی ذمہ داری نکاح تائے

پر ثریا کے فرائض کے خانے میں درج کی گئی ہو۔ اس پر ڈھٹائی کا عالم ثریا کے ہاتھ کے ذائقے

کی تعریف کرتا پھر یہاں تک آ گیا۔ کہ بہت دن ہو گئے تیرے ہاتھ کی نہاری کھائے ہوئے۔ یا شامی

کباب کھائے یا بیریائی، یا۔ یا۔ یا۔ (کاش قسمت بھی انسان کے لیے اتنے

سارے آپشنز رکھ دیتی) شروع میں ثریا فوری فرمائش پوری کر دیتی

تھی۔ لیکن آخر تک۔ ایک دن وہ چیخ پڑی۔ ”اب سے بات کر۔ شوہر ہوں تیرا۔“

”کوئی نہیں ہے تو میرا شوہر۔“ وہ حلق کے بل چلائی۔ ساتھ ہی اس نے اسے سینے پر ہاتھ کے دباؤ

سے پیچھے دھکیلا اور خود مسلسل آگے بڑھتی اسے برآمدے سے آگن میں لے آئی۔

”میں ہوں۔“ اس نے انکشت شہادت اپنے سینے میں ٹھوکی۔ ”میں ہوں اس کا گھر کا شوہر۔ اور بیوی

تو ہے ریاض۔ وہ بھی مذہباً حرام تک حرام بیوی۔ مجھ سے ادب سے بات کیا کر۔ بلکہ نظریں جھکا کر۔

نظر نیچے نہیں تو۔“ اس نے ریاض کے پیٹ میں گھونسا دے مارا۔ ریاض نے نظر تو کیا۔ فیچ کرنا بھی۔ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ پر ثریا نے اس پر بس نہ کیا

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیلتی دردناک سے باہر چھوڑ آئی۔

”دوبارہ ادھر کارخ کیا تو تانگیں توڑ دوں گی۔“ گلی میں تماشاکڑا ہو گیا۔ ریاض پھرے ساٹھ

کی طرح ثریا پر بل پڑنے والا تھا۔ مگر ثریا آج آپے میں نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ ریاض اس کے نزدیک

پہنچ پاتا۔ ثریا نے لکڑی۔ پاپ کا ٹکڑا، چھاؤں پیر کی جوتی۔ جو چیز ہاتھ کی اس پر دے ماری۔

وہ اپنی ذات میں الٹا پل جیسی تھی۔ اس نے کنکر مار مار کے ریاض جیسے ہاتھ کی جان لے لینے کی قسم

کھائی تھی۔ اسے کسی کے بھی دیکھنے دکھانے کی پردہ نہ رہی

تھی۔ مگر جانے کی یا مار دے گی۔ مگر تب ہی اس کی نگاہ اپنے بچوں پر پڑی جو ایک دوسرے سے چپکے حیران

پریشان روتے ہوئے کھینچاتے ہوئے باپ کو دیکھ رہے تھے۔ جو ماں کی چپکلی ہوئی چیزوں

(تھپیاریوں) سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ثریا بچوں کو دیکھنے کے بعد سکت رہ گئی تھی۔

اسٹیل کا گلاس جو وہ ریاض کی ناک پر مارنے کے ارادے سے اٹھائے ہوئے تھی۔ وہ ہاتھ سے زمین پر

جا گرا، اس کا بازو پہلو میں یوں گر اٹھا۔ جیسے کسی نے تلوار کے دار سے شانے سے الگ کر دیا ہو۔

ثریائے پسپائی اختیار کر لی۔ شاید اسی لیے پہلے قصوں میں جنگ کے محاذ پر بچوں کا جانا ممنوع قرار

دیا گیا ہوگا۔ شاید۔ ادھر ریاض آستین الٹ کر بساط بھر کھنی کو موڑ کر

اس زخم کو دیکھنے کی سعی کرتے ہوئے معصومیت لاطمی سے بتا رہا تھا۔ ”کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے بس یہی

کہا تھا بہت دونوں سے پائے نہیں کھائے۔ بہت دل چاہ رہا تھا ثریا اپنے ہاتھوں سے۔“

سب کے سب ہکا بکا رہ گئے۔ پھر سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”بے غیرت۔“ ریاض خوش ہونا چاہتا تھا۔ ثریا اسی خطاب کی سخت تھی مگر اگلے جملے نے اسے بتایا

کہ یہ اسے کہا گیا تھا۔

”اس نے اپنے ہاتھوں سے ہی کھلائے ہیں۔“ مگر بکرے کے نہیں اپنے پائے۔ ٹھڈے مار کے گئی

نہ وہ اسے۔ زبان سے لوگ کچھ بھی کہہ رہے ہوں۔ مگر دل کا کونہ جو سچائی کی میزان رکھتا تھا۔ ثریا کو

سچ سمجھتا تھا۔ کہ یہ تو ہونا ہی تھا۔ مگر آٹھ جماعت پاس ثریا سر پکڑے بیٹھی تھی۔

اس سب کا اس کے بچوں کی نفسیات پر بہت بُرا اثر پڑا تھا۔ اور اسے بچوں سے بے پناہ محبت تھی۔ اسے لگتا

تھا کہ وہ دنیا کی واحد ماں ہے جسے اپنے بچوں سے اتنی شدید محبت ہے۔ اور ماؤں کو بھی ہوگی مگر اس کی

محبت سے کم۔ بچوں کی وجہی سے تو وہ ریاض کے ساتھ تھی۔ بچوں ہی کی وجہ سے تو اس نے آج تک ریاض کے سچ

ہو جانے کی امید کو نہیں چھوڑا تھا۔ ثریا کو لاکھ دوست سمجھا جائے مگر یہ طے ہو گیا

کہ ان دونوں کے سچ رشتے کا احترام ادب لحاظ آج ختم ہو گیا تھا۔ اور اب باقی کی ساری زندگی انہیں

ایسے ہی گزارنی تھی۔ دوسری طرف ریاض نے اسے پکا کاغذ دینے کا

اعلان کر دیا۔ یہ جو شیا بہانہ تھا۔ ہوش بیلتے ہی اسے یاد آ گیا۔

ایسے تو وہ در بدر ہو جاتا۔ گھر ثریا کے نام تھا۔ دنیا کی ہمدردیاں ثریا کے ساتھ تھیں۔ اس نے ثریا

سے معافی مانگ لی۔ اس کے الفاظ داغ انداز ایسے دل موہ لینے والے تھے کہ ثریا نے بھی معافی کے بدلے

معافی طلب کی۔ منٹ کے اندر دونوں نے ایک دوسرے کو

معاف کر دیا۔ زبانی کلامی۔ سچ تو یہ تھا نہ ریاض نے دل سے معافی مانگی تھی۔ نہ ثریا نے معاف کیا تھا نہ

معافی مانگی تھی۔ مگر وہی گھر گرتی ڈیوتا۔ ثریا نے خود سے عہد کیا۔ وہ دوبارہ ایسا نہیں

کرے گی جس سے تماشائے۔ ریاض نے بھی دوبارہ بھی شکایت نہ ہو گی کا

دعویٰ وعدہ کیا۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ پہلا قدم بہر حال ریاض کو اٹھانا تھا۔

دوسرا ثریا کو۔ اور ریاض نے یہ زحمت اسے کبھی دی ہی نہیں۔ جو ثریا کے ہمدرد تھے وہ ثریا کے رد عمل کو اس کے صبر کے دامن کو چھوٹ جانا کہتے تھے۔ اور دوسرے ثریا نے اوقات دکھا دی۔ چار پیسے کیا کمانے لگی مجازی خدا پر ہاتھ اٹھالیا۔ کوئی ٹوکتا۔ ایسی نہیں تھی ثریا۔ باادب خاموش طبع مبر دالی تھی۔

”وہی تو۔ پیسے کمانے والی عورت کی آنکھ سے شرم اتر جاتی ہے۔ شوہر کو تو پھر کچھ سمجھتی نہیں۔ جونی کی نوک پر پھٹی ہیں“

تیسرے کرنے والے کاش ثریا کے دل میں جھانک سکتے۔

ثریا نے عام عورتوں کی طرح کبھی چار عورتوں کی بیچک بجا کر خود کو مظلوم ظاہر کرنے کو کہا ناں نہیں گھڑی تھیں۔ اس کی مصروف اور تھکی ہوئی زندگی میں اس عیاشی کی مجاہدات بھی ہی نہیں۔

”اس کی زندگی کے تین مقاصد تھے۔ پہلا بچوں کو کھلانا۔ دوسرے بچوں کو کھلانا۔ تیسرا بھی بچوں کو کھلانا۔

ہاں۔ آگے وہ انہیں پڑھانا اور معاشرے کا کامیاب فرد بنانا چاہتی تھی۔ ہڈ حرام اور دوسرے بہت سارے حرام کے ساتھ ریاض اب زیادہ ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ پہلے پہل وہ اسے بہلا بھلا کر اس سے پیسے لیا کرتا تھا۔ جھوٹ بچ بول کر۔

پھر اس نے اس کے رکھے پیسوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی۔ ثریا نے جو کس دکھائی تب تھلا کر۔ وہ سلائی مشین لے کر رو پکھر ہو گیا۔ پیسے ختم ہوئے تو گھر لوٹ آیا۔ ”میں کبھی نہ کرتا یہ سب۔ مجھ پر قرضہ ہو گیا تھا ثریا۔“

”کیسا قرضہ۔ گھر کے لیے تو تم کبھی کسی سے نمک کی تھیلی بھی ادھا نہیں لائے۔“ وہ چلائی۔

”مکھو بن کر پتیں ہیں۔“ کرتا ریاض بھڑک اٹھا۔ اس سے زیادہ بلند آواز سے چیخا۔

”سو کام ہوتے ہیں مردوں کے باہر۔ لیکن دین چلتے ہیں اب گھر کی عورت کو کیا کیا ہواؤں۔“

”میں گھر میں رہنے والی عورت نہیں ہوں ریاض۔“ ثریا نے صرف چٹائی تھی۔ بلکہ اس نے چھری اس کی سمت اچھال دی۔ ماتھے کے ٹانگے اس اپنی دانت کی یادگار تھے۔

سارے محلے میں خبر گرم تھی۔ ثریا اکلوتے کمرے اور باندھتی خانے کو تالا لگا کر جانے لگی ہے۔

برآمدے میں پڑا ریاض پانی کو ترس جاتا ہے۔ ثریا بے وقوف تھی۔ برآمدے آنگن اور غسل خانے میں سیکڑوں چیزیں تھیں۔ جو ریاض نے غصے میں آگ بکولا ہو کر ٹھکانے لگا دیں اور پیسے کھرے کر کے چلا بنا۔

اس نے بالٹی ٹب چوکی، پانی رکھنے کے کین کے ساتھ ساتھ جو چیزیں کباڑی کو دے سکتا تھا دیں اور دو مہینے کے لیے غائب ہو گیا۔

ثریا ایسے محل میں بیٹھی لوگوں کے تھمرے سن رہی تھی۔ جیسے بیس برس سے فاج زدہ خاندان کے مرنے پر بیوہ خوشی دم کی ملی جلی کیفیت میں ہوئی ہے۔

اسے بخوبی اندازہ تھا وہ یہ سب چیزیں خریدنے بازار جاتی تو بیڑہ بھر کے پیسے لے جانے پڑتے۔ مگر کباڑی نے تو کباڑ کے مول ہی خریدی تھیں۔ یعنی یہ نقصان ثریا کو معاشی جھکادینے کے بجائے ذہنی جھکادینے کی کوشش تھا۔ جس میں وہ یقیناً کامیاب رہا تھا۔ لوٹا تک نہیں تھا۔

ایسے لگتا تھا وہ بھی نہ واپس آنے کے لیے گیا ہے۔

”اچھا۔“ ثریا صدمے سے ابھرتی وہی بالٹی لوٹے کا صدمہ اس نے ایسے ہاتھ جھاڑے جیسے لپٹی ہو۔ خس کم جہاں پاک۔

مرد وہ اس وقت لوٹ آیا جب بچوں نے ابا پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دلوں کندھے تھیلوں کے بوجھ سے جھکے جاتے تھے۔ چھل مٹھائی کھلونے اور

کپڑے ثریا کبھی اسے کبھی سامان کے ڈھیر کو دیکھتی۔ ”تیرے لیے لال جوز لایا ہوں۔ قسم سے۔“

شانے کے گرد بازو پھیلا لیا۔

ان کے رشتے سے یہ قربت یہ لمحے یہ التفات کب معدوم ہوئے پتا ہی نہ چلا۔

بچے چپک رہے تھے۔ ثریا فرمائش پوری کرتے لال جوز اچھا کر بھی آگئی۔ ریاض کی ماں بھی آگئی۔ ریاض انہیں اپنے نئے کاروبار کے بارے میں بتانے لگا۔ جو بس آسمان کو چھونے والا تھا۔

کاروبار کو زمین پر واپس لوٹنے میں تین مہینے لگے۔ بات پھر وہیں آگئی۔

ایک بار پھر ثریا کے طعنے تھے۔ وہ اسے کوئی تھی۔ گھر سے باہر روکتی تھی۔ ایسے میں اس کے اندر حیوانی طاقت آ جاتی تھی جیسے۔۔۔ اندر سے کنڈی چڑھاتی۔ ریاض خود سے ہی دو چار دن بعد غصے کے اثر جانے کا اندازہ کر کے لوٹ آتا۔ بچے تو باپ کی آواز سنتے ہی لپک کر دروازہ کھول دیتے۔ اگر ثریا سامنے ہوتی تو وہ نظروں ہی نظروں میں بچوں کو تنبیہ کر دیتی۔ دروازہ نہیں کھولنا ایک آدھ بار ریاض نے گلی میں احتجاجا شور مچانا شروع کر دیا۔ حسب معمول لوگوں کے دروازے ٹھنلے لگے۔ مگر خیال ہے ثریا کے کان پر جوں رینگتی ہو۔ وہ اسٹیل کی تار سے پٹیلے مابھتی رہی۔

ریاض کی ماں نے ریاض کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس نے جھٹک دیے۔

”ہٹ جا۔ میری ماں تو ہے ہی نہیں۔ تیرے کانڈ (کام) کی وجہ سے اس (گالی) کی ہمت اتنی بڑھی ہے۔ کہ مجھے گھر سے نکالتی ہے۔ تو نے لگا دیا اس کے نام مکان۔ ورنہ ابھی کاغذ پکڑا دیتا۔

کیا کر لیتی سالی۔ وہ اونچا اونچا بول رہا تھا تاکہ ثریا سن لے۔ اور ثریا نے سن لیا۔ ریاض حاضرین کی رائے انکشی کر رہا تھا۔ ”مجھ کہتا ہوں ناں۔ کیا کر لیتی سالی (گالی)“

ریاض کی گالی ادھوری رہ گئی۔ گھر کا دروازہ کھلنے اور مابھتے پٹیلے کا سارا سیاہ جھاگ دار پانی ”سالی“ نے ریاض کے اوپر اچھال دیا۔ ریاض کا بدن آف ہو گیا۔ پانی نے آنکھوں میں مرچیں بھری تھیں۔ ریاض منٹ کے اندر بھیگی ملی اوہ معاف کیجیے بھگے بلا بن گیا۔ گلی کی عورتوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ بچوں کا جم غفیر البتہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

سنجیدہ مزاج مردوں نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔ جبکہ باقیوں کو مزہ آ گیا۔

ریاض نے کلائی چہرے پر رگڑی اور مفلقات بکتا لگی چھوڑ گیا۔ مجمع چھٹ گیا۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ بچوں نے صبح باپ کو برآمدے میں سو یاد کیا تو حیران رہ گئے۔ ثریا بھی ریاض دیوار پھاند کر آیا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا۔ اسے بخار ہو گیا تھا۔ ثریا سے چائے مانگتا تو صبح صبح طوفان اٹھ جاتا۔ چکراتے سر کے ساتھ خود ہی باروچی خانے میں آ گیا۔ نظروں ہی نظروں میں جانے کی پٹیلی ڈھونڈی۔ پانی ہی بھرا تھا کہ ثریا نے پٹیل کی طرح لپک کر پٹیلی بچھٹ لی۔

”دودھ پتی مفت میں نہیں آتی۔ کہ حرام خوروں کے لیے چھوڑ دوں نکلو میرے باروچی خانے سے۔“ اس نے نا صرف کہا بلکہ نکال کر دم لیا۔ ریاض میں مزاحمت کی ہمت بھی نہیں تھی۔ دبی زبان میں ناسازی طبع کا ہٹانا چاہا۔

”تو؟ ثریا نے۔۔۔ جھکاوے کر سوال کیا؟ تو؟

یعنی وہ کیا کرے اگر طبیعت خراب ہے تو۔۔۔ ثریا کا نرم سرگوشی جیسا دھیمہ لہجہ تجانے کب پاٹ دار ہو گیا تھا۔ جسے کرارے پاڑ پیچنے والے کی آواز بھی کراری ہو جاتی ہے۔

درمیانی گھر میں ثریا کی دیوار کے ساتھ ڈیرہ جھائے بیٹھی داوی کو ساری صورت حال سمجھ میں آ گئی۔ ماں تھیں۔ لپک کر آئیں اور ریاض کو ہمراہ لے گئیں۔ درمیانی بیٹے اور بہو کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ ریاض کو چائے بنا کر دی۔ گولی دی اور اپنی چار پائی پر ڈال

کر رضائی اور ہادی۔

دادی کو ثریا سے دلی ہمدردی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کا مجرم بھی سمجھتی تھیں۔ ضمیر کی عدالت نے ہمیشہ ثریا کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ بھلے سے اس نے کچھ بھی ناحق کر دیا ہو۔

مگر اس کے باوجود دادی کی حیرت جاتی نہیں تھی۔

کر ثریا۔ دراصل بکری کی کھال میں چھپی شیرنی ثابت ہوئی تھی۔ ایسی شیرنی جس کے بچے یا دانتوں سے زیادہ خطرناک اس کی نظر ہوتی ہے۔ جس کو دیکھ لیا پتا پانی کر دیا۔

ساس سے ثریا کے تعلقات بحال تھے۔ سب حیرت کا اظہار کرتے جب وہ ساس کے لیے ثریا کا عزت و احترام دیکھتے۔ وہ انہیں آتا دیکھ کر آج بھی مؤدبانہ انداز سے جگہ چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ دو ہاتھوں سے پانی کا گلاس پیش کرتی۔ چائے ناشتہ پوچھتی۔ یہاں دادی کا کردار والفاظ بھی دنیا کی انگلیاں منہ میں دے دیتے۔

دادی نے ثریا کے گھر کے کھانے پینے (پانی نکال کر) کو خود پر حرام قرار دیا تھا۔ ”پناہ کا کر لانا تو وہ دھڑلے سے بیٹھ کر کھاتی۔ بہو کی کمائی پر کیسے حق جتاؤں۔ اس پر تو صرف اس کے پانچ بچوں کا حق ہے اور اس بیان و فیصلے سے دادی آج بھر سر کئے کو تیار نہ ہوتی تھیں۔

وہ حرام خوراک ہڈی پر پیدا کرنے کی مجرم ضرور ہیں مگر خود حرام خور نہیں۔ بس بات ختم۔

☆☆☆

دادی ناکام ثالث کا کردار ادا کر کے رخصت ہو گئیں۔ تو اما کے لیے ناشتے کی امید ختم ہو گئی۔ وہ راستے میں آتی چیزوں کو ٹھوکر مارتا گھر سے نکل گیا۔ گڑیا کا دل چڑ کر رہ گیا۔ اما بھوکا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی چائے اور پرائے کی چٹکیر کاٹھا کر

بارود جی خانے میں رکھ دیا۔ ثریا چڑے بیچنے پھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر سنگ مرمر سی تختی تھی۔ بیٹی نے ناشتے کو چھوڑا تک نہیں تھا۔

اس کی سوالیہ کرخت نگاہیں بیٹی کے چہرے سے جا ملیں۔

”ایسے ہی دل نہیں چاہ رہا۔ بھوک نہیں لگی۔“

اس نے لہجے کو مقدور بھر سرسری کر لیا۔ ثریا نے اس کا بازو دبوچ لیا۔ ”سب جانتی ہوں دل کو کیا ہوا ہے۔ مفت کی نہیں آتی چینی پتی، جودل نہ چاہنے پر چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ صبح سے شام تک محنت کرتی ہوں تو آنے کا کنتہر بھرتا ہے۔ میرے جیسی ماں کے بچوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔ تم کون سے دل کی کہانی لے کر کھڑی ہو گئیں۔ میرے جیسی ماں کے بچوں کے پاس صرف پیٹ ہوتا ہے۔ جسے بھرنے کے لیے وہ اپنی ہڈیاں گھسائی ہے۔ پھر بھی نہیں بھر سکتی۔“

”میں تھوڑی دیر بعد۔“ اس کی کھسکی بندھ گئی۔

”اچھی طرح جانتی ہوں۔ تھوڑی دیر کو میں۔“

ثریا نے ایسے جھپٹکے سے بازو چھوڑا کہ وہ دیوار سے جا لگی۔ ”اپنے اس حرام خور باپ کے لیے سنبھال کر رکھا ہے ناں۔۔۔ پر آج میں بھی ادھر ہی بیٹھی ہوں۔ رکھے تو قدم ڈراؤ۔۔۔“

ثریا کی زبان گالیاں اگلنے لگی۔ وہ ہر چیز کو کوس رہی تھی۔ ریاض کو۔ اپنے ماں باپ کو۔ دادی تک کو۔ پانچوں بچوں کو اور اپنے نصیب کو۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ ثریا نے تو زمانوں پہلے روتا چھوڑ دیا تھا۔

اور اس وقت بھی وہ باقاعدہ نہیں رو رہی تھی۔ بولتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا مار بندھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ بچکی بندھ گئی۔

گڑیا ساکت رہ گئی۔

وہ باپ کی وجہ سے ماں کے لیے دل میں عناد رکھتی تھی۔

وہ اتنے لوگوں کو جانتی تھی۔ محلے بڑی سہیلوں کے گھر، دونوں بچا تیا کے گھر۔ نہیں ایسی کئی پلید نہیں ہوتی تھی جیسی اس کے باپ کی اس کی ماں کرنی تھی۔

”امی۔“ وہ پھسکا مار کے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی ماں کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس نے اس کے ٹخنے کو چھوا۔ یہ کسی میحا کے دست شفقت جیسا ٹھہراؤ بھرا لہجہ تھا۔ ثریا نے چونک کر بھری نظریں اٹھا کر دیکھا وہ جانتی تھی گڑیا دل سے باپ کی طرف دار ہے۔

مگر ایسا ڈھارس دلاتا کس۔ نہ تو ثریا کی یاں کا تھانہ دادی کا۔ دنیا میں کسی نے ایسی تسلی نہیں دی تھی۔ جیسی اس چھوٹے سے ہاتھ نے دی۔ ثریا کی حیران نظریں تک گئیں۔ لوگ بیٹی کو درد شناس کہتے ہیں۔ تو کیا اس کی بیٹی نے آج اس کے درد کو باپ لیا تھا۔

ثریا کے دل میں عجیب سی خواہش ابھری کہ اس کی بیٹی اسے خود سے لپٹا لے۔ تو وہ ادھی ادھی آواز سے رونے کی برسوں پرانی خواہش پوری کر لے۔

اتنا روئے۔ اتنا روئے کہ شہر میں سیلاب آجائے۔

اور پلک جھپکنے کی دیر ہی تھی۔ اس نے سوچا وہ خود بیٹی سے لپٹ جاتی ہے۔ پہلے دوج کا کیا مطلب۔ مگر اس سے پہلے بیٹی کے جملے نے اس پر ٹھنڈا بخ پانی ڈال دیا۔

”تو ابا معافی مانگ تو رہا تھا ناں۔ کر دیتیں معاف۔“

”معافی۔“ ثریا نے زیر لب دہرایا۔ ”معافی کب۔“

”رات کو جب ابا دیوار پھاند کر آیا تھا۔ پاؤں پکڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔ آپ نے پیردوں سے ہی دھکا دے کر زمین پر گرادیا۔“

ثریا کے آنسو ہی نہیں جسم کا سارا پانی خشک ہو گیا۔ بیٹی کی سوالیہ خفا حیران نگاہیں بدستور تھیں۔ ثریا نے ایسا سانس لیا جیسے سن بھر کی پوری شانوں سے اتاری ہو۔

”وہ معافی نہیں مانگ رہا تھا گڑیا۔“ اس کی آواز کی خشکی صدیوں کے ستر کا قصہ کہتی تھی۔

”نہیں مانگ رہا تھا میں نے خود دیکھا۔“ وہ دروازے کو بولی۔

کرب کی شدت سے ثریا نے منہ پھیر لیا۔ ”معافی نہیں مانگ رہا تھا۔ وہ تو۔“ اس نے زہر لب کیا۔

ثریا نے بیٹی کی آنکھوں میں اپنے لیے انکار دیکھا۔ بے اعتنائی، بے یقینی اور غصہ۔

ثریا چکر کر رہ گئی۔ وہ تیرہ برس کی بیٹی کو کس طرح وضاحت دے سکتی تھی۔ کہ اس کا باپ معافی نہیں مانگ رہا تھا۔ وہ یہ وضاحت بھی نہیں دے سکتی تھی۔

ہاں ایک وقت آتا جب اسے خود معافی کا مطلب سمجھ میں آ جاتا لیکن ابھی کے لیے وہ کیا کرے۔

آج سے کئی سال پہلے۔ جہاں آج گڑیا کھڑی تھی۔ وہاں بھی وہ کھڑی تھی اور جہاں وہ بیٹھی تھی۔ وہاں ثریا کی اپنی کی ماں۔

معاملہ برعکس تھا۔ مگر غصہ، ہٹ دھرمی، بے یقینی سب ایسا ہی تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ سالوں پہلے اس نے بھی اپنی ماں کے آگے سوال رکھ دیا تھا۔ اعتراض، جڑ دیا تھا۔ سالوں پہلے۔

آج اس کی بیٹی اس سے متنفر تھی۔ کل وہ اپنی ماں سے متنفر تھی۔

دونوں کے درمیان وہ تنازعہ ایک ہی تھا۔ ابا، ایک وہ جو گڑیا کا ابا تھا اور دوسرا ثریا کا ابا۔

آج گڑیا بیٹی تھی اور کل جب ثریا خود گڑیا تھی۔ تو یہ دو بیٹیوں کی کہانی ہو گئی۔ نہیں۔ یہ دو ماؤں کی کہانی بھی تھی۔ اور وہ باپ بھی۔

جو ایک دوسرے کا الٹ دکھائی دینے کے باوجود اندر سے ایک دوسرے کے جیسے تھے۔

آج گڑیا کو ماں کا رویہ، باپ کے لیے پسند نہیں تھا۔ کل ثریا کو بھی ماں کا رویہ اپنے باپ کے شایان شان نہیں لگتا تھا۔

وہ زیادہ کا حق تھا جبکہ اس کی ماں۔

وہ گالیاں ایسے سنتی تھی۔ جیسے وہ اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہا ہو۔ وہ جس جوتے کو اس کے

منہ پر اٹھا رہا تھا۔ زمین پر گر کر اس کی ماں ہی کو وہ جوتا اٹھا کر واپس پیش کرنا پڑا تھا۔ کہ اگر وہ ایک مارنا چاہے تو دل نہ بھرا ہوا ہوتا۔

بیوی بچوں پر کالم گلوچ کے بعد شراب نوشی۔ اور جسم ”نوٹی“ بلکہ بہت ساری نوشیاں۔ اس کی جانے والیاں تھیں۔

جیب گرم ہوتی تو پہلو گرم کرنے کو کسی کے بھی در پر جا کر پڑ جاتا۔ جیب خالی ہوتی تو بیوی کی صورت پر انگٹا کرنا پڑتا۔ یہ کڑوا گھونٹ پینے کے بعد وہ بیوی کو دھن کر رکھ دیتا۔ ”تو پیے ہی منحوس عورت، مال میں برکت نہیں رہنے دی۔ رونی صورت۔“

کما تادہ خوب تھا۔ اڑاتا بھی خوب۔ کوئی اسے بتاتا کہ جس مال کی رو نمائی کو کھوں چوباروں کی دہلیز پر کی جائے اس میں برکت کیسے ہوسکتی ہے۔ بچے کچھ پیسے بیوی کے منہ پر مار دیتا۔ کہ وہ گھر کا خرچ چلائے اور اس پر اسے روکھی سوکھی کی عادت بھی نہیں تھی۔ ماں پتلے شورے میں روٹیاں بھگو کر بچوں کو کھلائی اور بھنے مسالے کے گوشت کو ننگے کے بعد کچا رہ جانے کی شکایت پر بیوی کی چوٹی کس دیتا۔

اسے رتیا کی ماں سے بڑی شکایتیں تھیں۔ ایک تو وہ کم صورت اور پر سے رونی۔ سونے پر سہا کہ اپنے جیسے منحوسوں کی لائن لگا کر کھڑی تھی۔ اسے بچے زہر لگتے۔ جب وہ کھانا کھاتا تھا۔ ندیدوں کی طرح دیکھتے تھے۔

”ماں نے تیر نہیں سکھائی۔“

باپ کے بہن، بھائی بھی اس کی بے سکون زندگی کی وجہ ماں اور ماں کے پیدا کیے بچوں کو گردانتے تھے۔ سسرال میں بھی وہ جونی کی نوک پر دھری تھی۔

رتیا نے سنا، ماں کا پیچھا کمزور تھا۔ اسی لیے باپ اتنا شیر ہو گیا تھا۔ رتیا سوچنے لگی۔ اگر ماں خود کو مضبوط کرے۔ وہ ماں کے ہاتھ کیوں نہیں پکڑ لیتی۔ آخر وہ کیوں جیتی ہے۔

تھپڑ کے نشانوں والے گالوں کو دوپٹے سے ڈھکے وہ باپ کے کپڑے استری کرتی۔ جونی کو پالش کرتی، بلکہ بیروں کے لباس بھی لاکر دیتی۔

اور بدلے میں ایک ٹھوکری بھی پڑ سکتی ہے، یہ اس کے مزاج پر منحصر تھا۔ اچھایا خراب.....

رتیا کو جو بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کم گو تھی۔ مگر جب بھی بولتی.....

”آپ نے پہلے دن ہاتھ روکا ہوتا نا تو.....“

”آپ معاف کرنی کیوں ہیں۔ رات کو بیٹی ہیں اور صبح اٹھ کر خدمت پر جت جاتی ہیں۔“

ماں کا سر جھک جاتا۔ وہ بیٹی سے کیسے کہتی کہ وہ اپنی غلط فہمی دور کرے۔ باپ نے معافی مانگی کب..... باپ کو مانتے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جھین لینا جانتا تھا۔

”اگر اس کے ساتھ ایسا کبھی ہوا تو وہ تو ہاتھ توڑ کر دوسرے ہاتھ میں دے دے۔“ ماں نے رتیا کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”اللہ نہ کرے۔“ اس کا چہرہ دشت زدہ اور آنکھیں اٹل پڑی تھیں۔ ”جو رتیا کا نصیب ماں جیسا نکلتے۔“

رتیا شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لیکن شادی ہی واحد جائے فرار تھی۔ وہ اس گھر سے نکل کر ہی باپ سے چھٹکارا حاصل کر سکتی تھی۔ سو اس نے شادی کر لی۔ ریاض اس کے باپ سے بالکل الگ تھا۔ تو یہ اتنا محبت بھرا رشتہ ہے۔ لاڈ پیار، ناز و داد، روشنا مٹاتا..... جب وہ جھوٹ موٹ روٹھ جاتی۔ اور جب ریاض اسے سچ سچ مناتا، کبھی سلجھنے کے بجائے اس کو مزہ پر آ کر بری طرح اچھڑاتی۔

مگر شادی کے نو سال بعد رتیا کو ہٹا لگا۔ ضروری نہیں مارتا دھاڑتا، کالم گلوچ کرتا، مرد ہی برا ہو۔ ناقابل برداشت ہو۔ بالوں میں گہرے لگا کر دونوں ہاتھوں سے معافیاں مانگنے والا مرد بھی بہت برا ہو سکتا ہے۔

رتیا کو یہ بھی پتا لگا کہ عورت معاف کر دینے پر

اپنی مجبور کیسے ہو جاتی ہے۔ وہ ریاض کو معاف کر دیتی تھی۔ کیا کرے بے چارہ نوکری ڈھونڈتا تو ہے۔ اپنی مشکل سے ملتی ہے۔ ریاض کہتا کسی نے بندش کر دادی ہے۔ لگی لگائی چھوٹ جاتی ہے۔ تو دلچسپی اور پریشان ہوتا تھا وہ.....

رتیا چاروں قلم پڑھ کر پھونکتی۔ کھانے سے جی اچاٹ کر کے بیٹھے ریاض کے منہ میں نوالے بھی ڈالے اس نے..... ایسے ساتھ کا یقین دلایا۔ مستقبل کے اچھے خوابوں کی اڑاتی پتنگ کی ڈور کو ڈھیل دینے ریاض کے پیچھے کھڑی رہتی اور ہر بار معاف کر دیتی۔

”مرد کی حیلہ بازی سے عورت نہیں جیت سکتی۔ کچھ تیرے باپ سے ہوتے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ پر عورت کو ذلیل کرنے والے..... اور کچھ ریاض سے ہوتے ہیں رتیا..... چوہ، جزیں کاٹنے والے وہ

تجھے اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے اور دکھ اس چیز کا ہے۔ تجھے پتا نہیں چلتا۔ عورت کا مسئلہ یہ ہی ہے، اسے پتا نہیں چلتا۔ اب تو یہ سوال نہیں کرے گی تاکہ ماں تو باپ سے ملتی کیوں ہے۔ پایہ کہ ہاتھ پکڑ کر توڑ کیوں نہیں دیتی۔ ہاتھ توڑنا اتنا آسان ہوتا تو..... اب تک تو ریاض کے شیاخی کارڈ پر ٹوٹے ہاتھ کی علامت لگ جانی چاہیے تھی۔ اس کا نام بھی بدل جانا چاہیے تھا۔ ریاض ٹنڈا.....؟“

ماں نے طعنے نہیں مارے تھے، بتایا بھی نہیں تھا اور اکسایا بھی نہیں تھا۔ مگر رتیا کو وہ رتیا یاد آتی۔ جس کے ہوجانے کا وہ دعا کیا کرتی تھی کہ اگر کبھی ایسی صورت حال آئی تو وہ کیا کرے گی؟

تو پھر رتیا وہ رتیا بن گئی۔ جس سے اس کی گڑیا تنہر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

رتیا من من کے قدم اٹھائے گڑیا کے نزدیک آ بیٹھی۔ گڑیا کی آنکھوں میں حیرت کے بعد شہوہ اور آخر میں انجینی تاثر آ کر ٹھہر گیا۔ وہ ماں کو نظر انداز کر کے بستر سینے لگی۔

رتیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گڑیا نے ایک پل کی

حیرت کے بعد اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر رتیا نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھی اپنی ماں سے ایسے ہی خفا رہا کرتی تھی۔ وہ کیوں معاف کر دیتی ہے اس کے باپ کو..... آج اس کی بیٹی کہہ رہی تھی۔ وہ کیوں معاف نہیں کرتی اس کے باپ کو..... دونوں سوال ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے۔ مگر کہانی کا پس منظر اور کردار ایک سے تھے۔ بے حس مرد..... اور بے بس عورت.....

”تمہیں برا لگتا ہے..... جو میں کرتی ہوں تمہارے باپ کے ساتھ؟“ وہ کہنا تو نہ جانے کیا چاہتی تھی، منہ سے یہ ہی نکلا۔ گڑیا نے چونک کر ماں کو دیکھا اور نظر جھکا لی۔

”تمہیں میں غلط لگتی ہوں نا؟“

اس بار گڑیا نے نظر اٹھائی تھی اور سر کو اشارات میں ہلایا تھا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں لمبے لمبے ہو گئی تھیں۔ رتیا نے ٹھوک لگا اور بیٹی کو سینے سے بچ لیا۔ وہ اس کے بالوں کے بے آواز بوز سے لے رہی تھی۔

”میں آج کے بعد اپنے لیے دعائیں کروں گی گڑیا۔ صرف تیرے لیے..... اللہ کرے تجھے زندگی میں بھی ایسے سوالنامے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تیرا نصیب، تیری ماں اور نانی سے بالکل الگ ہو گڑیا..... بالکل الگ۔“

رتیا کی دعا خود کلامی میں ڈھل گئی اور اس کی ہانہوں کے شکنجے میں کسی گڑیا کسانے لگی۔

ایسے ماں سے ان دعاؤں کی کہیں، اس تلی کی ضرورت تھی کہ وہ اپنا کو معاف کر دے گی اور دوبارہ کبھی ابا کو بے عزت نہیں کرے گی۔

اس سوال کی غلطی بھی ہنوز بھی کہ رات جب ابا معافی مانگ رہا تھا تو ماں نے معاف کیوں نہ کیا۔

بلکہ انا ماں صاف مگر گئی کہ وہ کوئی معافی نہیں تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کتنے پیار سے ابا گنت گنت بار ہاتھوں سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

تیرہ برس کی گڑیا آج تینیس برس کی بھرپور جوان عورت تھی۔ بیٹے کو کو لے کر لگائے بیٹی کی انگلی پکڑے گزرنے والی ہر آنکھ کو اپنی سمت متوجہ کرتی وہ بہت دیکھ بھال کر سڑک پار کر کے پارکنگ میں کھڑی اپنی کار کا لاک کھول رہی تھی۔ ہلکی سی جینز پر سیاہ کرتا دو پٹا اوڑھے..... آنکھوں پر لگے گاگلز نے تاثرات اور مرکز نگاہ کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود لا شعوری طور پر اس کے کان اپنے شوہر کی آواز سننے کے منتظر تھے۔ آواز تو نہ آئی، وہ سامنے سے آتا دکھائی دے گیا۔ چابی کو اچھالتا، خود کو لاپرواہا ہر کرنے کے لیے ہونٹ سیٹلے دے سیٹی پر کوئی دھن چھیڑے ہوئے تھا۔

وہ ایسا نہ بھی کرتا تو وہ جانتی تھی، اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ جب ہی تو آج ایسا دن طلوع ہوا۔ جس میں وہ دونوں الگ الگ گاڑی کے سوار ہو کر اپنی نئی منزل کی طرف چلے تھے۔

لیکن نہیں مرد کے لیے نئی منزلیں ہو سکتی ہیں۔ عورت کے لیے وقت ٹھہر جاتا ہے، دو بچوں کے ساتھ اس کی زندگی نے پڑاؤ ڈال دیا تھا۔

وہ دوست کی بات سننے سننے غم زدہ سا دکھائی دینے لگا۔ وہ دونوں اسے اور اس کے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔ دوست اپنے تئیں اسے مبر کرنے باہمت رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ فاصلہ بہت زیادہ تھا، اس کے باوجود وہ جانتی تھی۔

اسے کوئی ایسا غم نہیں پڑا کہ جس کے لیے کندھا دیا جائے۔

اس کی تو مانو جان چھوٹی..... بیوی سے..... اور اس کے پیدا کیے بچوں سے، ثریا کی بیٹی کے حق میں کی گئی دعا میں قبول نہیں ہوئی تھیں۔

گڑیا کا شوہر گڑیا کے نانا اور باپ دونوں کی خصوصیات رکھتا تھا۔ بلکہ دیکھا جائے اس کی شخصیت زیادہ متشور تھی۔ گڑیا مردوں کی دو قسموں سے واقف تھی اور اسی سے پناہ مانگتی تھی۔ خدا دکن کو بھی

بجائے۔ بے وقوف دشمن کی فکر پالنے کے بجائے اپنی پائی تو شاید بچاؤ ہو جاتا۔

ثریا جیسی ماسی کے بچوں کے لیے اس کے ہائی فائی اسکول میں جگہ نہیں تھی۔ مگر ثریا کی محنت شرافت اور منت ساجت سے پرنسپل نے گڑیا سمیت اس کے دو بیٹوں کو کلاس کی آخری نشستوں پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

اور ایک سال بعد رزلٹ کے روز اسی پرنسپل نے گڑیا کو تمام کیسپس میں پوزیشن لینے کا میڈل پہنایا تھا۔ گڑیا کے دو بھائیوں نے بھی پرنسپل سمیت سب کو حیران کر دیا۔ غریب جھانٹش ماں کے خیرات پر پڑھنے والے بچوں کو اعزاز سے نوازا جا رہا تھا۔

میٹرک میں گڑیا نے پوزیشن لینے کے حکومت کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اس کا آگے کا تعلیمی خرچا اٹھانے کا اعلان کر دیا جائے۔

دس پانچ پیسے کے جیب خرچ کو جمع کرنے والی گڑیا، میٹرک بن گئی۔ زمانہ کلاسیک بن کر آیا تھا۔ وہ بلا کا پرکشش تھا۔ اوپر سے جامہ زیبی پر چرب زبانی کا تزکرہ.....

گڑیا نے شادی کا فیصلہ فوراً نہیں کیا۔ اس نے اپنے حساب سے خوب جانچا، پرکھا، پھر اس کے بعد.....

اور دراصل بعد ہی تو مسائل کی جڑ ہوتا ہے۔ بعد ہی کا تو پتا نہیں ہوتا۔ بعد کا پتا ہو تو زندگی میں کچھ غلط ہو ہی نا..... زمانہ سونے کی طرح چمکتا تھا۔ یہ طبع اترنے میں کچھ وقت لگا۔ مگر تب تک گڑیا کے قدموں کی زنجیر اس کی اپنی گڑیا بن چکی تھی۔

زمانہ کی انذار، ذرا سی بات سے ہرٹ ہو جاتی تھی۔ اس لیے ملازمت کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ تو وہ اس مشکل سے جان چھڑانے میں دیر نہ کرتا۔ گڑیا، ماں جیسی بے وقوف نہیں تھی۔ اسے خوب تجربہ تھا مردوں کے بہانوں کا..... شروع میں زمانہ بھی اس کی آمدنی سے یوں لاقطع رہتا تھا۔ جیسے مٹی کا محرم عورت سے..... لیکن گڑیا کیا کرتی،

جب مہینہ پورا ہونے پر فلیٹ کا کرایہ اور دیگر تمام بلز کے ساتھ چکن کے تمام خالی ڈبے سر پر آ پڑے۔

اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس مصیبت سے نکل سکتی تھی۔ مہاں، بیوی سا مچی ہیں۔ مشکل میں وہ کام نہیں آئے گی تو اور کون..... زمانہ اس کا احسان مند تھا۔ وہ جلد ملازمت تلاش کرے گا۔ گڑیا کا دل ڈوب کر ابھرا، ابا بھی ایسے ہی کرتا تھا۔

لیکن خیر..... زمانہ کو ملازمت مل گئی۔ اگلے مہینے سب چیزیں زمانہ نے بحسن و خوبی پوری کر دیں۔ (تو زمانہ ابا سا نہیں تھا۔) لیکن اگلے ماہ اس کے پاس اسے نی ایم کے اندر ڈاکوؤں کے آجانے کا دل خراش واقعہ تھا۔ گھر کا خرچ گڑیا کو چلانا پڑا، بلکہ زمانہ کا غم غلط کرنے کے لیے اس نے اسے اچھی خاصی رقم بھی دی۔

زمانہ چرب زبان تھا۔ اس کے دوستوں کی وسیع تعداد تھی۔ جن پر وہ خرچ کرتا تھا۔ دوستوں میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی کثیر تعداد میں تھیں اور کچھ بہت خاص بھی.....

گڑیا کو نانا یاد آئے۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ پہلے عورتوں سے دوستی کو بے راہ رو دی کہا جاتا تھا۔ نئے زمانے میں یہ ماڈرن ازم تھا۔ درکنگ ریلیشن شپ..... تو کام تو پھر وہ بھی کرتی تھی۔

زمانہ اپنی ذات پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اس نے گڑیا سے کہا کہ وہ تو خود کماتی ہے۔ اسے بھلا اس کے پیسوں کی کیا ضرورت.....

”لیکن میرے نان نفقہ کی ذمہ داری تمہاری ہے۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”نان نفقہ..... نان تو آئی تھنک دس روپے کا ملتا ہے اور یہ نفقہ کیا ہے؟“ انگلی میڈیم کا پڑھا زمانہ اچھ کر دیکھ رہا تھا۔

”اٹس مین کی میری ہر ضرورت کو پورا کرنا تمہارا فرض ہے۔“ وہ چپا چپا کر بولی۔

”اوہ..... تو میں نے کب انکار کیا۔ مگر ڈیر تم.....“

دیکھو میں ہاتھ صاف رکھتا ہوں۔ ہا ہا.....“

”شادی کرنے کے بعد بھی اگر مجھے خود کما کر خود پر خرچ کرنا تھا، تو مجھے شادی کا مٹنا پالنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ وہ حلق کے بل چاتی تھی۔ بال سنوارنا زمانہ سناکت ہو گیا۔ وہ آئینے سے اس کا لالہ بھسوکا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ایک دم گھوما اس نے گڑیا کی ٹھوڑی دبوچ لی۔

”آواز نیچے.....“ وہ مچھلی کی طرح تڑپا۔

”مجھے چھوڑ د زمانہ۔“ وہ اسے پیچھے دھکیل دینا چاہتی تھی۔ مگر زمانہ نے اسے بیڈ پر دھکا دے دیا۔ وہ تیزی سے اٹھنا چاہتی تھی۔ مگر زمانہ ایک ٹانگ بیڈ کے اوپر رکھ کر اس پر جھک آیا۔ جو کہنیوں کے بل سر اٹھائے ہوئے تھے۔

”میں نے کہا نا آواز نیچے۔“

”نہیں ہوگی آواز نیچے۔“ وہ کرنٹ کھائے انداز سے اچھلی اور نکل جانا چاہا، مگر زمانہ نے اس کا ہاتھ پیچھے سے جکڑ لیا۔

اور دوسرے ہاتھ سے تھڑکال پر دے مارا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز.....

”مجھے معاف کر دو.....“ وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور وہ ایک گھٹنا موڑے اس کے سامنے زمین پر ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔ وہ اتنا شرم سار تھا کہ گڑیا کو اپنی نظریں جھکا کر دیکھ رہی تھی۔

”پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“

”میں آفس کیسے جاؤں گی زمانہ..... میرے گال پر نسل ہے۔“

”اف یہ عورت..... نسل کے پیچھے دھن بھی تو ہوتی ہے۔“ (آخر عورت کو اتنی قوت برداشت کیوں دی گئی۔)

”اوہ میری جان!“ زمانہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”آئی ایم سوری۔“ اس نے اس کی پیشانی کا بوسا لیا۔ ”میں تمہاری لیو دے آتا

ہوں۔ کہہ دوں گا۔ آں۔ آں۔ آں۔ ہاں۔
بے بی کو بخار ہے۔ اس لیے تم غیر حاضر ہو۔
ہاں۔۔۔۔۔ وہ اس کی رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا
چاہتا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز سے ہاں
میں ہاں ملانے لگی۔
اسے اس دقت بالکل یاد نہ آ یا کہ نانی۔۔۔۔۔ نانا کو
معاف کر دیا کرتی تھیں۔

☆☆☆

اگلی بار اس کے اے ٹی ایم سے رقم اڑانی گئی۔
ایسے یہ جانتے میں ڈرا دی رہی کہ یہ کس کی کارستانی
تھی۔

زمان پہلے مانا نہیں۔۔۔۔۔ پھر اس نے اپنی بے
پناہ مجبوری بتائی۔
”تم مانگ لیتے۔“ وہ اصول کی بات کرتی
تھی۔

”ہنہ۔۔۔۔۔“ وہ چیرخ کر کھڑا ہوا۔ ”مانگ لیتے
جیسے تم دے دیتیں۔“

”تو تم نے سوچا چوری کر لوں۔“
”ڈونٹ کال می چور۔“ وہ چلا یا۔
”چور کو چور نہیں کہوں تو کیا سعد کہوں۔۔۔۔۔“
آواز سے بھی بلند کرنا آتی تھی۔

”سعد۔۔۔۔۔ وہ جو تمہارا آفس کو لیک ہے۔“ وہ
غزیا۔

”میں نے محاورہ بولا ہے۔“ وہ چونک کر بولی۔
”اوہ ہو۔۔۔۔۔ محاورہ بھی سعد والا کیا۔“

”تم اپنی لمٹس کر اس کر رہے ہو زمان۔۔۔۔۔“
اس کی رگوں میں شریا کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس نے بنا
سوچے سمجھے ایک زور کا ہاتھ اس کے شانے پر مارا۔ وہ
اسے دھکیل دینا چاہتی تھی۔ مگر وہ تو ازن پر فرار نہ رکھ
سکا۔ دیوار سے لگا اور اگلے بل وہ اسے جانوروں کی
طرح پیٹ رہا تھا۔

”شوہر پر ہاتھ اٹھاتی ہے سالی۔“
گزیا کو یاد آیا۔۔۔۔۔ ابا پٹیا خاموشی سے تھا۔

”اف مزدور۔۔۔۔۔ اور مزدوروں کی قسمیں۔۔۔۔۔ اور
قسمیں۔۔۔۔۔ اسے دھتک کر رکھ دینے کے بعد وہ گھر
سے چلا گیا۔

نیچے پارکنگ میں دو ٹین اینج لڑکیاں کھڑی
تھیں۔ بیوی کو مارنے کو نئے کے عمل میں اس کے
جیل سے جسے بال بکھر کر ماتھے پر پڑے تھے۔
لڑکیوں نے تسلیم کیا۔ وہ اس بے ترحیب حلیے
میں بھی بہت ہندس لگ رہا تھا۔ (زمان نے ان
لڑکیوں کو دیکھ کر مسکراہٹ بھی اچھالی۔) اور اندر
گزیا۔

اسے ماں کے ہاتھوں باپ کی یہ بے ادبی کھلتی
تھی۔ اپنے شوہر کے ہاتھوں اپنی بے ادبی نے اسے
گنگ کر دیا تھا۔ اس نے کانٹ میں قلعہ بایاں بابی
اپنی گڑیا کو دیکھا۔

”کل کو اس کی بیٹی کس کا ساتھ دے گی۔ ماں کا
یا باپ کا۔“ اپنی دھتکتی بڈیوں پر کھڑ کرتے ہوئے اس
نے عہد کیا۔ وہ برداشت کرے گی۔ وہ اپنی بیٹی کو
ایسے سوالات میں الجھنے نہیں دے گی۔ کیسے بھی
وہ گھر کے ماحول کو بہتر بنائے گی۔

کر کے۔۔۔۔۔
اور چونکہ زمان اس پر لعنت بھیج کر گیا تھا، تو گزیا
کو کوئی آئیڈیا بھی نہ سوجھ سکا کہ وہ آفس سے چھٹی کا
بہانا کرے تو کیا۔

سو اس روز تمام کو لیک حیران رہے کہ میم نے
اتنا تیز میک اپ کیوں کر رکھا ہے اور وہ بلاوجہ مسکرا
کیوں رہی ہیں۔

☆☆☆

اگر زمان گھر کی بلنگ کو پورا کر دیتا تو بچوں کے
مہنگے دودھ کے ڈبوں میں ڈنڈی مار جاتا۔۔۔۔۔ احتجاج
پر اس کے جواب سے گزیا کا تن بدن پھٹنے لگا۔ وہ
جی تو کماتی ہے۔ بچے اس کے بھی تو ہیں۔ خرید
لائے دودھ اور پینچر، اس میں بظاہر حرج نہیں تھا۔

اسے بچے جان سے پیارے تھے۔ مگر پھر باپ
کا کردار کیا ہوا۔ بس وہ پیدا کرنے کا حصہ دار تھا۔

بلکہ پیدا کرنے کی بھی خوب رہی۔ مرد کو اگر بچہ
باقاعدہ پیدا کرنا پڑ جاتا تو دنیا بے نسل انسانی کب کی
معدوم ہو چکی ہوتی۔

ایک پڑھا لکھا خوش شکل، خوش گفتار شوہر، گزیا
کی جان کا آزار تھا۔ گزرے وقت نے اسے اس کے
تمام سوالوں کے جواب دے دیے تھے۔ اس کی سمجھ
میں آ گیا تھا۔ ابا اس رات معافی نہیں مانگ رہا تھا۔
ایسی بہت سی معافیاں زمان اس سے ہزاروں بار
مانگ چکا تھا۔ بعض میں اس نے معاف کر دیا اور
جب نہیں کرنا چاہا تو زمان کو معافی بھی زبردست لینا
آتی تھی۔ اس کی یہ جال کہ وہ معاف نہ کرے۔

کیسی دو ٹولی زندگی جی رہی تھی وہ۔۔۔۔۔
کیوں۔۔۔۔۔ وہ نانی کی طرح بری طرح پٹ کر کالم
گلوچ سن کر بھی تابعدار بیوی کا کردار نہیں نبھاسکتی
تھی۔ یہ بہت مشکل تھا۔

لیکن وہ اپنی مانی جیسی بھی نہیں بن پائی تھی کہ
حادی ہو جاتی۔ ایسی کوشش کو تو زمان نے پہلے ہی وار
میں ناکام کر دی تھی۔

یا پھر صبر و ضبط کر کے زمان کے اچھا ہونے کی
دعا میں گرے، وہ وظیفہ۔۔۔۔۔

زمان نے نہیں سدھ رہا تھا۔ اس نے اس کی
کمائی بھی کھانا تھی اور آنکھیں بھی دکھانا تھیں۔

تو اتنا پڑھ لکھنے کے بعد ایک اعلا عہدے پر
ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی ماں اور نانی جیسی مظلوم و
بے بس عورت بن رہی۔

نانی نے خاموش رہ کر۔۔۔۔۔ اور ماں نے آواز د
ہاتھ اٹھا کر دراصل اپنی ہٹا کی جنگ لڑی تھی۔ دونوں
خود کو اپنے اپنے انداز کی کامیاب عورتیں سمجھتی تھیں۔
مگر وہ خود کو کہاں کھڑا کرے، کیا نانی کی طرح
جٹی رہے۔ یا ماں کے جیسی بن جائے۔ تیسرا کوئی
راستہ۔۔۔۔۔

☆☆☆

دونوں ایک ہی گھر کے الگ الگ کمروں میں
رہ رہے تھے۔ وہ بینک جانے کے لیے تیار ہو رہی

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرنے والے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہلکا ہوتا ہے۔
- بالوں کو صبر و تاب دے گا۔
- مردوں، بچوں اور بچوں کے لئے
- کیسا صلیب۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت: 1500/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جلی بولوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری
کے مراحل بہت مشکل ہیں۔ ہر جلی بولہ ہزاروں جلی بولوں سے ہے۔ ہر ہزار میں
ایک دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستیاب نہیں ہے، ایک
بڑی کی قیمت صرف 900/- روپے ہے، دوسرے شہر سے آ کر
کر جیٹر بائیس سے مگر اس کی رجسٹری سے مگر اسے والے جلی آؤ اس
حساب سے بھرا نہیں۔

- 2 بٹلوں کے لئے 360/- روپے
- 3 بٹلوں کے لئے 600/- روپے
- 6 بٹلوں کے لئے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ایک ٹریج اور پیکیج ہارڈ شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا ہند:

بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایف۔ جٹ روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان چیکوں
سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایف۔ جٹ روڈ، کراچی
کٹہہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اورنگزب مارکیٹ، 32735021
فون نمبر

دہ راستہ اپنایا جو اسے شریعت نے عطا کیا تھا۔

ہاتھوں اور پیروں سے مارنے والے نانا آخری دو برس فاج کے زیر اثر بستر پر جا پڑے۔ منہ بھی میڑھا ہو گیا۔ نانی بوڑھے لرزے ہاتھوں سے خدمت کرتی تھیں۔ موتی زبان سے معافی مانگتے..... پھر اس کے بعد ساری رات اذیت سے سر بچھتے..... کیوں کہ نانی ہر بار معاف کر دیتی تھیں۔ ان کے بندھے ہاتھوں کو اپنے ماتھے سے جوڑ کر دل کی گہرائیوں سے یقین دلاتیں..... کہ ان کے دل میں کوئی ٹھکی ہے ہی نہیں..... تو وہ کس بات کی معافی مانگتے ہیں۔ انہوں نے کیا، کیا ہے؟

نانا آخری لپکی تک نہیں بتا پائے کہ نانی کا معافی کا اعلان ایسی اذیت دیتا ہے کہ حد نہیں..... اگر وہ یہ کہہ دیں کہ جاؤ نہیں کیا تو شاید کچھ سکون ہو۔

تو نانی نے معاف کر کے بدل لے لیا۔

اور ثریا کی گڑیا کو وہ بھیجی برستی رات یاد آتی ہے۔ جب ابا..... ماں کے چہرہ کو معافی مانگ رہا تھا اور ماں نے معاف نہیں کیا تھا۔ پیروں کو ایسے چٹا کر ابا کو لوہوں کے بل زمین پر جا گرا۔

ثریا کی گڑیا نے خلع لے کر اپنے شوہر کو ایسے ہی ٹھوکر مار کے خود سے دھڑکیا تھا۔

تین ادوار کی تین عورتوں نے ایک جیسی صورت حال کو اپنے اپنے حساب سے جھپٹا۔

تا بعد اداری و درگزر سے..... برداشت و ہمت سے.....

نفرت د بے زاری سے..... دھتکار کر مار کر..... اور چھوڑ کر..... راستہ بدل کر.....

یہ فیصلہ اب آپ خود کیجئے کہ کس کا طریقہ درست تھا۔ ثریا کی ماں..... ثریا کا..... یا پھر ثریا کی گڑیا کا.....

بس ایک لمحے کو خود کو ان تینوں کی جگہ پر رکھ کر دیکھنا ہوگا۔

تھی۔ اسے بیٹی کو اسکول..... اور بیٹے کو ڈسے کیرسینٹر چھوڑنا تھا۔ جب بیل کی آواز پر زمان گیا، لوٹا تو اس کے ہاتھ میں لٹاف تھا، گڑیا کے اعصاب تن گئے۔ یہ خلع کا ٹوش تھا۔

”تم..... تم..... تمہاری اتنی بچال.....“

”مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میں نے تھانے میں درخواست بھی جمع کر داری ہے کہ میری جان کو تم سے خطرہ ہے۔ یا یہ کہ مجھے کسی بھی قسم کا نقصان پہنچے تو پولیس سیدھا تمہیں گرفتار کر لے۔ میرے پاس دن فائیو پر کال کا آپشن بھی ہے۔“ وہ پرسکون تھی۔

”میرے گھر میں رہ کر تم مجھے آنکھیں دکھاتی ہو۔“ اسے اٹھا کر مارنے کے لیے زمان کو کوئی چیز موزوں نہیں لگ رہی تھی۔

”گھر کا کرایہ میں دیتی ہوں۔ ایڈوانس بھی میں نے بھرا تھا۔“ اس نے اس کے پیش کے غبارے میں حقیقت کی سوئی چھو دی۔

”مجھے معاف کر دو۔“ اگلے منٹ میں وہ اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ مگر اس نے اپنے پیر سمیٹ لیے۔ اس کا سر قہقہے سے فی میں مل رہا تھا۔

☆☆☆

فیصلہ اس کے حق میں ہونے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوئی اور آج وہ دونوں بچوں کو لیے اس گھر میں جاری تھی، جس کا کرایہ وہ بھرتی تھی۔

اپنا گھر بچانے کے لیے خاموشی اور تابعداری سے پٹانائی کی حکمت عملی (اسٹریجی) رہی۔

جاریت ثریا کی حکمت عملی تھی۔ ثریا کی گڑیا کے لیے یہ دونوں راستے قابل قبول نہیں تھے۔

وہ نئے زمانے کی پڑھی لکھی عورت تھی۔ اس نے سب سے محفوظ راستہ استعمال کیا۔

نانی کے زمانے میں کامیاب عورت کی یہ ہی نشانی تھی کہ وہ ہر ظلم و جبر کو نصیب کا لکھا سمجھ کر برداشت کرے۔

ثریا اپنے طرز کی واحد عورت تھی۔

گڑیا کو ان دونوں جیسا نہیں بننا تھا۔ اس نے

افزیت کی کوئی شکل ہوتی تو وہ یقیناً مہر لٹسا ہوتی۔ بال زندگی کی مانند اجڑے سے تھے، رنج و کسی ہی تھی جیسی ہمیشہ ہوا کرتی تھی، نہ پہلے کبھی۔ اس کے دامن میں خوشیوں کے سندیے لائی تھی، نہ ہی آج معمول کے برخلاف کچھ ہوا تھا۔ پہلے بھی بھائی کے اکتاہٹ بھرے لچے سے گویا جرم ہو۔ منہ میں دو چٹاٹھوے وہ بے آواز آنسو

ماہوش طالب

لکھائی کے بعد



اس کی صبح ہوئی تھی۔ آج بھی طنز و طعنے کے نشتر اس کے نیم جاں وجود پر چاٹک چاٹک کی طرح لگ رہے تھے۔ غلطی بھی تو اس کی تھی۔ اس کی ممانی کو لگتا تھا کہ یہ یتیم و سیر ہونے کے ساتھ بد نصیب بھی ہے۔ اس کے حالات سے بے زار ہو کر تو آفتاب نے بھی اپنی کرنیں اس پر نچھاور کرنا چھوڑ دی تھیں۔ یہاں تو پھر وہ انسان بننے لگے تھے۔ جو کہنے کو اس کے اپنے تھے اور اسے ان حالات تک پہنچانے کے کسی حد تک ذمہ دار بھی۔ مگر کم ظرفی کی گتھی میں شاید ایسی بڑی تھی کہ اس کے زیر اثر ہر احساس دب کر رہ گیا تھا۔

”چل اٹھ جاوے! پہلے کیا کم زندگی اجیرن تھی، جواب یہ عذاب مسلط ہو گیا۔“ نازیہ دھاڑے دروازہ کھولی کر اسٹور روم کمرے میں داخل ہوئیں۔ ”کہاں چھپا رکھی ہے وہ سوغات؟“ انداز میں سمندر کی لہروں کی سی بے چینی تھی۔ کہیں کا غصہ کہیں نکل رہا تھا، بلکہ غصہ چپاں کا بھی ہو، ممانی کی توپوں کا مرکز ہمیشہ وہی ٹھہرتی تھی۔

مہرالنسا جانتی تھی، اس بے چینی و غضب کا محرک، مگر لب سے دہکتی رہتی، اس کی سوئی ہوئی حیات پوری طرح جاگ گئی تھیں۔ نیچے کے نیچے سے موبائل نکال کر ان کو تھما یا اور خود فرشی بستر سے نکل کر لباس درست کرنے لگی، جواباً نازیہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

”آئندہ تیرے پاس نہ دیکھوں اسے۔“ دھاڑ سے ہی دروازہ بند ہوا۔ ماہین مٹھکوک ہوتے ہوئے بھی یہ ”آفت“ اپنے پاس رکھنے کی حق دار تھی، جب کہ وہ بے قصور ہو کر بھی سزاوار ٹھہرائی جاتی تھی۔ حسب معمول اپنی کم مائیگی کے احساس نے اسے کمر لانے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

وہ جب پیدا ہوئی تو سونے کا چچو تو دور کی بات، پیتل کا چچو بھی آس پاس نہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی ساتویں اولاد تھی۔ پہلی دو،

دو سائیں ہی لے سکی تھیں، باقی چار سے عمر کا اتنا فاصلہ تھا کہ بچ میں ان کے جوان ہوتے ہیچ آتے تھے۔ بھی جو وہ کوشش کرتی بھی ختم کرنے کی تو بڑی آپا اپنے سنے آنے والے سنے کی فکر میں غلطاں ہوئیں یا بڑے بھائی کو بیٹے کی آئین پہ ہونے والے خرسچے نے پریشانی میں مبتلا کیا ہوتا۔ ایسے میں کوئی کیونکر اس پر دھیان دے پاتا۔ اس پر مستزاد کہ پانچواں برس لگتے ہی اس کی گملائی ہوئی ماں عدم کو سدھار لگیں۔ اب وہ بھی اور اس کی تنہائی۔

باپ تھا، مگر یہ طے کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں سے کس کے لیے کس کی حیثیت آئے میں تک کی مانند ہے۔ وہ ساری مصروفیات سے فارغ تھا۔ (اسے لگتا تھا) تو سوچا کیوں نہ کوئی مصروفیت پال لی جائے، چار مرلے کے گھر میں سوگی داڑھی کھجاتے اور دھوئی سنہالے وہ ادھر سے ادھر — پھر تھا اور یہ کوئی قابل قدر کام نہ تھا۔ اسی لیے شاید کوئی ابا بھائی کہہ کر اس کے آگے پیچھے پھرنے والا بھی نہ تھا۔ نہ بیٹے، نہ بہنیں۔ تب ہی اس نے قابل ذکر کام کر ڈالا۔ اب ہر کوئی ابا بھائی ابا بھائی کہتا تھا کہ آگے پیچھے پھرنے والی جو کوئی اور آگئی تھی۔ ستر کے بیٹے میں داخل ہوتے باپ نے شادی رچا کر بڑا کارنامہ انجام دیا۔

مہرالنسا سات سال کی ہوئی اور اسی سال یتیم بھی کہ باپ کا بھی بھار کا رکھا تھا بھی ہمیشہ کے لیے اس کے سر سے اٹھ کر نئی بیوی کے ساتھ سے جا ملا۔ اس دن مہرالنسا کا اپنے گھر میں (جو بھی اسے اپنا لگا ہی نہیں) آخری دن تھا۔ اس گھر میں اگر اسے کوئی خوش میسر آئی تھی تو وہ یہ کہ اس نے اپنے پیچھے بھتیجیوں کے ساتھ مارے باندھے ہی سہی، مگر نورانی قاعدہ مکمل کیا تھا۔

اگلی صبح دوسرے گاؤں سے چھوٹے ماموں آئے۔ چھوٹے ماموں، صرف چھوٹے نہیں بھولے بھی تھے۔ گاؤں میں چھوٹا مگر خوب چٹا ”بک ڈپ“ تھا۔ وہ بھی اولاد تھے اور روز، روز کی جیج کے

باعث بیوی سے ان کی آن بن رہی تھی، بہنوئی کی حرکت کا پتا چلا تو چھوٹی بھانجی کا خیال آیا۔ سوچا شاید رب نے اسی لیے اولاد نہیں دی کہ مرحوم بہن کی بیٹی کو اپنی اولاد بنانا پڑے گا، لہذا کسی کی پروا کیے بغیر مہرالنسا کو لے آئے۔ گھر والوں نے شکر کا کلمہ ادا کیا کہ نام نہاد و مذہداری سے جان چھوٹی۔

مہرالنسا اتنی سمجھ رکھتی تھی نہ ہمت کہ جانے سے انکار کر سکے۔

اب بیوی جانے اور بھانجی چھوٹے ماموں کو اجازت نہ تھی بولنے کی۔

جب تک اپنی کوئی اولاد نہ ہوئی تھی، تو نازیہ پھر بھی مجبور نہ بن سکتی تھی۔ مہرالنسا سے دو چار باتیں کر لیں، مگر دو سال بعد ماہین اور ایک ایک سال کے وقفے سے معاذ اور نورین کی پیدائش سے مہرالنسا کی رہی سہی اہمیت بھی جاتی رہی۔ اس کا وجود کسی ان چاہے بوجھ سے کم نہ تھا۔ مگر شوہر نامہ دار نے آج تک بیوی سے شاید پہلی اور آخری بات یہ ہی منوالی تھی کہ بھانجی کو واپس بھیجنے کی بات بھی نہ ہوگی اور مہرالنسا جہاں بھی رہتی، زندگی تو ایک ہی طرز سے گزر رہی تھی، جبکہ نہیں خلت تھیں، مگر میزبان ایک سے تھے، بے بسی، تنہائی اور نفرت۔

☆☆☆

وہ سولہ سال کی ہوئی تو زندگی کے رنگ آپوں آپ ہی ذرا سے بدلے۔ ممانی کی زیادتیوں کے باوجود رات کو گھن میں لگے آئینے کے سامنے ضرور جا کھڑی ہوتی، کچھ محو کے لیے ہی سہی، مگر اپنا جائزہ ضرور دیتی اور اپنے آپ کو کسی اور ویس کی باسی تصور

کرتی۔ حالانکہ کوئی بتانے والا تھا، نہ سکھانے والا، نہ ہی کوئی سکھی سکھاتی جس کے ساتھ مل کر شوخیاں ماری جا سکیں، ہاں۔۔۔۔۔ مگر بڑا مددے میں لگا کالے رنگ کا ٹی وی جس کا تو شاید اب ماڈل بھی دنیا سے ناپید ہو چکا تھا، مگر ہمسایوں کے توسط سے رنگ برنگے چیمبل خوب آتے تھے، تو وہی تو تھے اسے سکھانے والے کہ اس عمر میں خیالات کیسے بدلتے ہیں اور کوئی دھیان دینے والا نہ ہو تو کروار بھی۔۔۔۔۔

چھوٹی نورین تو معصوم تھی، جب ممانی آگے پیچھے ہوتیں تو اس سے اسکول کا سبق پڑھنا بھی سیکھ لیتی اور تربیت کتابوں اور عملی کرواروں سے ہی تو ہوتی ہے۔ مگر خالی خولی اپنی ہی شکل دیکھنے سے کیا ہوتا۔ لہذا جلد ہی طبیعت بے زار ہوئی، کاموں اور نفرتوں کے انبار تلے زندگی پھر سے دہلی دہلی محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

اٹھارہواں برس لگا تو لگا زندگی کو مقصد مل گیا ہے۔ سجاد اور اس کی محبت بھری باتیں، ان باتوں میں اتنا شیرا تھا کہ کیا کسی کی گلاب جاسن میں ہوگا، تو پھر مہرالنسا کا اس شیرے میں ڈوبنا لازم تھا۔ وہ اپنے سارے دکھ بھول گئی۔ وہ زندگی کو ”محسوس“ کرنے لگی، یہیں چھت پر ٹپکتے ہوئے دھیانی میں نظریں پھنکی تھیں۔ ایک بار، دوسری بار اور تیسرے دن تیسری بار کچی چھت پر پھنکی محبت پکٹنے لگی، اب ممانی کی۔ باتیں تکلیف دیتی تھیں، نہ کام بوجھ محسوس ہوتے تھے، بس صبح ہوتے ہی شام کا انتظار ہوتا کہ وہ کپڑے دھوئے اور کب سکھانے کے بھانے۔۔۔۔۔ چھت پر جائے۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ کوئی اس کی پروا کرنے والا ہے، نہ مگرانی۔

مگر بھانے رے یہ کم بخت خوش نہی۔ تیسرہ سالہ ماہین نے مزاج میں چالاکی اور سختی اپنی ماں سے لگتی تھی اور ہی سہی کسر ماں کے لکھائے پڑھائے سے پوری ہو رہی تھی تو اس دن دو ضرور دیتی اور اپنے آپ کو کسی اور ویس کی باسی تصور

نجات ہوئے مہر النساء سے پوچھا۔

”سجاد بھائی سے ملنے جا رہی ہوں، اس لیے آج دھلے ہوئے کپڑے دوبارہ دھو رہی ہوں۔“
صاحب سے جھاگ بنائی، بے وجہ مسکراتی وہ ٹھکی۔ ”نک..... نک، کیا مطلب؟“ تھوک نکلے ہوئے بشکل اس نے کہا۔

”اپنی خیریت چاہتی ہوں تو اس کا خیال دل سے نکال دو، خود کو بڑی حسین شے سمجھتی ہو تم.....“ کہہ کر وہ ہنسی، مگر مہر النساء کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ بے دلی سے چھت پر گئی، جہاں وہ فارغ الوقت سجاد فرصت سے منتظر تھا، مگر مہر النساء نے تو گویا آنکھیں بند کر لی تھیں۔

کالے۔۔۔ ہال، تاریکی میں نیچے بدرنگ جینز پہنے سجاد کو اس بے اعتنائی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی، مگر وہ انتظار کرتا رہا کہ شاید نیچے جاتے وقت ایک نظر عنایت ہو ہی جائے، یوں بھی آج کے جدید دور میں مفت میں اپنا قیمتی وقت دینے والی اس جینسی اور کہاں ملتی۔ مگر مہر النساء نے پلٹا تھا، نہ وہ ہنسی۔ دل کو دھڑکا ہی لگا رہا کہ کہیں مہاجر مہمانی یا ماموں کو نہ بتا دے۔

مگر رات بلکہ اس سے اگلی رات بھی خیر ہی رہی۔ سجاد نے اگلے دن ”شش..... شش“ کر کے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر مہر النساء نے آج کان بھی بند کر لیے اور پھر تیسرے دن جب کپڑے دھو کر وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھی کہ اوپر کسے جائے، مہاجر نے اس کے ہاتھ سے کاسی رنگ کی بالٹی لے کر مشکل آسان کر دی، اس کی بھی اور اپنی بھی..... مہر النساء کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مہاجر اس کا یہ راز کسی کو نہیں بتائے گی، تو خوب سجاد کو یاد کر نے لگی۔ اسے یہ فتن تھا

کہ وہ اسے بے وفا سمجھتا ہوگا، اس کی یاد میں بے چین رہتا ہوگا۔ مگر وہ کرتی بھی تو کیا۔ اس لیے جو کرتا تھا، وہ مہاجر نے کر دکھایا۔ اب روز چھت پر کپڑے پھیلانے کی ذمہ داری مہاجر نے لے لی تھی۔ دایہی پر ایک تملاد دینے والی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ

کیے ہوتی، جسے وہ پہلے نہ سمجھ سکی، مگر نامہاد و جبت کی یہ نئی پینک چڑھتی اس نے بھی دیکھ ہی لی۔

دل ماننے کو تیار نہ تھا کہ سجاد نے اپنا دل بلکہ دل کا ایک خانہ کرائے پر دے رکھا تھا اور جب مہر النساء کرائے کی رقم وقت پر ادا نہ کر سکی تو سجاد نے کرائے وارید لے لے میں چنداں دے نہ کی۔ غلطی بھی تو مہر النساء کی تھی جو دل لگی اور دل کی لگی میں فرق نہ سمجھ سکی۔ جو وقت گزاری کو مقصد حیات اور محبت تصور کرنے لگی تھی۔ تو زندگی پھر سے لاوارث ہو گئی۔ وہ جو ایک احساس تھا چاہے جانے کا، خوش فہمی ہی سہی، تھا تو..... حتم ہو کر رہ گیا۔

مہاجر کی حرکتوں سے مہمانی واقف تھیں یا نہیں، مگر مہر النساء کی اوقات نہیں تھی کہ اس سے جواب ملتی کر سکے۔

☆☆☆

خزاں کے خشک دنوں اور اجازتوں میں اسے اپنی محرومیاں پھر سے سنانے لگی تھیں۔ کرنے کو بہت کچھ تھا، مگر بے زار کر دینے والا دن تو کاموں میں جیسے تیسے گزرتا جاتا تھا، مگر رات کو برائے نام فرشی بستر پر لیٹتے ہی اسے آپ سے ہزاروں سوال کرنے لگتی۔

وہ اٹھارہ سال کی مہر النساء جس کا نام بھی اس کے ماں، باپ نے نہ جانے کیا سوچ کر اور کیسے ”مہر النساء“ رکھا تھا، ورنہ قیمتی زندگی وہ گزرتی تھی، اس کا کوئی نام نہ بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ اسے یاد نہیں پڑتا کہ اس کی پیدائش کے وقت پہلی بار کسی کو اس کا نام بتانے کے علاوہ بھی کسی نے اسے اس کے پورے نام سمیت پکارنے کی زحمت گوارا کی ہو۔ ہاں..... البتہ سہی، گچھی، گھوڑ ماری، پوتی، منخوس، میرد (جس کی نوبت بہت کم آتی۔) جیسے اس کے بے شمار نام تھے، جن سے جس کا جب دل چاہتا اسے پکارتا۔

ہاں..... تو وہ مہر النساء جاگ رہی تھی، وہ جو سوالوں کے جواب تلاشے لگی تھی، مگر کون تھا جو اسے مطمئن کر پاتا اور اس سے پہلے کہ وہ مایوس ہو کر سو جاتی۔ چھوٹے ماموں برآمدے میں بی بی دی کے سامنے بیٹھے

دکان کے حساب کتاب میں مشغول تھے، جس پر کوئی قاری قرآن کی سورۃ مع ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ نازیہ شوہر کے لیے دودھ پتی تیار کر رہی تھیں اور مہاجر مہر النساء کے سامنے ہی گدے پر سونے کی اداکاری کر رہی تھی۔

”اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل لے۔“ مہر النساء نے یہ آیت مع ترجمہ سنی، وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ قرآن کے کس جیسے میں لکھی ہے، وہ اس آیت کا مفہوم بھی نہیں جانتی تھی، مگر یہ یقین تھا کہ یہ قرآن کے الفاظ ہیں۔ کچھ ایسا ہے ان لفظوں میں جو اسے اپنی طرف متوجہ کر گیا ہے، جو اسے اپنی زندگی سے بے خبر محسوس ہو رہا ہے اور پھر ساری رات وہ سو نہ سکی۔ یہ کبھی سچ کے ہی نہیں دے رہی تھی کہ قوم اپنی حالت آپ کیسے بدل سکتی ہے، جب کہ سب اختیارات تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات اس کے لیے یہ بھی کہ کیا قرآن اردو میں بھی ہے؟ پھر دوسرے دن اور اس سے اگلے کئی روز وہ بے چین رہی کہ اپنے سوالوں کے جواب کیسے پائے؟

اس دن جب نورین نورانی قاعدے کی دہرائی کر رہی تھی اور وہ بظاہر اسے دیکھتی کسی غیر مرئی نقطے کو سوچ رہی تھی، جب ذہن میں ایک اور جھماکا ہوا۔ بعض اوقات سامنے کی چیز نظر نہیں آتی، آپ کے سوالوں کے جواب اتنی دور نہیں ہوتے، جتنا آپ انہیں سمجھ لیتے ہیں، اس کے معصوم مگر اہم سوالوں کے جواب اس گھر میں قاری صاحب کے علاوہ کون دے سکتا تھا، جو پانچ سال سے اس گھر میں وقفے وقفے سے آ رہے تھے اور

”نبی قرآن اللہ کی کتاب ہے، جسے اس نے ایک زبان عربی میں نازل کیا ہے، مگر تم دیکھو نا کی اتنی کائنات میں ہر طرح کی بولی، بولنے لیتے ہیں تو ہر صاحب شوق اس کی فضیلت سے

مستفید ہو سکے، اس کے لیے مختلف ملکوں کے علما نے اسے اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور یہ کام اب نہیں، بلکہ چودہ سو سال پہلے اس کتاب کے نازل ہونے کے بعد ہی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یوں جب اردو زبان وجود میں آئی تو قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کرنا بھی ناگزیر ہوا۔“ قاری صاحب، معاذ اور نورین کو پڑھانے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر اسے سادہ انداز میں سمجھا رہے تھے۔

”اور نبی یہ جو آیت ہے نا قرآن کی سورہ الرعد آیت 10 میں“ بڑی زبردست ہے۔ امید دلانی، ہمت بندھانی اور بزدل اور دست لوگوں کو خوف دلانی۔“ ”مگر قاری صاحب اس میں پوری قوم کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب ہے میں اکیلی جیسی ہوں، ویسی رہوں، اللہ مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔“ وہ ابھرتی تھی۔ قاری صاحب مسکرائے۔ وہ سمجھ گئے کہ اس کے اندر تجسس کا بیج پھوٹ پڑا ہے، شعور نے اٹھزائیاں لینی شروع کر دی ہیں۔

”بیٹا! تو میں بھی تو فرد واحد سے مل کر وجود میں آئی ہیں۔ تم ظلم سہتی رہو گی۔ حکم تم (گوئی بہری) بن کر اگر سب دیکھتی رہو گی تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے ان حالات کو اپنے لیے پسند کر لیا ہے۔ تمہیں فرق نہیں پڑتا تمہارے ساتھ اگر اس سے بھی برا ہو، تم خود کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے اپنے لیے اور یہی حال تو ہمیشہ سے کسی نہ کسی قوم کا رہا ہے، اللہ سے دوری ہی تو بے بسی اور مصیبتوں کا باعث بنتی ہے۔ سمجھ رہی ہو میری بات مہر النساء بیٹی؟“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”جی۔“ وہ فقط یہی کہہ سکی۔

کچھ دنوں بعد قاری صاحب نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی مہمانی سے اجازت لے کر ان کی بہن کے پاس قرآنی تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔

مہمانی سے پوچھا تو جواب آیا۔ ”جہاں مرضی جاؤ۔ یہاں بیٹھ کر کون سا اناج کھلا رہی ہو، میں، مگر

دو گھنٹے سے ایک منٹ اوپر نہ چومہیں وہاں۔“
روز کے دو گھنٹے ایک ایسے گھر میں گزارنا جہاں کوئی کسی کو طعن نہ دے، غلطیوں پر ذلیل نہ کرے، آپ کی بات کو سنا جائے، اہمیت دی جائے، مہرالتسا کے لیے غیرت تھا۔

چالیس کے بیٹے میں داخل ہوتی فاطمہ باجی بظاہر جتنی سادہ اور پروقار لگتی تھیں، اندر سے بھی طبیعت میں ٹھہراؤ اور نرمی تھی۔ انہوں نے قرآنی تفسیر اور مفہوم احادیث کا کورس کر رکھا تھا۔ اس لیے محلے کے بچوں کو پڑھائی تھیں اور ہر مذہبی لکھی تھیں۔ قاری صاحب کے توسط سے وہ مہرالتسا کے حالات کے بارے میں جانتی تھیں، اس لیے بھی اسی سے احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ بالکل مفت پڑھ رہی ہے۔ یہ ان کی محنت اور مہرالتسا کا شوق ہی تھا جو وہ پڑھ سال کے عرصے میں قرآن پاک کو عربی اور اردو میں سمجھ کر پڑھنا سیکھ گئی تھی اور اسی دلچسپی کے باعث اسے اچھا خاصا لکھنا بھی آ گیا۔ وہ ذہن تھی، اس لیے معاذ وغیرہ کی اردو اور اسلامیات کی کتابوں کو شوق سے پڑھتی اور ان نکتوں کی بھی دہرائی میں مدد کر دیتی۔

ممائی نے جو یہ دیکھا تو منہ میں انگلیاں داب لیں۔ ”یہ اسی کے رب اور کیسے نکلے۔“ پھر انہوں نے زبان کی چٹنی تیزی اور سارے پر کاٹ دیے۔

اب ایک ہفتے سے وہ فاطمہ باجی کے ہاں نہیں جا رہی تھی۔ صد شکر کہ سیکھنے کو اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ امور خانہ داری بھی۔ اب کچھ عمل کرنے کا وقت تھا۔ وہ جو سجاد کی یاد اور بے وفائی پر ہفتوں تڑپی تھی۔ اب سوچتی تو اپنی حماقت پر مسکرا کر سر جھٹک کر دیتی۔ دل زیادہ اداس ہوتا تو شکر کرتی کہ کسی بڑے گناہ میں ملوث ہونے سے بچ گئی..... اور شاید دل بدلنا اسے ہی کہتے ہیں جیسے اس کا بدلہ تھا۔

ممائی سے اجازت لے کر اس نے ان کی سلائی مشین سنبھال لی، مایین اور نورین کے دو چار ان کلمے کپڑے نمیت کے طور پر ممائی کو سی کر دکھائے اور

ممائی نے اس بار پانچوں انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔ مفت کی ورژن تو ہاتھ لگی تھی، مگر بھانجی کی یہ سلقہ مندی ایک آنکھ نہیں بھاری تھی کہ نہ خود سلیقہ مند تھیں، نہ بیٹیاں۔ خیر محلے میں اطلاع دے دی کہ اب سب کے کپڑے مناسب داموں میں مہرالتسا ہی سار کرے گی۔ ممائی کے شیطانی دماغ نے یہ بھی سوچ لیا کہ بھانجی کی کمائی بھی کھالیں گے اور نام ورنہ بھی ہوگی کہ یتیم کی کیسی اچھی تربیت کی ہے۔ سلائی کے پیسوں سے چیز بھی تو سی کا بنے گا..... مگر..... مہرالتسا کی تو گویا کا باجی پلٹ گئی تھی۔ شرط رکھی کہ کپڑے اس شرط پر ہے گی، اگر کل آمدن کا ستر فیصد اسے ملے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق ممائی کو ہاں بھرنی پڑی کہ زبان دے چکی تھیں۔ اب بات عزت کی تھی۔

☆☆☆

وقت اپنی پوری رفتار سے گزرتا رہا، جہاں مہرالتسا کے روز و شب بدلے تھے، وہیں مایین کی چھب بھی نرالی لگی۔ بمشکل مل پاس کر کے اس نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا، جب کہ مہرالتسا نے فاطمہ باجی کی مدد سے آٹھویں جماعت میں داخلہ لے لیا، اس بار بھی ممائی کچھ بول نہ سکیں۔ مہرالتسا نے دن رات کی محنت کی کمائی سے اس۔ مگر کا نقشہ بھی تو بدل کر رکھ دیا تھا۔ بدرنگ، گھسے اور ٹوٹے ہوئے برتنوں، گلدانوں اور موزوں کی بھی سی گئی۔ ممائی کو یقین تھا کہ وہ دو چار پیسے اور جمع ہوئے تو خود ہی پنک اور خستہ حال دیواروں کے بارے میں بھی سوچے گی اور یوں اچھے رشتے بھی آئے لگیں گے۔

بھئی اپنی مایین کے لیے۔
شکر تھا کہ باقی اخراجات ابھی ماموں کی آمدن سے ہی پورے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

مہرالتسا اب قدرے مطمئن رہنے لگی تھی۔ وہ جو گم شدہ سی تھی، اس زینت کو عنوان مل رہا تھا۔ یوں ہی اپنی گزشتہ زندگی کا ورق ورق پلٹتے رات کے

بھری پہر، جب وہ نیند کو سلام کرنے ہی والی تھی، کمائی کی بے وقت آمد نے اسے جگا دیا، مگر ان کے خیال میں وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ جب کہ مایین حسب معمول سونے کی اداکاری..... آدھا خیال درست تھا..... آدھا خیال غلط بھی تھا۔

”نای اٹھ جا، اچھی خبر نہیں ہے، اس منوس کا ہاپ مر گیا۔“ ناز نے اس کے اوپر سے چادر مہر کاٹے ہوئے سر گھونکی کی۔

”کیا..... کیا.....“
”دشش..... دشش.....“ اس کو ہرگز خبر نہ ہو، چل اٹھ، شبیر (مہرالتسا کا بھتیجا) نے فون کر کے بتایا ہے۔ ہمیں ابھی جانا ہے، اس بجٹ کی آنکھ کھلنے سے پہلے تیار ہو کر آ جا۔“

”اچھا اماں صبر کر لے۔“ وہ جو مو بائل پر اہم ترین کام انجام دے رہی تھی، ماں کی بے وقت آمد سے خوب کوفت زدہ ہوئی۔

مہرالتسا کو لگا شاید اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ کس بات کا یقین کرے، باپ کی موت والی بات کا یا اسے باپ کی موت سے بے خبر رکھنے والی بات کا۔ مگر اسے تو ایک اور بات کا بھی یقین کرنا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد لوہے کا داخلی دروازہ وا کرتے ہوئے مایین نے ماں سے پوچھا تھا۔ ”اماں! مہرالتسا کو کیوں نہیں بتاتا۔“

”ارے تجھے نہیں پتا، بڑا کمینہ دھیال ہے چرا، نہ جانے کیسے مظلوم ہوا انہیں کہ یہ بڑی پڑھنے لکھنے والی سمجھ دار ہوئی ہے۔ قرآن کی باتوں کا پتا ہے اسے، تو ڈر گئے کہ کہیں باپ کا سنتے ہی وراثت میں حصہ مانگنے نہ آ جائے۔“

”ہاں دیے اماں! کچھ پتا بھی نہیں اس چلا کوکا..... کیا انہوں نے۔“ تاکید کرنے والی مایین تھی۔

اور مہرالتسا.....

نماز فجر کے لیے صدائیں بلند ہونے لگیں، مگر التسا تنگ سر، ننگے پاؤں اسٹور کی جانب گئی۔ یقین کرنا لازم تھا کہ سوائے اس کے کوئی

چارہ نہیں تھا اور اس کے یقین کرنے، نہ کرنے سے فرق کسی کو پڑتا تھا۔ خوش بھی اور محبت تو برسوں پہلے ہی ختم ہو چکی تھی..... مگر کوئی اتنی گھٹیا سوچ بھی رکھ سکتا ہے؟ اذیت کی کوئی شکل ہوئی تو وہ مہرالتسا ہوئی۔

☆☆☆

اگلی صبح معاذ، نورین اور ماموں بھی چلے گئے اور شام تک واپس آئے۔ اس سے کچھ کہنے یا پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی گئی اور اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی فی الحال وہ سکت نہ رہی تھی۔ اب تو اپنوں کے دیے گئے دکھ زندگی کا ایک تحفہ تھے جو شاید عمر بھر اس کے ساتھ ہی رہتے۔ اندر ہی اندر آنسو بہائے، نہ جانے کتنے دن بیٹے۔

فاطمہ باجی آئیں تو ان کے گلے لگ کر خوب سسکی، جب کہ فاطمہ اسے تسلی دیتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ اسے بھانجنے کے لیے مہرالتسا کا رشتہ اس کی ممائی سے مانگیں، تو کیسے مانگیں؟

”یہ فاطمہ سے تمہارا دوستانہ کچھ زیادہ نہیں ہو گیا؟ تمہاری ہم عمر ہے وہ، جو ہر وقت اس کے ساتھ لگی رہتی ہو۔“ ممائی فاطمہ کے جاتے ہی زہر اگلنے لگیں۔

”وہ خود ہی آ جاتی ہیں۔ میں ان کو منع تو نہیں کر سکتی۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا، جو ممائی کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

”تو بی بی! جب تم لوگوں پر یہ ظاہر کر دو گی کہ تمہارے ممائی، ماموں تم پر ظلم کرتے ہیں تو وہ تو ہمدردی کو آئیں گے۔ تم سب پر یہ ہی ظاہر کرنا چاہتی ہو تاکہ تمہارے ماموں، ممائی نے تم پر پابندی لگا لی ہوئی ہے۔“

مہرالتسا کچھ نہ بولی تھی، مگر دل ممائی کی اس ہٹ دھرمی میں لپٹی صاف کوئی پرکٹ کر رہ گیا۔

☆☆☆

زیادہ دن نہ گزرے تھے، مگر یہ صبح گزرے یوں کی نسبت قدرے روشن اور پرسکون لگ رہی تھی۔ دوپہر ڈھلتے ہی فاطمہ باجی اپنی بڑی بہن کے



مہرالنسا نے سنبھل کر مزید کہا۔ ”میں چلی جاؤں گی تو مایین اور نورین کے رشتوں میں حائل ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی۔“

”تم کیا جھگڑتی ہو خود کو، کوئی حور پری ہو؟ تم جیسی دس اور آجائیں تو میری بیٹیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“

”بالکل! اور میں آپ کی لاڈلی کا مقابلہ کرنا بھی نہیں چاہتی۔ بس یہ التجا ہے کہ اگر آپ چاہتی ہیں کہ ماموں، مایین کی حرکتوں کی وجہ سے آپ کی بیٹیوں کی شادی زبردستی نہیں نہ کر دیں تو فاطمہ باجی کو ہاں کر دیں۔“

وہ کہہ کر رکی نہیں، مگر کمرے میں جا کر اس کا دل انجانے خوف سے ہڑکنے لگا تھا۔ اتنی بے باکی کا انجام نہ جانے کیا ہو۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ خواہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ لیتی، تب بھی ممانی اس کی پاک بازی کا یقین کرنے والوں میں سے نہ تھیں۔ اسے آج نہیں تو کل اس گھر سے لکنا ہی تھا۔ پھر کیا حرج تھا کہ وہ ذلت کے بجائے عزت سے اس گھر سے رخصت ہو جائے۔

ممانی کو یقین تھا کہ مہرالنسا نے جو کہا ہے وہ کر بھی سکتی ہے۔ مایین کی بے راہ روی بڑھتی جا رہی تھی۔ بہتر یہ ہی ہے کہ مہرالنسا کے نام کی لکٹی ٹکوار سے جلد از جلد چھٹکارا پایا جائے۔ پھر مایین میں اتنا سلیقہ و سمجھ داری نہ تھی کہ وہ اس کا بیواہ رجا دیتیں۔ انہیں اپنے سر پر خاک نہیں ڈالونی تھی اور پھر بھانجی کی اتنی اچھی جگہ شادی کرنے پر ساری واہ واہ ان کے حے میں ہی آئی۔

رات سے صبح ہونے تک وہ اپنے آپ کو سمجھا چکی تھیں۔ لہذا دکان پر جانے سے پہلے شوہر کے کان میں ڈال دیا کہ لڑکے والوں کو ای جتنے بلا لیں۔

”بہت اچھا فیصلہ کیا۔ تیم کی ذمہ داری بھانا تو دیے بھی بڑے ثواب کا کام ہے۔“ ناشتے کے لیے میز اپنی طرف کھٹکاتے ہوئے ماموں نے فرمایا اور ممانی مسکرا بھی نہ سکیں۔

ساتھ آئی تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ماموں بھی گھر پر تھے۔ ممانی کا چونکنا لازمی تھا۔ فاطمہ نے بھینپا بڑی سوچ و بچار کے بعد یہاں آنے کی ہمت کی تھی اور پھر ان کی بہن نے جب اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو ممانی کے تو چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔ ماموں البتہ سنبھلے ہوئے تھے۔

”سوچ کر جواب دیں گے۔“ کہہ کر انہیں رخصت کیا۔

طرز کے تیر چلائی مایین کے توسط سے بات مہرالنسا تک پہنچی، مگر وہ یقین کرنے سے قاصر تھی۔ کیوں کہ مایین سے تو کچھ بعید نہ تھا کہ مہرالنسا کے سوال کرنے پر بات کا پتھر بنا کر ماموں، ممانی کے سامنے پیش کر دیتی۔ لہذا بے نیازی کا لبادا اوڑھنے میں ہی عافیت جانی۔ یہ الگ بات کہ ساری رات جگنوؤں اور پھولوں کی داد کی سپر کرتی رہی۔

اگلی صبح حسب معمول ممانی کی گل افشانیوں سے ہوئی۔

”ارے ہمیں کیا پتا تھا کہ تعلیم کے بہانے وہاں لڑکے پھنساتے جاتی ہے۔ فاطمہ سے سر جوڑے راز و نیاز کرتی تھی اور ان کے ابا کو دیکھو، ساری عقل دکان پر ہی چھوڑ آتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کی پروا نہیں۔ بھانجی ننھوس کے لیے آئے رشتے کو ہاں کرنے چلے ہیں۔“

مہرالنسا اس الزام پر گھبرا گئی، وہ صفائی دینے کی خاطر ممانی کی طرف بڑھی، مگر.....

”اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی نہ بدلے۔“

وہ پڑھے لکھے تمام سبق کیسے بھول سکتی تھی۔ جو قدم قدم پر ممانی کرنے کو موجود تھے۔ ممانی تک پہنچتے پہنچتے اس کا ذہن بدل چکا تھا۔ اگر اس نے اپنے لب اب نہ کھولے تو ساری زندگی ذلت میں گزرے گی۔ دوسروں کے احسان تلے۔

”ممانی! اگر میں اتنی ننھوس ہوں تو آپ اس رشتے کو ہاں کر دیں۔“ بہتر کی چادر ٹھیک کرتی ممانی چوکیں۔

سلوی سیف اللہیٹ

ستہری

دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں، ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کہنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔

ریاض احمد کے دو بیٹے عمیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے، جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جب کہ عمر ایک بڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔

الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد بھتیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسٹنٹ میں معذور ہوتا ہے اور اس کی بیوی مرجانی ہے، وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹرز اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

مکمل ناول



انعم اور احسن ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا میٹ کر داتا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے، احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازٹیو آتی ہیں، وہ بالکل وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کسی اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا کھڑا رہتا ہے اور اپنے پیچھے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔

عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بہن بھائی دعا کو اس کی ماں کے تم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بہن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھائی، وہ اسے ہر وقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو کچھ کمالیاس احمد کا لالچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔ الیاس احمد، عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتے ہیں، جسے ریاض احمد سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ عمران سے مزید برکتیہ ہو جاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر ہمیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، کیوں کہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمیر اور دعا کی شادی ہوئی تو باپ، بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں گے۔

ریاض احمد، عمیر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں مگر رابعہ، دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آ جاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل کھیل میں آنے لگتا ہے۔ وہ عمر کو اسلام آباد برائج کا چارج دے دیتے ہیں۔

عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دعا بھی ممائی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے، مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانہ نہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔

منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں، جہاں دعا، عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامنی پر یقین ہوتا ہے، وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔ ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں، جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہے۔ دعا اپنی پاک دامنی ثابت نہیں کر پاتی، اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصور وار نہیں مانتا۔ الیاس احمد، مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔

الیاس احمد اپنی چھپے دہار باتوں سے مریم اور رابعہ احمد کو دعا کی آصف سے شادی پر راضی کر لیتے ہیں۔ ریاض احمد اور

نوال کے کہنے پر عمیر، دعا کو اس کی شادی سے ایک روز قبل الیاس کے چٹھل سے چھڑا لیتا ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے سوتیلے بھائی کے دروازے پر چھوڑ آتا ہے۔

اس کا سوتیلہ بھائی ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ دعا گھروں کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر نے عمیر کو گولی مار دی ہے۔ نوکرائی اسے کہیں اور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بہت بری حالت میں دعا اپنی دوست انعم کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنے حالات بتاتی ہے۔

دعا کے متعلق رابعہ کے اصل خیالات اور عمر کے کڑوت جان کر ریاض احمد ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ آصف خودکشی کر لیتا ہے۔

انعم، دعا کو اپنے گھر میں پناہ دے دیتی ہے۔ انعم کی ساس کینڈا اسے ملنے آتی ہیں۔ انہیں بات پسند نہیں آتی۔ وہ انعم

اور دعا کا موازنہ کرتی ہیں۔ یہ بات دعا کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ وہ انعم کو اس کی بے اولادی کا احساس دلاتی ہیں۔ عمیر کا طائفہ جسے میں بچ جاتا ہے۔ ریاض احمد، عمیر اور نوال کی بے رحمی، رابعہ احمد کو اپنی غلطیاں سونپنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عمر کی حالت میں ماں سے بھی بدگیزی کرتا ہے اور الیاس احمد سے بھی پیسوں کا تقاضا کرتا ہے اور سارا راج مریم کے سامنے اگل دیتا ہے۔ دونوں کا جھگڑا ہو جاتا ہے اور عمر، الیاس احمد پر ناز کھول دتا ہے۔ عمیر، الیاس احمد کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مریم، عمیر کو عمر اور الیاس احمد کے گٹھ جوڑ اور سازش کا بتاتی ہے۔ عمر کو پولیس کاڈر لے جاتی ہے۔ تقاضے میں اس پر تشدد ہوتا ہے۔ عمیر اور ریاض احمد تقاضے جاتے ہیں جہاں سے رہائی پانے کی خاطر عمر انہیں بچ بچ بتا دیتا ہے۔

تبریز احمد، مریم کو اس کے جیسے کی جائیداد دے کر بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ مریم کو ان کی بے رحمی بہت کھلتی ہے۔ وہ الیاس احمد سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ الیاس احمد اپنی جگہ شرمندہ ہوتا ہے۔

احسن اپنی ماں اور بیوی کو ہر ممکن روکنے کی کوشش کرتا ہے، مگر ناکام رہتا ہے۔ اس کی دعا سے شادی ہو جاتی ہے۔ وہ دعا کو اپنے ساتھ کالین دلاتا ہے، دعا اس نئے رشتے سے خوش ہے۔ جب کہ انعم متنازعہ کیفیات کا شکار ہے۔

رابعہ احمد کو عمر بہت یاد آتا ہے۔ وہ عمیر سے معافی مانگتی ہیں۔ عمیر نہ چاہتے ہوئے بھی ماں کی ہر خطا کو معاف کر دیتا ہے۔

الیاس احمد کی کوششوں سے عمر رہا ہو کر گھر آ جاتا ہے۔ اس کی ندامت پر سب اسے معاف کر دیتے ہیں۔ الیاس احمد اپنے اور مریم کے درمیان جاری سرد جنگ کو ختم کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

انعم، دعا اور احسن کو چھلنے ملنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور ذرا سی بات کا افسانہ بنا کر احسن کے ہاتھوں دعا کو ذلیل کر دیتی ہے۔ انعم، دل آرا کو بھی دعا سے بات کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ دل آرا، احسن کو معاملہ جی سے کام لینے کا مشورہ دیتی ہیں۔ اپنی بے عزتی پر دعا کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔

دسویں قسط

انعم خوش تھی بے حد خوش۔ اس کے ہاتھ نیا اور دلچسپ موضوع آ گیا تھا۔ دعا کی رات والی حرکت نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا، اب وہ پوری آزادی سے کھیل سکتی تھی۔

”ان بلیو سہل احسن! اس نے آپ کو بھی بیڈ روم سے نکال دیا۔“ اس نے جوں کا جگ ٹھیل پر دھرا۔

وہ رات سے کوئی دس بار یہ جملہ کہہ چکی تھی۔

”کالا نہیں، بہت تمیز کے ساتھ چلے جانے کو کہا تھا۔“ احسن نے ”نکال دیا“ کی گنج کی۔

یہ جملہ اس کی مردانگی پر تازہ زبانہ تھا۔ انعم کو احساس نہیں تھا کہ وہ اسے کتنا نارج کر رہی ہے۔ وہ جلدی سے آفس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

”ایک ہی بات ہے، اسی لیے ہمارے بزرگ

نسلی اور خاندانی ہونے پر زور دیتے ہیں۔“ وہ بڑے مدبرانہ انداز میں سر ہلا رہی تھی، احسن کو تپ چڑھ گئی۔

”جہیں کچھ زیادہ ہی جلدی بزرگوں کے فرمان پاد نہیں آ گئے۔“ اس کا لہجہ بنیدہ اور آنکھیں سرخ تھیں۔

”ماما جی کو یقین تھا کہ دعا بہت معصوم اور خاندانی ہے۔“ وہ شہنشاہی۔

”ماما جی! زندہ باد۔“ اس کی ہز برائی ان کے کھاتے میں ڈال کے خود بری الذمہ ہوا جاسکتا تھا۔

”اسے اس گھر میں رکھتے ہوئے تمہارا بھی یہی موقف تھا۔“ اس نے بھی اپنے اندر کی جلن کم کی۔

”مجھے تو سخت غصہ آ رہا ہے احسن! آپ ہمارے مجازی خدایا ہیں، آپ کا اجزاء ہم پر واجب ہے۔ میں نے بھی آپ کو آف تک نہیں کہا، اس نے

اتنی افسانہ کر دی، میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔ وہ ایسی ہی غصیلی اور جنگ جوشی۔

”پلیز پہلا جھگڑا ابھی تک طول پکڑے ہے اور تم دوسرے کی تیاری کر رہی ہو۔ بہتر ہے کہ تم دونوں اپنی لمٹ میں رہو، گھریلو معاملات میں مجھے مت ٹھیسو۔ یہ نہ ہو کہ مجھے ماما کو واپس بلانا پڑے۔“

وہ جوس کا بھرا گلاس میز پر پٹختا کھڑا ہو گیا، اس کا اندازہ درست لگتا تھا۔ وہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

انہم لمحہ بھر کے لیے سہم گئی، اسے غصہ بہت کم آتا تھا۔

”کسی کے بارے میں اتنی جلدی حتیٰ رائے نہیں قائم کر لیتے، جی ازاںے گڈ گرل۔“

اسے بریف کیس اٹھانے سے پہلے باور کروانا پڑا۔

”یہ آپ کا سیلف ڈیفنس ہے یا اس کی طرف داری۔“ باہر نکلتے اس نے اپنی پشت پر پیش محسوس کی۔

اس کا جی چاہا کہ مزے اسے کرارا سا جواب دے۔ وہ نئی جلدی ایک جانب ہو گئی تھی یہ شادی کوئی عاشقی معشوقی کے چکروں میں نہیں ہوتی تھی۔

”خدا حافظ۔“ اس نے زور دار آواز میں کہا، مرکزی دروازہ ”ٹھاہ“ سے بند کرتا باہر نکل گیا۔

☆.....☆

عمر نے انکڑائی لے کے ٹائلیں بیڈ سے نیچے اتاریں، چنبل حیدروں میں اڑس کے، تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کے دونوں پٹ وا کر دیے۔ اس نے پورچ میں نیچے جھانکا جہاں ریاض احمد بار بار گاڑی اشارت کر رہے تھے، گاڑی چل کے نہیں دے رہی تھی۔ وہ جلدی سے کھڑکی کے سامنے سے ہٹا اور سڑھیاں اترنے لگا، اس کے باہر آنے تک ریاض احمد گاڑی کا بونٹ اٹھا چکے تھے۔

”نہیں پاپا جان! میں دیکھتا ہوں کیا خرابی

ہے؟“ بڑی ہمت بیچ کر کے وہ آگے بڑھا۔ جتنا وہ سنا چکا تھا اب ازالہ بھی کرنا تھا۔

انہوں نے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ اسے معاف ضرور کر چکے تھے مگر دل و دماغ اس کی طرف سے صاف نہیں تھے۔

”ہوں.....“ انہوں نے نظریہ ہنکارا بھرا۔

”نہیں تم جا کے نیند پوری کرو پھر جھگڑا سنا سنا کر، میں خود کچھ لوں گا۔“

”آپ کے ہاتھ کالے ہو جائیں گے۔“ اس نے ہمت نہ ہارتے ہوئے وجہ بتائی۔

بہت برسوں کا حساب اس کی طرف لگتا تھا، جو دکھ وہ انہیں پہنچا چکا تھا۔ اس کی بھری پائی آسان نہیں تھی لیکن وہ ثابت قدمی سے کوشش کرنے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔

”ہاتھ کالے ہو جائیں تو صابن سے دھل جاتے ہیں جو کالک میرے منہ پر لی گئی ہے کسے دھلے گی۔“

عمر کا چہرہ سرخ ہو گیا، کتنا ہی سچ تھا، اسے لگا جیسے اس کے وجود میں کسی نے تیز دھار جھگڑا کھوٹا ہو۔

”کاش میں اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کر سکوں۔“ اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

”مگر تم سے گناہ مرزد ہوئے ہیں اور گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔“ انہوں نے ایک اور نشتر چبھوایا۔

”میں یہ کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔“ اس نے انگلیاں مروڑیں۔

”میں نے سارا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے تمہیں معاف کر دیا ہے، وہ میری یتیم دبیر بھانجی کے ساتھ زیادتی کرنے والوں سے ضرور بدلہ لے گا۔“ انہیں اس کی موجودگی ناگوار گزر رہی تھی۔

”میں اس سے بھی معافی مانگ لوں گا۔“ بڑی شرمندگی سے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اس کا سامنا کرنے کی، خود میں ہمت نہیں پاتا تھا، نہ ہی اب تک اس کا ذکر زبان تک لایا تھا۔

”وہ مصحوم تمہارے لگائے گئے الزام کو سینے

سے لگائے، اپنے لب سے، کسی سے شکوہ کیے بغیر، اپنے بھائی کے ساتھ بہت دور جا چکا ہے۔“

گاڑی ٹھیک ہو گئی تھی، انہوں نے سر باہر نکال کے بونٹ گرا دیا۔

وہ نا جی سے باپ کو دیکھ اور سن رہا تھا کیونکہ وہ حقیقت سے لاعلم تھا۔

”کچھ گناہ اتنے کبیرہ ہوتے ہیں کہ ہم زندگی بھر ان کی بھری پائی نہیں کر پاتے، جاؤ ڈھونڈ کے لے آؤ اسے۔ میں بھی مرنے سے پہلے معافی مانگ لوں گا ورنہ روز محشر بہت سے ہاتھ میرے گریبان تک آئیں گے۔“

وہ اس حیرت کے بت کو چھوڑ کے، فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھے۔

ریاض احمد نے ہارن پر ہاتھ رکھا، عمر اپنے حواسوں میں لوٹا راستے سے ہٹ گیا۔

☆.....☆

اگلی صبح دعا بہت فریش اور ہلکا پھلکا ذہن لیے اٹھی تھی، اس نے تمام اذیت بھرے خیالات ذہن سے جھٹک دیے اور ارادہ باندھ لیا کہ وہ کسی پر مجبور سا اور ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرے گی تب ہی اس کا اس گھر اور رشتے سے نباہ ممکن ہو سکے گا۔

احسن کبھی بھی مکمل اس کا نہیں ہو سکتا تھا، وہ ایک بنا ہوا انسان تھا۔ انہم کا مضبوط پشت پناہ بھی اسے احسن سے ضرورت سے بڑھ کر توقعات اور لگاؤ نہیں رکھنا چاہیے۔ فل سائز چائے کا گم بنا کے وہ لاؤنج میں ٹی وی لگا کے بیٹھ گئی۔

انہم اپنے کمرے سے باہر آئی تو اسے اتنے آرام دہ انداز میں بیٹھا دیکھ کے سلگ کے رہ گئی۔

”تم نے رات احسن کو بیڈروم سے کیوں نکالا تھا؟“ وہ اس کے سر پر کھڑی تھی۔ اس سے دعا کا سکون برداشت نہیں ہوا تھا۔

دعا کے تلووں میں گئی سر پر بھیجی۔

”یہ میرا اور احسن کا پرسل میٹر ہے، اپنی پراہلم۔“

دعا نے ٹی وی کا دایوم کم کیے یا اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”تمہارا دماغ بہت آسان پر چڑھتا جا رہا ہے دعا۔“ وہ بد مزہ ہو گئی۔

دعا بول نہ سکی تھی لیکن اتنی تو پر اعتماد تھی کہ وہ انہم کو تیز میں لپٹا جواب دے سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اتنے برس اس کی پرانی دوست رہی تھی۔

”آف کورس، اتنے پنڈم اور رچ پر سٹائی کی دائف ہوں، پراؤڈ ہونا تو بنتا ہے ناں۔“ وہ اسی کے انداز میں کہتی چائے۔ پیسے ملی۔

”تم اچھا نہیں کر رہی ہو دعا۔“ اس نے نخوت

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست آمنہ ریاض - 300/-

بڑا آدمی نسیم سحر قریشی - 400/-

فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل - 300/-

دل اک گلشن رضیہ جمیل - 300/-

سوچ مگر کی رانی رضیہ جمیل - 350/-

حتا نادرہ خاتون - 550/-

چلن نادرہ خاتون - 300/-

بزرگ ناولز کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

32216361 اردو بازار، کراچی، فون: 37

سے سر جھٹکا۔

”اور جو تم نے میرے ساتھ کیا، وہ کس زمرے میں آتا ہے۔ یہ شادی تمہاری رضا مندی اور فورس کرنے پر ہوئی تھی، میں اور احسن ایک دوسرے میں انٹرنڈ نہیں تھے۔ نجائے تمہارے دل میں کون سے خدشات بیٹھ گئے ہیں! جو تم مس بی ہو پر اترا آئی ہو، ان تمام میٹرز سے ہٹ کے ہم دونوں فریڈ بھی تو ہیں اور اگر تمہیں میرے اور احسن کے ریلیشن سے پر اہم ہے تو اسے اپنے بیڈ روم تک محدود رکھو، مجھے قطعاً ضرورت نہیں ہے تمہارے احسن کی۔“

دعا اسے بڑی اپنائیت سے سمجھائی، کپ ٹیل پر دھرتی کھڑی ہوئی۔

”یہ تم کس سچے میں بات کر رہی ہو دعا! آخر تم چاہتی کیا ہو، ہمارے خاندان میں عورتیں شوہر کے لیے ایک بھی غلط حرف منہ سے نہیں نکالتیں اور تم ہو کہ پڑھے چلی جا رہی ہو۔“ انم کی کھوپڑی الٹی گھوم گئی تھی۔

وہ تو اس کا دل اپنی طرف سے صاف کرنے کے لیے لٹا تھا۔ کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اپنا سر دیوار پر دیے مارے۔ انم نے اپنی ایسی ذہنیت بھی ظاہر نہیں کی تھی۔

”مجھے پتا ہے کہ شوہر کی کیسے اور کتنی عزت کرنی ہے، یہ مجھے تم سے سیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ دعا ریوٹ صوفے پر اچھال کے، اس منظر سے ہنسنے کے لیے میز حیاں چڑھ گئی۔

تب ہی لینڈ لائن فون کی تیل بجنے لگی، انم مڑ کر اسٹینڈ تک گئی، یہ فون شاذ و نادر ہی بجتا تھا۔ اس کا شک درست تھا، ہی ایل آئی پر دل آرا کا نمبر تھا، وہ یقیناً دعا کی آواز سننے کی خواہاں تھیں، انم مسکرا دی، اسے کھیلنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔

☆.....☆

ماں کی زبان سے ساری سچائی سن کے وہ گنگ رہ گیا۔ اس کے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ وہ ساکت

تھا، آنکھیں خشک تھیں اس کی سوچ یہیں تک تھی کہ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی، گھر کے کسی کونے کھدے میں چھپی بیٹھی ہے یا اپنے کمرے تک محدود ہے۔

اس کا انم تھا کہ جیل میں سزا کاٹ کے، مہنا ہوں کا کفارہ ادا ہو گیا مگر اصل سزا تو اب شروع ہوئی تھی۔ امتحان گاہ میں تو اب آیا تھا، رابعہ احمد اسے دعا کو ڈھونڈنے کا کہہ رہی تھیں۔ خود کو کوس رہی تھیں پھر وہ اللہ سے اپنی بھلائی اور مغفرت کی دعا مانگتے لگیں۔ دعا کی حفاظت اور عزت و آبرو کی سلامتی مانگتے ان کا دھیان بالکل عمر کی طرف نہیں تھا، جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆.....☆

لینڈ لائن فون کی تیل بجی، انم تیر کی سی پھرتی سے کمرے سے نکلی اور سی ایل آئی پر نمبر دیکھا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ناہید..... ناہید.....“ اس نے ملازمہ کو آواز دی، اس کا ذہن تانے بانے بن رہا تھا وہ بہت آگے تک سوچنے لگی تھی۔

”فون اٹھاؤ ناہید!“ اس نے سنجیدگی سے حکم دیا۔

اس نے لپک کے فون اٹھایا، انم کی مشکوک حرکات اس کی عقل سے بالاتر تھیں۔

”ہیلو..... جی کون؟“ اس نے حسب معمول جملہ دہرایا۔

”دیکھی ہو ناہید! میری دعا سے بات کرنا آؤ۔“

دل آرانے حال پوچھ کے مطلب کی بات کی۔

گھر میں سیاست چل رہی تھی یارویوں میں تانی آگئی تھی، ان کی عقل سے سب بالاتر تھا۔

”ٹھیک ہوں بی بی جی! ابھی دعا بی بی کو بلاتی ہوں۔“ ناہید نے کن اکھوں سے انم کو دیکھتے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ انم نے اس کے ہاتھ سے ریسیور تھام کے الٹا رکھ دیا۔

”ماما جی سے کہو کہ دعا کا جواب ہے کہ وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”جج..... جی بی بی.....“ اس کی زبان لڑکھرائی اور آنکھیں پھیل گئیں۔

وہ گواہ بھی کہ جھوٹ اس خاندان کی سرشت میں شامل نہیں۔

”جو میں نے کہا، تم نے سنا نہیں ناہید!“ انم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ وہ خاندانی ملازمہ تھی، بالکن کے رحم و کرم پر۔ اس نے تھوک نکل کر ریسیور اٹھایا۔

”جی بیگم صاحبہ! دعا بی بی کہہ رہی ہیں کہ وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔“ ناہید بار بار اسے دیکھتی سب کہہ رہی تھی۔

”کیا اس نے یہ کہا؟“ دل آرا بے یقین ہو گئیں۔ جہاں تک وہ دعا کی فطرت کو جانتی تھیں وہ اتنی بد نیز نہیں تھی۔

”تم دو بارہ سے جاؤ اس سے کہو میرا حکم ہے کہ فوراً فون تک آئے۔“ ان کا غصہ سوا نیز سے پر پھٹ گیا۔

اس گھر میں کیا چل رہا تھا، کون صحیح تھا کون غلط۔ انم سے کچھ پوچھنا بے کار تھا، اس کا ردنا احسن کے گرد ہی گھومتا تھا، احسن کو وہ اس ساری چیخ و پکار سے دور رکھنا چاہتی تھیں۔ اب کے ناہید نے خود ریسیور الٹا رکھا۔

”وہ بہت غصے میں ہیں، دعا بی بی کو پھر سے بلانے کا حکم دیا ہے۔“ وہ بڑی مشکل میں شخص لگی تھی، ایک مالکن حاضر می دوسری غیر حاضر۔ ایک سیر بھی تو دوسری سوا سیر۔

”کہہ دو کہ دعا نے دروازہ لاک کر لیا ہے، تمہارے دستک دینے اور آوازیں دینے پر بھی نہیں کھولا۔“

انم کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس نے چار دنا چار فون اٹھایا اور گلا کھٹکا۔

انم مسکراتی ہوئی مڑ گئی، اسے خود ساختہ انتقام کے علاوہ کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ وہ اس احساس سے بھی عاری ہو چکی تھی اگر اس کا جھوٹ پکڑا گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے ماں کی نظروں سے گر جائے گی۔

☆.....☆

احسن شام کو گھر لوٹا تو انم نے اسے بڑے خوش گوار موڈ میں پہلی دی۔ اس نے دعا سے ہونے والی گفتگو کا بالکل ذکر نہیں کیا، دعا یکن میں کھانا تیار کرتی رہی، اس نے سب کچھ شوہر کا من پسند بنایا تھا۔ احسن اسے یکن میں کام کرتا دیکھ کے مطمئن ہو گیا، ملازمہ کے ساتھ دل کے اس نے ٹیل لگائی۔ ڈزرتیوں نے ساتھ بیٹھ کے کیا۔

دس بجے کے بعد جب وہ کمرے میں آیا تو وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔

”دیکھی طبیعت ہے تمہاری دعا؟“ اس نے تمہید باندھی۔

”بہتر ہوں۔“ اس نے کتاب بند کر کے مختصر جواب دیا۔

وہ گزرے وقت کی رعش دل میں نہیں رکھنا چاہتی تھی حالانکہ اسے احسن کی ایک طرف گفتگو نے گہرا دکھ دیا تھا۔

”کتاب پڑھ رہی تھیں؟“ اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”جی، آج ہی شروع کی ہے۔“ اس نے نظریں جھکائے جواب دیا۔

”دن بھر کیا کرتی ہو؟“ وہ اس کے قریب تک گیا۔

”کچھ خاص نہیں، کتاب پڑھنا، ٹی وی دیکھ لیا یا پھر یکن۔“ اس نے صاف بتایا۔

”ہماری شادی کی وجہ سے، تم دونوں کی مثالی دوستی دشمنی میں بدل گئی ہے درنہ تمہارے آنے سے انم بہت ریلیکس اور خوش ہو گئی تھی۔ تم دونوں کے پاس ڈیویر دل تھے ہوتے تھے اور اب.....“ اسے

گھریلو تناؤ پر انفس ہو رہا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ دونوں اس کے دائیں، بائیں بیٹھیں، وہ لکڑی کے گھڑی اور قہقہے لگائیں، کسی کے بھی دل میں دوسرے کے لیے خلش نہ ہو۔

”بھری کسی سے کوئی دشمنی نہیں، انم شاید خود کو ان سکور فیل کرنے لگی ہے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میری زندگی میں خوشی کا قیام صرف چند دن ہے۔“

دو دھڑکنے لگے میں بولتی ناخن کھرچ رہی تھی۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“ احسن نے اس کی حرکت کو بخور دیکھا، اس نے اس کا اندرونی اضطراب بھانپ لیا تھا۔

”یہ گھر اور شوہر انم کا ہے، جب میرا یہاں کچھ ہے ہی نہیں تو فیملی کونسی؟ میرا مالک اوپر بیٹھا ہے، وہی میرا محافظ ہے۔“ اس نے بات ختم کر دی، اس کی سوچ میں نئی تبدیلی آ گئی تھی۔

”بھی دل نہیں چاہا کہ یہ گھر اور شوہر تمہارا بھی ہو جائے۔“ اس نے ٹٹولا۔

”مجھے قفسہ کرنا یا چیننا آتا تو میں یہاں آپ لوگوں کے درمیان نہ ہوتی۔ میں اتنی بے وقوف ہوں کہ مجھے اپنا حق مانگنا بھی نہیں آتا۔“ وہ طنز یہ لہی۔

”لیکن تمہیں بولنا تو خوب آتا ہے۔“ اس نے ہلکی سی چوٹ کی۔

”میرے پاس اتنی عقل ہے کہ صبح اور غلط میں فرق کر سکوں، میں نے کبھی کسی سے زبان درازی نہیں کی۔ ہاں اگر کوئی پیچھے رہے گا تو جواب دوں گی ناں۔“ اس نے نظریں اٹھا کے، سیدھا احسن کی آنکھوں میں دیکھا۔

”جواب دو گی یا مقابلہ کرو گی؟“ اس نے ٹانگ کھینچی۔

”میرا انم سے کوئی مقابلہ نہیں، یہ حقیقت میں آپ کے لیے ہاں مہرتے ہوئے بھی جانتی تھی۔ وہ سب کچھ خود ہی فرض کیے جا رہی ہے۔ ہاں، اگر وہ میری ذات پر اٹکی اٹھائے، مجھے اور میرے خاندان کو برے الفاظ سے نوازے تو میں بالکل خاموش نہیں

رہوں گی۔ یہ کوئی مذہب طریقہ نہیں ہے کسی کو تار چ کرنے کا۔“ دعائے ناخنیں بند سے نیچے تار لیں۔ احسن کے ذہن میں بچن والا واقعہ گھوم گیا، انم واقعی بہت بدگمان ہوئی تھی یا پھر ان سکور فیل کر رہی تھی۔

”تم ذرا برداشت کر لیا کرو، گھر میں بے سکونی کری ایٹ کرنے کا فائدہ۔ تمہارے ذرا سا جواب دینے پر وہ کتنا بھڑکی۔ بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا، اگر تم محل کا مظاہرہ کرتے تھوڑی سی برداشت۔“

”تھوڑی سی نہیں، مجھ میں بہت برداشت ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک ہر رشتے کی زیادتی پر صبر کر رہی آئی ہوں۔ ایک بار اور سہی۔“ وہ کہہ کر اٹھ گئی۔

اس کے حصے میں صبر دخل اور برداشت اور سمجھوتا ہی آتا تھا، اس نے خود سے قبول کر کے، احسن پر احسان کر دیا تھا۔

”اب کہاں جا رہی ہو؟“ وہ بھی سیدھا ہو گیا۔

”انم سے لڑنے۔“ وہ رکی۔

احسن کا سانس رکا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ آپ کے لیے کافی بنائے۔“ وہ جان واری ہنسی ہنستے باہر کود گئی۔

احسن نے شکر کا سانس لیتے کراؤں سے سر ٹیک لیا۔

☆ ☆ ☆

انم مووی لگا کے بیٹھ گئی تو احسن فائلز اٹھائے دعا کے کمرے میں آ گیا۔ وہ کل والی کتاب بڑے انتہاک سے پڑھ رہی تھی، ابھی اس نے لیپ ٹاپ کھولا ہی تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی، اس نے مسکراتے ہیں کا بٹن دبایا۔

”السلام علیکم ماما جان!“ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ دعا کے بھی کان کھڑے ہو گئے، اس کے دل میں کئی بار خیال آچکا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد، ساس صاحبہ نے ایک بار بھی خیریت دریافت کرنے

کی رحمت نہیں کی، کیا وہ بھی انم کی حامی ہیں۔

☆ ☆ ☆

”السلام علیکم ماما جان!“ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ دعا کے بھی کان کھڑے ہو گئے، اس کے دل میں کئی بار خیال آچکا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد، ساس صاحبہ نے ایک بار بھی خیریت دریافت کرنے

کی رحمت نہیں کی، کیا وہ بھی انم کی حامی ہیں۔

☆ ☆ ☆

”السلام علیکم ماما جان!“ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ دعا کے بھی کان کھڑے ہو گئے، اس کے دل میں کئی بار خیال آچکا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد، ساس صاحبہ نے ایک بار بھی خیریت دریافت کرنے

کی رحمت نہیں کی، کیا وہ بھی انم کی حامی ہیں۔

☆ ☆ ☆

”السلام علیکم ماما جان!“ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ دعا کے بھی کان کھڑے ہو گئے، اس کے دل میں کئی بار خیال آچکا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد، ساس صاحبہ نے ایک بار بھی خیریت دریافت کرنے

کی رحمت نہیں کی، کیا وہ بھی انم کی حامی ہیں۔

☆ ☆ ☆

”السلام علیکم ماما جان!“ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ دعا کے بھی کان کھڑے ہو گئے، اس کے دل میں کئی بار خیال آچکا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد، ساس صاحبہ نے ایک بار بھی خیریت دریافت کرنے

کی رحمت نہیں کی، کیا وہ بھی انم کی حامی ہیں۔

☆ ☆ ☆

”السلام علیکم ماما جان!“ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ دعا کے بھی کان کھڑے ہو گئے، اس کے دل میں کئی بار خیال آچکا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد، ساس صاحبہ نے ایک بار بھی خیریت دریافت کرنے

”میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی، آپ ہماری بڑی ہیں۔ آپ کے دل میں میرے لیے انم جتنی محبت نہیں مگر انصاف اور رحم دلی ہے۔ اب واحد آپ ہی تو ہیں جن کے سامنے میں اپنا من لگا کر سکتی ہوں۔ آج بھی اگر احسن میرے پاس نہ ہوتے تو شاید بات نہ ہو پائی حالانکہ میں آپ کی ہی ٹوٹی بہو ہوں۔“ بات کے اختتام تک، دعا کا لہجہ خوش گوار ہو گیا۔

”سنو دعا! ابھی احسن تمہارے ساتھ ہے، تم اس کے ساتھ ٹائم گزارو۔ میں صبح تم سے رابطہ کر دوں گی، ادا کے اللہ حافظ۔“ انہوں نے اپنی کہہ کر فون بند کر دیا۔

دعا حیرت سے بند موبائل کو دیکھتی رہ گئی اسے تو بہت کچھ کہنا اور پوچھنا تھا۔

”کیا ہوا، بند ہو گیا۔“ اس نے اسکرین سے ذرا کی ذرا نظر ہٹا کے پوچھا۔

”جی، آنٹی کہہ رہی ہیں صبح کال کریں گی۔“ اس نے موبائل احسن کو پکڑا دیا۔

”تم میری وجہ سے ڈسٹرب تو نہیں ہو گی۔“ احسن کا اشارہ فائلز اور لیپ ٹاپ کی طرف تھا۔

”نہیں، اٹس اوکے۔“ اس نے خیال سے چونکتے اس نے فون میں سر ہلایا اور پھر سے کتاب کھول کے پڑھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

مریم بچوں کو اسکول بھیج کے ٹیبل صاف کر رہی تھی، الیاس احمد رات آنے والے میسر پڑھ رہا تھا، رابعہ احمد ڈنڈے لیے آئیں، مریم ان پر نظر پڑے ہی پھرنی سے بھاگی۔

”بھابی جان آپ۔۔۔۔۔ آپ ہمارے گھر۔۔۔۔۔ کتنے عرصے بعد آپ نے ہمارے گھر کو رونق بخشی ہے۔“ مریم ڈسٹر ٹیبل پر پھینک کر ان کے گلے جا لگی۔ الیاس احمد بھی بھابی کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔

”السلام علیکم بھابی جان!“ اس نے سر آگے کو

جھکا دیا۔

”وعلیک السلام! جیتے رہو، آباد رہو۔“ انہوں نے دل سے دعا دی، مریم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”قسم سے بھابی جان! میرا دل خوشی سے بھٹ جائے گا، آپ کی پر خلوص دعاؤں کو ہم ترس گئے تھے۔“ وہ ان سے الگ ہوتی کھد رہی تھی۔

”جب دل مطمئن اور پرسکون ہو تو دعائیں خود بخود نکلتی ہیں۔ میں کافی دنوں سے آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن عمر کے ساتھ مصروف رہی۔“ انہوں نے ڈونگا نیل پر رکھ دیا۔

”اس میں کیا ہے بھابی جان!“ الیاس احمد نے دھکنا اٹھایا۔

”تمہیں فیرونی پسند ہے ناں، میں نے رات بنا کے فریج میں رکھ دی تھی۔ اتنے عرصے بعد خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔“ وہ مریم کے ساتھ صوفے کی طرف بڑھ گئیں۔

”بھابی جان! کیا الیاس ہی آپ کے چہیتے ہیں، جو ان کے لیے بنا کے لاتی ہیں اور میں.....“ مریم نے منہ مبورا۔

”تمہاری پسند کی ایک نہیں پوری تین ڈشز بناؤں گی۔ آج رات ڈنر پر ساری فیملی انوائٹڈ ہے۔“ وہ انہیں دعوت دینے آئی تھیں۔

”میری پیاری بھابی جان! چوبہزاروں سال، آپ کے ہاتھ کا پکا کھانے کو ترس گیا ہوں میں۔“ الیاس احمد پر جوش ہو گیا۔ اپنی بھابی کے ہاتھ کے ذائقوں کا وہ مداح تھا۔

”الیاس میں تمہارا شکر یہ ادا کرنے آئی تھی۔“ انہوں نے آنے کی اصل وجہ بتائی۔

”کیسا شکر یہ بھابی جان!“ اس نے ڈونگا اٹھا کے گود میں دھر لیا۔

”تم نے عمر کو رہا کروا کے، مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“ انہوں نے تہہ دل سے شکر یہ ادا کیا۔

”کیا مطلب عمر کو رہا، انہوں نے کروادیا

ہے۔“ مریم اس حقیقت سے بے خبر تھی۔

”جانے دیں شرمندہ نہ کریں، میں نے تو صرف اپنے گناہوں میں کمی کروانے کی کوشش کی ہے۔“ وہ گناہ جس کی سزا مجھے ابھی تک مل رہی ہے۔“

اس نے ایک طائرانہ سی نگاہ مریم پر ڈالی جس نے فوراً رخ پھیر لیا۔

☆.....☆

وہ ریوالونگ چیز برآگے ہو کے بیٹھا، آہستہ سے دائیں سے بائیں اسکرین پر نظریں رکھے تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ موبائل کی بیل ہوئی تو اس نے ایک ہاتھ سے موبائل اٹھا کے لیس کا بٹن پش کیا۔

”السلام علیکم! ماما جان۔“ وہ سب کام چھوڑ کے، کرسی کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔

”وعلیک السلام احسن بیٹا! کیسے ہو؟“ انہوں نے احوال پوچھا۔

وہ کسی ضروری کام کی غرض سے ہی اسے آفس ٹائمنگ میں ڈسٹرب کرتی تھیں ورنہ وہ رات کو کال کر لیا کرتیں۔

”میں بالکل فٹ فائٹ ہوں، آپ بتائیں، کیسے یاد فرمایا۔“ وہ ماں کی عادت سے بخوبی آگاہ تھا۔

”احسن سارے کام چھوڑ کر مارکیٹ جاؤ اور دعا کو موبائل اور سم لے کر دو۔“ ان کا انداز حکم بھرا تھا، مطالبہ بھی دو ٹوک تھا۔

”کیا ہوا ماما جان! خیریت، اتنا جنت آرڈر۔“ وہ ماں کے انداز پر کھڑا گیا۔

”مجھے دعا سے بات کرنا ہوتی ہے بیٹا۔“ اپنی جتنی پر قابو پا کے، انہوں نے خود کو پرسکون کیا۔ وہ اسے گھریلو سیاست سے دور رکھنا چاہتی تھیں۔ اس پر انہم کا جھوٹ کھولنا بھی مناسب نہیں تھا پھر یہ ان کا اور انہم کا ذاتی معاملہ تھا۔

”وہ بھی تو میری بہو ہے پھر۔ موبائل تو اس ماڈرن ایجنٹ کی ضرورت بن گئی ہے۔“ انہوں نے

مناسب الفاظ میں اسے ٹالا۔

”آپ اسے لینڈ لائن پر کال کر لیا کریں۔“ احسن کے دل میں فٹ سے انہم کی دل آزاری کا خیال خود آیا، اسے یقیناً یہ بات بہت بڑی لگتی۔

”نہیں احسن لینڈ لائن پر دعا بہت جھجک کر بات کرتی ہے، شاید اسے انہم کے دس ہارٹ ہو جانے کا ڈر ہے جب کہ میرے لیے وہ دونوں ہی برابر ہیں۔“ انہی تو گھنٹوں میرے ساتھ لگی رہتی ہے۔ دعا میں یہ اعتماد نہیں ہے، میں چاہتی ہوں کہ اس کی سوچ اور پرسنائی بھی تھوڑی سی بہتر ہو جائے۔ میں اسے اپنے خاندان، وراثت اور اقدار بتاؤں، اسے تمہارے باپ کا بھی سامنا کرنا ہے اور ہماری فیملی میں سرد مہذبھی۔“ انہوں نے اسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔

اسے ماں کے کسی حکم یا کام پر اعتراض نہیں تھا بس انہم کی فکر دامن گیر تھی۔

”اچھا اب جاؤ، میں تھوڑی دیر بعد تمہیں کال کر کے اس کا نمبر لوں گی، ادا کے اللہ حافظ۔“

انہوں نے اپنی سنا۔ کمر فون بند کر دیا کیونکہ انہوں نے بیٹے کی خاموشی محسوس کر لی تھی اور وجہ بھی وہ جانتی تھیں مگر وہ جانتی تھیں کہ اس کے لیے ماں کا حکم اولین تھا۔

☆.....☆

اس نے مارکیٹ جا کر فون خریدا، سم ڈال کے ایکٹیویٹ کی اور اس کا نمبر دل آرا کو سینڈ کر دیا۔ وہ نئے پراجیکٹ پر کام ادھورا چھوڑ کے آیا تھا۔ کل اس کی بہت اہم میٹنگ تھی لیکن ماں کا کام کرنا بھی ضروری تھا اس لیے وہ سیدھا دعا کے کمرے میں گیا۔

”دعا.....“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی آواز دی۔

”جی.....“ وہ بیڈ شیٹ درست کرتی بیٹھی۔

”آپ اس وقت؟“ وہ اس کی اچانک آمد پر حیران رہ گئی۔

”میں تمہیں یہ موبائل دینے آیا تھا، ماما تم سے

تھوڑی دیر بعد رابطہ کریں گی۔“ اس نے موبائل اور خالی ڈبا اسے پکڑ لیا۔

”واؤ! اتنا خوب صورت موبائل۔“ وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔

”اس کی بھلا کیا ضرورت تھی، مجھے کون فون کرے گا۔“ اس نے دل گرفتگی سے کہا، چند لمحے قبل والی خوشی مامی میں بدل گئی۔

”ماما تمہیں کال کیا کریں گی، اب اس کے فٹکنشن اچھی طرح سے چیک کر لینا۔“ وہ برش اٹھا کے بالوں میں پھیرنے لگا۔

”اچھا تو جناب یہ گفت مجھے مانا دیا ہے، آپ نے نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سینے پر ہاتھ باندھے۔

”آف کورس، لیکن جو بھی ہے، پاکٹ میزری ماری گئی ہے، میں آفس میں بہت امپورٹنٹ کام چھوڑ کے آیا ہوں، نکلتا ہوں، شام کو ملیں گے۔“ احسن برش رکھ کے اس کا گال تھپکتا ہا پر کل گیا۔

”ان شاء اللہ۔“ اس نے زیر لب کہا۔

وہ بیڈ پر بیٹھ کے کسل سے موبائل چیک کرنے لگی۔

☆.....☆

انہم نہا کے نکلی تھی، سر پر تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ وہ کپڑوں کو درست کر رہی تھی جب اس نے گاڑی کے اشارت ہونے کی مدد سی آواز سنی۔ وہ لمحہ بھر میں کمرے کی کمرے کے سامنے، احسن کی گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی۔

”یہ کب آئے اور چلے بھی گئے، مجھ سے ملے بغیر۔“ وہ حیرت سے بڑبڑاتی، ماتھے پر تل ڈال کے باہر نکلی۔

”ناہید..... ناہید.....“ وہ چلا رہی تھی۔

”جی بی بی صاحبنا! وہ ڈرائنگ روم سے گرتی پڑتی نکلی تھی، انہم کے چاٹنے نے اسے حواس باختہ کر دیا۔“

”احسن کیا لینے آئے تھے؟“ اس نے استفسار

کیا۔

”پتا نہیں جی، ہاتھ میں چھوٹا سا پلاسٹک بیگ تھا، دعا صاحبہ کے کمرے میں گئے اور چند منٹ بعد ہی واپس بھی چلے گئے۔“ اس نے اپنی معلومات — یوں۔

وہ مزید تجسس لیے دعا کے کمرے کی طرف بڑھی۔

”دعا.....“ اس نے آواز دیتے دروازہ کھول دیا۔ ”ابھی احسن کیوں آئے تھے؟“ لہجہ سخت نہیں مگر خشک تھا۔

”وہ مجھے یہ موبائل دینے آئے تھے۔“ اس نے خوشی سے موبائل والا ہاتھ آگے کیا۔

”موبائل.....“ وہ حیرت سے نگاہ گئی۔

”یہ گفٹ وہ خود لائے ہیں یا تم نے منگوا یا ہے۔“

”گفٹ“ کا لفظ استعمال کرتے اسے سخت تکلیف ہوئی تھی۔

”یہ گفٹ مجھے احسن نے نہیں، آنٹی جان نے دیا ہے۔“ دعا نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔

”ماما نے.....“ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”تمہاری ماما جی سے بات ہوئی تھی۔“ اس نے اپنا خشک دودھ کرنا چاہا۔

”ہاں رات احسن کے سیل پر۔“ وہ بے خبری میں سب ج بتاتی تھی۔

انہم واپس مڑ گئی اب مزید کچھ نہیں تھا پوچھنے کو۔

☆.....☆

انہم نے بال بٹاکے، پہلا کام دل آرا کو کال کی، نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے جھنجھلا کے موبائل کان سے ہٹایا، احسن کے ساتھ بات کرنا مناسب نہیں تھا، وہ بھی انجان تھا۔

انہم کے ذہن میں دوسرے آرہے تھے اگر اس کی چوری اور جھوٹ پکڑا گیا تو.....

دوسری طرف دعا کو ایک گھنٹہ بعد پہلی کال دل آرا کی موصول ہوئی تھی۔

”السلام علیکم آنٹی جی! میں بہت شدت سے آپ کی کال کا انتظار کر رہی تھی۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”وعلیکم السلام! جی جی! میرے دل نے بھی تمہاری کال دہرائی اور شاید کبھی وہاں کیا کر رہی ہو؟“

ان کے گھٹے میں شیرینی ٹپکی تھی۔

”بہتر ہوں اور فی الحال فارغ، رات کا کھانا بنانے کی ذمہ داری میری ہے تب مصروف ہوتی ہوں۔“ اس نے بڑے عام سے انداز میں اپنی روشنی بتائی۔

”کیا مطلب ذمہ داری..... کیا تم ڈیلی کھانا بناتی ہو؟“ انہیں اچھا خاصا جھجکا لگا۔

”جی، جیب آپ یہاں تھیں تب بھی میں ہی بناتی تھی۔“ وہ ہنسی میں کہہ گئی۔

”پہلے کی بات اور کبھی دعا اب تم احسن کی بیوی ہو اور شادی کو دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ تم شام کو فریش ہو کے اسے پہنی دیا کرو، آپس میں مل جل کے بیٹھا کرو۔“ انہم کیا کرتی رہتی ہے دن بھر؟“ آخری سوال انہوں نے بڑے عام سے گھٹے میں پوچھا۔

”وہ بھی کچھ خاص نہیں، بس یوں ہی.....“ اس نے گول مول سا جواب دے دیا، وہ اب نہیں کیا بتاتی، وہ انہم کی ساس کے علاوہ ماں بھی تھیں۔

”سنو دعا! میرے ساتھ جھوٹ نہیں بولو، جو ج ہے وہ بنا جھجکے بتا دو۔ میں اگر وہاں موجود نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم دونوں آپس میں لڑتی مرنی رہو اور میرے بیٹے کو پریشان کرو۔“ انہیں غصہ چڑھ گیا۔ انہم کا غصہ وہ اس پر نکال رہی تھیں۔

”بھڑا آنٹی! میرا قصور یہی ہے کہ میں مسز احسن ہوں مگر انہم..... وہ بہت بدل گئی ہے اس کے رویے میں میرے لیے نرمی اور دوستی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اپنے کمرے میں مسمی رہتی ہے، دل چاہے تو لڑتی ہے درندہ نہیں..... اور بھی کچھ ہے جو میں شیریں نہیں کرنا چاہتی مگر پلیز..... پلیز آنٹی جان! آپ واپس لوٹ آئیں۔ آپ کی موجودگی، رہنمائی اور

سرپرستی ہی اس رشتے اور گھر کو بچا سکتی ہے۔“ اس نے تم آواز میں انہیں اشارتاً بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

دل آرا کا دماغ اور کان سائیں سائیں کرنے لگے، غلط دعا کی رپورٹ نہیں اٹھ سکتی تھی۔ دعا جھوٹ نہیں بول رہی تھی، انہیں اپنی بیٹی سے ایسی بچہ حرکات کی توقع نہیں تھی۔

”میں خود چاہتی تھی کہ سب سیٹل ہونے تک تم لوگوں کے پاس ٹھہر دوں لیکن میری مجبوری تھی۔ میں جلد آئندہ کی کو ابھی تک انعام نہیں کرا پائی۔ انہیں انہم سے بہت محبت اور لگاؤ ہے، آئی ڈونٹ نو، وہ کیسے ری ایکٹ کریں گے پھر وہ ہارٹ اور کولیسٹرول کے مریض ہیں ان کی بھی کیئر کرنی ہے۔“ وہ بھی بہت دل گرفتہ ہو گئی تھیں۔ ان کا انہم پر خشک یقین میں بدل گیا تھا۔

”تو پھر آنٹی میں کیا کروں؟“ وہ ہمدردی سے کہہ رہی تھی۔

”صبر کرو میری جان! آئی نو ویل کہ انو غیر مستقل مزاج ہے مگر وہ اپنی جلد اور ہڈیاں لٹکے گی میں نہیں جانتی تھی حالانکہ میں بہت اچھی طرح سے اس کی برین واشنگ کر کے آئی تھی۔“ دل آرا کو خود تشویش لاحق ہو گئی تھی، انہیں معاملے کی نزاکت کا خیال تھا لیکن وہ دعا کو صرف دلاسائی دے سکتی تھیں۔

”میرا دل بہت گھبراتا ہے آنٹی! انہم کا بدلتا روپ، مجھے ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں اور احسن بہت محتاط رہتے ہیں، ابھی اس کے سامنے ایک دوسرے کو مخاطب بھی نہیں کیا۔ وہ میرے بیڈ روم میں نہ آئیں، میں تب بھی گلہ نہیں کرتی کیونکہ میں اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہوں کہ ان پر زیادہ حق اس کا ہے۔ ان کی خاندانی بیوی، محبت اور بچپن کی ساتھی اور کزن ہے، میں تو بے سہارا تھی، میرا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ آپ لوگوں نے مجھے پناہ دی، نام اور رہنے کو چھت دی، میں آپ سب کی احسان مند ہوں، اس سب کے باوجود وہ مجھ سے ان سیکورٹیل کر رہی

ہے۔“ اس کے اندر کے غبار کو نکاس کا راستہ ملا تھا، وہ سب احسن سے شیر کر لیتی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر دل آرا اپنی فہم کے رستے اس کے لیے آسانیاں پیدا کر سکتی تھیں۔

”تم بس خاموش رہا کرو، اس کی بدزبانی کا برابر جواب نہ دیا کرو! اگر تم بھی مقابلہ کرو گی تو دونوں میں فرق کیا رہ جائے گا۔ ان شاء اللہ وہ بھی آہستہ آہستہ بہتر ہوتی جائے گی، ابھی نیا نیا بٹوارہ ہے پھر اس میں برداشت کی بھی کمی ہے۔“

دل آرا اسے ہی سمجھا سکتی تھیں، وہ کمزور مہرہ تھی۔ اگر وہ یہ سب انہم سے کہہ دیتیں تو وہ اودھم مچا دیتی، خود تری کا شکار ہو جاتی، اسے اپنی حیثیت ماند پڑتی نظر آتی۔ وہ خود سے کتنے ہی اندازے لگا کے سب کا جینا بحال بنا دیتی۔

”اچھا آنٹی! فون رکھتی ہوں۔“ دعا نے بہت برے دل سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کا چہرہ اداس اور سوگوار تھا۔

ہر ایک اسے ہی ممبر کا درس دیتا تھا، اس کے دل میں نیسیں سی اٹھنے لگیں۔

☆.....☆

ریاض احمد فلمی مدیم روشنی جلائے ایڑی چیریز جھول رہے تھے۔ لان میں دونوں فیملیز جمع تھیں سوائے ان کے، راجہ احمد نے بہت عرصہ بعد خاص اہتمام سے دعوت کی تھی۔ مریم بھی مدد کر رہی تھی، زین عروہ اور نوال موبائل پر ٹیم کھیل رہے تھے۔

عمر نے ایک طرف باری کیو کے لیے آگ جلائی ہوئی تھی وہ اور الیاس احمد سنج کباب بھون رہے تھے۔ ٹیبل لان میں سیٹ کی گئی۔ ملازمہ مریم کی تھلید میں قیمتی برتن احتیاط سے ٹیبل پر سیٹ کر رہی تھی۔

وہ چیر سے اٹھ کے کھڑکی تک آئے، لان کا منظر بلاشرع خوب صورت تھا مگر انہیں نامکمل سا لگا۔ کہیں کچھ کی بھی یا صرف انہیں ہی محسوس ہو رہی تھی یا پھر کوئی اور بھی تھا۔ جو ان سب کے بچ بچا بھی ذہنی طور پر حاضر نہیں تھا، جس کے ہونٹ فلمی سی اداس

مسکراہٹ کا گھیراؤ کیے تھے۔

وہ بھی نوال کے پکارنے پر عروہ اور زین کی دھاندلی کا جھگڑا مٹاتا، عمر کی پکار پر اس کا کباب چیک کر کے داد دیتا اور بھی ماں کی پکار پر ہنسی کھینچتا، چیز سیٹ کرتا، ایندول بھلا رہا تھا۔

یوں ہی دھیان اور بے دھیانی میں ان دونوں کا دل اس سیر کی لڑکی میں جا نکلتا۔ کیا بھی اس کے ہونٹوں پر کھرنی ہوگی؟ اس کا دل بھی سرور و مطمئن ہوگا، راجہ احمد دروازہ دھکیل کے اندر آئیں۔

”ریاضی! کمرے میں اندھیرا کیوں ہے؟“ انہوں نے سوچ چورڈ سے پاور لائٹ آن کی۔ ”بس یوں ہی، طبیعت ٹھیک نہیں۔“ ان کا انداز بھی ست تھا۔

”کیا ہوا طبیعت کو، کہیں درد وغیرہ تو نہیں ہو رہا؟“ وہ فوراً پریشان ہو گئیں۔ ”نہیں..... نہیں، آئی ایم ناٹ فیلنگ بیٹر۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر جا بیٹھے۔

”آپ باہر آئیں سب کے سچ، دیکھیں، کتنی رونق لگی ہے، سب جمع ہیں ان کے ساتھ بیٹھیں، دل خودی بہل جائے گا۔“ انہوں نے اپنے تئیں مفید مشورہ دیا۔

وہ کچھ بول کے راجہ احمد کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے چپ سا دھلی۔ ”نہیں، میں تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں، شور شرابے سے میرا دل گھبرانے لگے گا تم لوگ انجوائے کرو، میں نیند لوں گا۔“

وہ کہتے ہوئے لیٹ گئے۔ وہ شوہر کے مزاج سے واقف تھیں، اس انکار نے اقرار میں نہیں بدلنا تھا۔

”آپ بڑے ہیں، آپ کی موجودگی ہے تو خاندان مکمل لگے گا ورنہ سب بہت اداس ہو جائیں گے۔“ ایک آخری کوشش کی گئی۔

”جانتے ہوئے لائٹ اور دروازہ بند کر جانا۔“ انہوں نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا، راجہ احمد تاسف

سے سر ہلاتی واپس مڑ گئیں۔

☆.....☆
احسن کی واپسی پر ایک طوفان اس کا منتظر تھا، انہم نے دوبارہ دل آرا کو کال کی اس بار بھی نمبر بڑی جارہا تھا، اس نے بیچ بھی چھوڑا لیکن انہوں نے اسے کال بیک نہیں کی۔

جس سے انہم کے دل میں شک مزید گہرا ہو گیا، اب اسے احسن کی واپسی کا انتظار تھا۔ ”السلام علیکم!“ وہ سیدھا اس کے پاس ہی آیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ موبائل کو بے کردہ بارائش ہوگی۔

”تم آج آئے اور مجھ سے ملے ہی نہیں۔“ وہ سلام کا جواب دیے بغیر جرح پر اتر آئی۔ احسن نے بریف کیس رکھا، اسے انہم کے تاثرات چوڑا کر دکھائے۔ اس نے بات بڑے طریقے سے شروع کی تھی۔

”میں دعا کو موبائل دینے آیا تھا، آفس میں ضروری کام تھا اس لیے جلد لوٹ گیا۔“ وہ اس کے تیور برداشت کرتا جو جھگڑا ہوا تھا۔

”پہلے ضروری کام پتلا لیتے، سب چھوڑ چھاؤ کے موبائل کا نذرانہ پیش کرنا ضروری تھا۔“ اس نے دانت پیسے۔

احسن نے پہلی بار اس سے پوچھے یا بتائے بغیر کوئی کام کیا تھا۔ وہ بھی اپنی دوسری بیوی اور اس کی سوتن کے لیے۔

”میری ماں کا حکم تھا، اس لیے سب چھوڑ چھاؤ کے نذرانہ دینے آنا پڑا۔“ اس نے انہم کی آنکھوں میں جھانک کر کہا اور ٹائی کی ٹائٹ ڈھیل کرنے لگا۔

”اسے موبائل کی کیا ضرورت ہے، ماما جی میرے اور تمہارے نمبر پر بھی اسے کال کر سکتی ہیں، لینڈ لائن بھی ہے۔“ اس نے نیا کتہ نکالا۔

احسن سے لڑنے کی تنگ نہیں بنتی تھی کیونکہ اس نے یہ حرکت اپنی مرضی اور دعا کی خواہش پر نہیں کی تھی۔

”آئی تھنک یہ سوال ماما جان سے پوچھنا، وہی سچ سے وجہ بتا سکیں گی۔“ وہ جوتے اتار کے داش روم کی طرف بڑھا۔

”چلو، یہ میں ناما سے پوچھ لوں گی، یہ بتاؤ اتنا مہنگا موبائل کیوں لا کر دیا؟“ اس نے ایک نیا مخالف پوائنٹ نکالا جس میں زیادہ قصور احسن کا تھا۔

”کیونکہ میرا نمبر اور حیثیت مجھے اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنی بیوی کے لیے کوئی گھٹیا کوٹائی کی چیز خریدوں۔“ وہ جو داش روم نہیں گھس گیا تھا، دروازے میں رک کر مڑ کر جواب دیا اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔ انہم نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔

☆.....☆
”میں آپ سے سخت ناراض ہوں ماما!“ انہم نے بڑے لاڈ سے گلے کیا۔ اس نے خودی کال کی تھی، دات احسن دعا کے پاس سویا تھا، صبح انہم نے اسے ناشتا۔ بھی نہیں پتلا کر دیا۔

”ناراض تو میں بھی تم سے بہت ہوں لیکن پہلے تم بتاؤ۔“ دل آرا سمجھ گئی تھیں، اس لیے پہلے اسے بولنے کا موقع دیا۔

”آپ نے دعا کو موبائل گفٹ دیا ہے، وہ بھی مجھے بتائے یا مشورہ کیے بغیر۔“ دل کی چیمین لوک زبان پر آ گئی۔

دوسری طرف دل آرا تھیں، اس کی رگ رگ سے واقف، اسے کب اور کس طرح ہینڈل کرنا ہے جانتی تھیں۔

”تو کیا ہوا؟ ایک معمولی سا موبائل ہی گفٹ کیا ہے، وہ بھی تمہاری وجہ سے۔“ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف کہہ ڈالا۔

”میری وجہ سے کیوں؟ میں نے کیا کیا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تم نے میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا انہم! احسن کی ہم نے دوسری شادی مجبور کی ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میری نظروں میں تمہاری اہمیت گھٹ گئی ہے

اور اس اہمیت کو بڑھانے کے لیے تم جھوٹ کا سہارا لینے لگی ہو۔“ دل آرا کو بے حد افسوس ہو رہا تھا۔

اگر وہ پہلے ہی صبح پر خاموش رہ جاتیں تو انہم کو مزید جھوٹ ملتی اسے پہلے ہی قدم پر ٹوٹنا اور غلطی کا احساس دلا ضروری تھا۔

”کک..... کیسا جھوٹ؟“ انہم کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے سب بہت احتیاط سے کیا تھا، اس کی زبان الفاظ ادا نہیں کر پاتی تھی۔

”کیا تم منکر جاؤ گی کہ تم نے ناہید سے جھوٹ بولا۔“ دل آرا کا جی چاہ رہا تھا کہ اس غلط بیانی پر وہ ان کے سامنے ہو تو پھٹ کر مار دیں۔

”نن..... نہیں ماما جی.....“ اس کی زبان ہکلا رہی تھی، مزید جھوٹ کھڑا نہیں جا رہا تھا، سچ بتانا بے وقوفی تھی۔

”آئی ایم سوری!“ دل آرا کی خاموشی نے اس سے مبہم سا اعتراف کر دیا۔ وہ کیسے بھول گئی کہ وہ اس کی رگ رگ سے واقف ہیں۔

”تم کیوں اتنی چپ کر رہی ہو انہم! میں احسن کو انگلیزا اسٹڈیز کے لیے بھیجنے پر راضی نہیں تھی، تمہیں اس پر بھروسہ تھا تم ہی نے مجھے فورس کیا تھا۔

احسن جب سوچا تھا تم گھر میں ذرا بھی شور نہیں ہونے دیتی تھیں اور آج تم خود اس کا ذہنی سکون برباد کرنے پر مئی ہوئی ہو وہ بھی بغیر کسی وجہ کے۔ تم اپنے والدین اور شوہر سے جھوٹ۔ بولو گی، ہمیں دھوکے میں رکھو گی۔“ وہ غصے میں بولتی ہی جلی گئی تھیں۔

انہم کے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا، وہ کیوں بھول گئی تھی کہ انہیں دھوکے میں رکھنا اتنا آسان نہیں، انہوں نے اسے جنم نہیں دیا تھا پالا تو تھا۔

”میری بات غور سے سنو انہم! احسن کی دوسری شادی اس کی رضا مندی یا پسند کی نہیں ہے نہ ہی دعا کو اس میں اثر سٹ ہے۔ یہ قدم ہم نے اپنی غرض اور وارث کے لیے اٹھایا ہے، اس میں تمہاری بھی رضا مندی شامل تھی۔ یہ واحد فیصلہ جو میں نے اپنے بیٹے

کے لیے لیا ہے، مجھے اپنے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں، اپنے خواہشوں پر قابو رکھو اور دماغ کا استعمال کم کرو۔ احسن خوش خبری آجائے تک دعا کے پاس ہی رہے گا، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ ان کا لہجہ اہل تھا انہوں نے جھوٹ کی سزا سنائی تھی۔
”جی نہیں۔“ اس کی پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

”تینوں شام کو مل کے چائے پیو، گپ شپ کر دو، رشتوں کا احترام کرو۔ محبت سے پیش آؤ، کوئی عمر یا رشتے میں بڑا ہونے سے بڑا نہیں بن جاتا بلکہ انسان کا اخلاق اس کا وسیع ظرف، انسان کو بڑا بناتا ہے۔ مجھے تم سے اچھی توقعات ہیں اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے یاس نہیں کرو گی اور آئندہ شکایت کا موقع بھی نہیں دو گی، اللہ حافظ۔“
انہوں نے اچھی خاصی سنا کے فون بند کر دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ انم کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ بھی نہیں۔

☆.....☆

اگلے تین روز دعا اور احسن کی زندگی کے خوش گوار دن تھے، انم نے ہر قسم کا اعتراض نہ کیا، چینی، روک ٹوک اور طنز وغیرہ کرنا ختم کر دیا تھا۔ وہ دونوں شام کو انکھی احسن کے ساتھ لان میں چائے پیتیں۔ روزمرہ کی باتیں، پرانے قصے، دعا مسکرا دیتی یا زیادہ خوش نظر آتی تو انم یک دم سے خاموش ہو جاتی۔ اس کی چہرے پر بے سکونی، بوریت اتر آتی، دعا اسے مخاطب کر لیتی تو جواب دے دیتی ورنہ چپ چاپ بڑی راتیں۔ ایک جگہ، ایک ہی پوزیشن پر بیٹھے اسے گھنٹوں گزر جاتے۔

دعا کو اس کی حالت برتر آتا، اس نے احسن سے بھی ذکر کیا، اس کا خیال تھا کہ وہ خود ہی آہستہ آہستہ ایڈجسٹ کر لے گی۔ وہ خود ہی اس کے کمرے میں، اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتی، وہ دعا کے مسلسل بولنے سے اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو کر، پہلے جیسی انم بن جاتی۔ یہی موقع تھا، دعا اس پر واضح

کر دیتا جا بیتی تھی کہ وہ اس کے متعلق متقی سوچتی ہے، وہ اب بھی اس کی بہترین دوست ہے۔ اس کا ہر کہا اور فیصلہ اس کے لیے مقدم ہے، وہ اس کے لیے قابل احترام ہے اور وہ انم کی احسان مند ہے، وہ خوش تھی کہ انم نے اپنی ذاتی اختراع والے سارے اختلافات ختم کر دیے تھے۔

احسن بھی انم کو زیادہ دقت دیتا، ناشتا اسی سے فرمائش کر کے ہوا تا۔ آفس ٹائم تک میں چار، پانچ بار اسے ضرور کال کرتا۔ دعا اسے مجبور کر کے انم کے بیڈروم میں بھی بھیج دیتی حالانکہ دل آرا نے احسن کو سختی سے منع کر رکھا تھا۔ دعا نے یہ حقیقت ان سے چھپائی تھی، دعا نے انم کے بدلاؤ کا ذکر، بڑی خوش دلی سے انہیں بتایا تھا۔ دل آرا بھی اسے دل سے معاف کر چکی تھیں لیکن ان سب کو انم کی خاموشی اور برداشت بہت جھپٹی پڑنے والی تھی۔

☆.....☆

احسن آفس سے آ کے سیدھا انم کے بیڈروم میں گیا، فریش ہو کے وہ دونوں لاؤنج میں آ گئے۔ شام کی چائے اور فرمائشی لوازمات دعا ہی بناتی تھی، آج چن خالی تھا۔
”دعا کدھر ہے؟“ صوفے پر بیٹھے اس نے انم کو دیکھا۔

”شاید اپنے روم میں ہو، آج وہ میرے پاس بھی نہیں آئی۔ دوپہر کو نا ہیڈ بتا رہی تھی کہ اس نے چ بھی نہیں کیا۔“ انم نے ذرا سوچتے ہوئے اسے بتایا۔
”تمہیں اس کی خبر تو بتائی چاہیے تھی۔“ وہ فوراً اٹھا اور اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، انم نے بھی اس کی تقلید کی۔ کمرے میں اندھیرا تھا، دعا سٹی ہوئی تھی۔

”دعا..... دعا.....“ انم نے اسے پکارتے لائٹ آن کی۔

دعا کا کالی سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی، لائٹ کی تیز روشنی کی چھین پر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ

”آر۔ پو۔ او۔ کے، دعا۔“ وہ اس کے نزدیک پہنچا۔
”صبح ناشتے کے بعد سے طبیعت بہت بوجھل اور عجیب سی ہو رہی ہے۔ سراسیمہ بھاری ہے کہ اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہا، پلیز انم! یہ لائٹ بند کر دو۔“ اس نے سر گھٹنوں میں دے لیا۔

”تم نے مجھے بتایا ہوتا، میں ڈاکٹر کو کال کر دیتی۔“ انم نے احسن کو دیکھتے اپنا بھاد کیا۔
وہ چپ تھا، انم کے سامنے اپنی تشویش ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ وہ اس کی فکر کو محبت کے زمرے میں رکھ لیتی۔

”میرا اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا، بہت بھاری پیٹ سا محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ رو دینے لگی۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل اور رکت زد تھیں۔
”انم تم اسے چھین کر داد، میں ڈاکٹر کو کال کرنا ہوں۔“ احسن موبائل پاگٹ سے کالنا باہر نکل گیا۔
انم اسے اٹھنے میں مدد دیتی دواش روم میں لے گئی۔

☆.....☆

چالیس سال ڈاکٹر نے دعا کا پی پی اور نبض چیک کرنے کے بعد، بیڈ اور چین پکڑے، کافی دیر سوچتے ہوئے بغور دعا کا بھی جائزہ لیا۔
”یہ خاتون میری ہیں۔“ اس نے اندازہ لگایا۔
”ہی!“ انم فوراً بول پڑی۔

”میں نے یہ میڈیسن لکھ دی ہیں، کچھ لائٹ سا کھلا کے انہیں دودھ کے ساتھ دیں اور صبح ضرور انہیں کسی اچھے گائنا کولو جسٹ سے۔ چیک اپ بھی کروائیں، مجھے معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔“
آخری جملہ ڈاکٹر نے احسن کو نسخہ پکڑاتے آہستگی سے ادا کیا۔

”معاملہ.....؟“ احسن نے دہرایا۔
”گائنا کولو جسٹ.....؟“ انم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“ انم پر جوش اور بے یقینی تھی۔
دعا انکیشن کے زیر اثر پرسکون ہو کے آنکھیں موند چکی تھی۔

”میں کچھ بھی حتمی نہیں کہہ رہا، اپنا شک ظاہر کر رہا ہوں۔ آپ کل ان کا ٹیسٹ کروائیں کفرم ہو جائے گا۔“ انم کے مسکراتے ہونٹ اور چمکتی آنکھیں باند پڑ گئیں۔
”مجھے اجازت دیں۔“

ڈاکٹر اپنا بیگ اٹھا کے باہر کی طرف بڑھ گیا۔
بہت بنا احسن اس کے پیچھے لگا۔

☆.....☆

ڈاکٹر کے لگائے گئے انکیشن اور میڈیسن لے کر دعا پرسکون نیند سو گئی۔ احسن اور انم دہیں صوفے پر بیٹھے خوشی دسرت سے باتوں میں مگن رہے۔ انہیں ذہنی رات کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔
”تمہیں لگتا ہے کہ رپورٹ پازیو آئے گی۔“ اس نے انم سے تصدیق چاہی۔

”آف کورس، کیونکہ میں بھی دو تین روز سے دعا کی طبیعت گری گری محسوس کر رہی تھی جو اللہ کو منظور، ہم دعا کر سکتے ہیں۔“ انم پر یقین تو تھی مگر قبل از وقت امید نہیں باندھنا چاہتی تھی۔

”تم کل ناشتے کے بعد دعا کو ڈاکٹر ماہرہ کے کلینک لے جانا، تسلی سے چیک اپ کر دانا۔ اگر میری ضرورت پڑی تو میں بھی جوائن کر لوں گا۔“

احسن کا ذیل بلیوں اچھل رہا تھا لیکن انم پر ظاہر کرنا بے وقوفی تھی پھر ابھی کچھ کفرم بھی نہیں تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خود دعا کو ڈاکٹر کی پاس لے جائے مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ وہ خوشی کے نلے سے مل ہی اسے ملایمٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔
”ڈونٹ ڈری، میں سب ہینڈل کر لوں گی۔“

وہ دعا کی نیند کے خیال سے آہستہ سے بولی۔
”اس کی میڈیسیز، پریپیڈ وغیرہ اور ڈائٹ میں کیا لے، ہر چیز اچھی طرح سے پوچھ کے آنا۔“

احسن کو اس کی حالت پر انفس تھا، وہ انہم کو دن میں کئی بار کال کر لیتا تو دعا کے پاس بھی موبائل تھا تب بھی اس نے ایک بار بھی اسے کال نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن تکلیف میں رہی تھی۔ انہم کی لاروائی کی حد تھی، اس نے دعا کے بیڑم میں جھانکا تک نہیں اور نہ ہی اس کے چہ نہ کرنے کا ٹوس لیا اس سب کا ذمہ دار وہ خود کو ٹھہرا رہا تھا۔

احسن بڑے غور سے سوئی ہوئی دعا کو دیکھ رہا تھا۔

”کتی کزور لگ رہی ہے ناں۔“ وہ کھوسا گیا۔ انہم اس کے چہرے پر سے نظریں پٹانہ پائی، وہ اس کے ماتھے پر پڑے پر نظر بلوں کو گنتے گی۔ وہ خوش تھا، اس سے دعا کی جھولی باتوں میں مگن مسئلہ تب ہی پیدا ہوتا تھا جب احسن کی آنکھوں اور لہجے میں دعا کے لیے فکر یا سانس چمکتی تھی۔

انہم کو لگتا کہ وہ دو حصوں میں بٹ رہا ہے، اس کی تقسیم بہت بھاری تھی۔ اس مرحلے پر اس کا حوصلہ، ہمت، خود کو پڑھانے گئے صبر برداشت کے تمام اسباق جواب دینے لگتے۔ احسن کی زبان سے ماں کے بعد اس نے صرف اپنا نام، ذکر، فکر، تعریف، محبت اور لڑائی جھگڑا سنا تھا۔ اس کا ہر تعلق اور رشتہ اسی سے منسلک تھا۔ اب اس میں دعا بھی حصے دار بنتی جا رہی تھی، اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

☆.....☆

”ماما جان! بابا جان تیار نہیں ہوئے۔“ آفس کے لیے تیار غمیر نے کرسی چھینے پوچھا کیونکہ ان کی کرسی خالی تھی۔

”تمہارے بابا جان کو رات ہارٹ بین ہوئی تھی، کانی دیر گئے رہے۔“

”آپ مجھے چکا لیں، میں انہیں ہسپتال لے جاتا۔“ عمیر کو سب کی فکر ایک ساتھ تھی۔

”انہوں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔“

”آپ مان گئیں، خدا خواستہ کوئی سیریس.....“ عمیر سلاکس واپس رکھ کے تیری سے بولا۔ اسے باپ

کے معاملے میں ذرا سی بھی لاروائی برداشت نہیں تھی۔ عمر جو نیوز پیپر کھولے ہیڈ لائنز پڑھ رہا تھا، وہ بھی متوجہ ہوا۔

”ڈنٹ درمی! باؤٹ ہم، وہ ٹھیک ہیں۔ ابھی سو رہے ہیں، میں نے ڈاکٹر کو کال کر دی ہے، وہ آ کے ان کا سلی سے چیک اپ کر جائے گا۔“ انہوں نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

”اچھا، میں نکلتا ہوں۔“ وہ ٹیبل پر بڑا موبائل اٹھا کے کھڑا ہو گیا۔

”بیٹا ناشتا کرتے جاؤ۔“ ماں نے اسے ٹوکا۔ ”آفس میں بہت زیادہ کام ہے، اسلام آباد سے ڈیلی گیشن آتا ہے، دو ایپلائرز کو فار کر دیا گیا ہے، یا خدا آج کوئی لیو پر نہ جائے۔“ ماں کو سب بتاتا وہ باہر کود دڑتا گیا۔

عمر ٹیبل کی سطح کو کھرچتے کچھ سوچنے لگا۔

☆.....☆

دعا کو صبح انہم اس کے کمرے میں بہت فزی، محبت اور دوستانہ انداز میں جگانے آئی تو وہ حیران رہ گئی۔

پھر ناشتے کی ٹیبل پر انہم نے اسے رات ڈاکٹر کا شک بتایا۔ دعا بے یقین تھی بھلا اتنی جلدی یہ سب مگر وہ خاموش رہی۔ انہم اتنی خوش تھی کہ مسلسل خود سے بولے جا رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اسی خاموشی سے گانا کو لو جھٹ کے پاس آگئی تھی۔

دعا کے میٹ ہو گئے تھے ڈاکٹر ماہرہ رپورٹ لینے گئی تھیں۔ دعا اور انہم کے لیے انتظار کا ہر بل چکی میں بیٹے کے برابر تھا۔ انہم اضطرابی کیفیت میں بار بار موبائل اسکرین کو دیکھتی، کبھی ٹیبل پر پڑے اوراق سے جھپٹ چھا کرنے لگی۔ رات سے لے کر اب تک اس کا ہر عضو انتظار تھا۔

احسن، دعا کے ساتھ بیڑ پر بیٹھا تھا مگر اس نے وہیں صوفے پر بیٹھے رات بتا دی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں بہت سی متضاد کیفیات چل رہی تھیں، وہ

ظاہر خوش تھی مگر دل کے کسی خانے میں دکھ کی چھین بھی واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنی تمام تر کوشش کر کے خوش ہونا چاہتی تھی۔

”مبارک ہو سزا احسن! آپ کی یہ کزن پریکٹ ہیں۔“ ڈاکٹر ماہرہ اسے مڑوہ روح افزا سناٹی آ رہی تھیں۔ دعا حیرت و بے یقینی میں گھری ڈاکٹر کے ہلنے ہونٹ دیکھتی رہ گئی۔

”آپ..... آپ.....“ انہم کے منہ سے الفاظ لکنا مشکل تھے، وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔

”جی میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔“ ڈاکٹر ماہرہ نے اس کا ادھر اور جملہ پورا کیا۔

”مبارک ہو دعا..... بہت بہت مبارک ہو۔“ انہم نے اسے بھی زبردستی کھڑا کر کے خود میں بھجھ لیا۔

”آئی ایم سو پی! اس نے دعا کو خود سے الگ کیا۔

”احسن بھی بہت..... بہت خوش ہوں گے۔“ اس نے کہہ کر دعا کو کچھرے گلے لگالیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا یہیں بھگڑا ڈالنا شروع کر دے۔ اسے بچو بنی دعا کے ہونٹ بھی ذرا سامنا کا دیے۔

”تھنک یو۔“ وہ یہی کہہ پائی۔

”یہ لیس سزا احسن!“ ڈاکٹر نے انہم کی طرف پرچہ بڑھایا۔

”انہیں کمزوری بہت زیادہ ہے، یہ میڈیسنز ریگولر یوز کرنی ہیں۔ دودھ کا گلاس صبح و شام ڈیلی، پھل اور گوشت کا استعمال بھی لازمی کرنا ہے۔ ڈائنٹ اور میڈیسن ماں اور بیٹے کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے، اب پندرہ دن بعد چیک اپ کے لیے آئیے گا۔“ انہوں نے ساری ہدایات تفصیل سے بتا دیں۔

”تھنک یو ڈاکٹر ماہرہ! میں اس کا ہر ممکن خیال رکھوں گی، چیک اپ کے لیے بھی ضرور لاؤں گی۔“ انہم نے مسکراتے شکر یہ ادا کیا اور اٹھ گئی، دعا نے بھی تھنک دی۔

☆.....☆

احسن کی ساری توجہ فائل پر مرکوز تھی، موبائل کی نیل ہوئی تو اس نے پین روک کے موبائل اٹھالیا۔

”کیلو.....“ وہ کرسی کی پشت سے ٹکا۔

”مبارک ہو احسن!“ انہم اور دعا گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی تھیں۔ گاڑی اشارت ہوتے ہی اس نے احسن کو کال کر دی تھی۔

”تم سچ کہہ رہی ہو ناں انہم!“

اس کا ہر عضو اس خوش خبری کو سننے کا منتظر تھا۔ اس نے خود پر بہت ضبط کا پہرہ بٹھا کے انہم کو کال نہیں کی تھی۔ وہ بل میں تولہ پل میں ماش بن جاتی تھی۔

”لیس، دعا پریکٹ ہے۔“ انہم کی خوشی سے چیخ نکل گئی۔

دعا بے دلی سے پھیکا سا مسکرا کے، گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یہ خوش خبری خود احسن کو سنا تی مگر وہ انہم کو بتانے سے روک نہیں سکتی تھی یا شاید وہ اس سے زیادہ خوش تھی۔

”اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہو، ٹیٹ کے بعد کنفرم ہوا ہے ناں۔“

”دعا کی رپورٹس پازینو آئی ہیں۔“ اس نے چہرے پر آئے بالوں کو ایک اداسے پیچھے جھکا۔

”میں بہت..... بہت خوش ہوں، میں اب کیا کروں۔“ وہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔

”میں بس تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں، تم فون بند مت کرنا..... میرا مطلب ہے بند کر دینا.....“ اس کی زبان اس کے دماغ کا ساتھ نہیں دے پاری تھی، اس نے فون بند کیا اور باہر کود دڑا۔

انہم نے مسکراتے ہوئے زیر لب اس کی سلامتی کی دعا مانگی اور موبائل جھولی میں گرالیا۔

☆.....☆

جس مقصد کے لیے یہ شادی کی گئی تھی، وہ بہت جلد پورا ہو گیا تھا۔ انہیں زیادہ انتظار سے نہیں گزرنا

پڑا تھا۔ انہم بھی اس خوش خبری پر دل سے مطمئن تھی، دعا کو پہلے تو جھٹکا لگا اب انہم اور احسن کو خوش دیکھ کے اس کے اندر بھی سکون اترتا چلا گیا۔

”دعا! تم یہاں بلا وجہ نہ بیٹھو، جاؤ اپنے بیڈروم میں جا کے ریٹ کرو۔ میں ناہید کے ہاتھ جوں اور اپیل بھجواتی ہوں، وہ ضرور کھالینا۔“ انہم نے دعا کو لاؤنج میں کھڑے ہی آرڈر دے دیا۔

ناہید جو ان کی آمد پر چوکھٹ پر آئی تھی، جوں اور اپیل کے لیے دوبارہ مڑی۔

دعا خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی حالانکہ اس کا دل لاؤنج میں بیٹھ کے، احسن کا انتظار کرنے کو چاہ رہا تھا لیکن اس لیے وہ انہم کو انکار یا حکم عدولی کر کے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

انہم کو بھی احسن کا انتظار تھا، وہ بیٹھنے کے بجائے چکر کاٹنے لگی، اسے اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔

دعا کو خوشی میں آرام نہیں سوچ رہا تھا، احسن تھوڑی دیر میں آنے والا تھا اسے شاور لیے دوون ہو گئے تھے۔ کل اس کی طبیعت خراب تھی۔ صبح بھی اس نے انہم کے کہنے پر کپڑے پہنچ کر لیے تھے، اب اس کا موڈ بھی کافی خوش گوار تھا۔ وارڈروب کھول کے کپڑوں کے بینکر آگے پیچھے کرنا شروع کر دیے۔

احسن کی گاڑی بیکری کے سامنے کھڑی تھی، مٹھائی خرید کے اس نے ٹوکریاں گاڑی میں رکھوا لیں۔

انہم باری بار وال کلاک کو دیکھتی، ہونٹ چپاتی چکر لگاتی جا رہی تھی۔ وہ دل آرا کو اتنی بڑی خوش خبری اکیلی نہیں سنا چاہتی تھی، وہ احسن کی آمد کی منتظر تھی۔

دعا نے شاور لے کر نیوی بلیو کڑا سوٹ زیب تن کیا، اس کی بری کے کتے ہی جوڑے بغیر استعمال کیے لٹک رہے تھے۔ دل آرا نے سارے سوٹ گہرے رنگوں کے خریدے تھے ان کا خیال تھا کہ نئی نوپلی دلہن کو بھی رنگ زیب تن کرنے چاہئیں، اس

نے بھی لال، پیلے، ہرے رنگ نہیں پہنے تھے۔ بالوں پر لپٹا تو لپٹ کھول کے اس نے بال جھٹکے، تو لپٹ اسٹینڈ پر ڈال کے، وہ دراز میں سے ہیز ڈرائیرنگل کے سیدی ہوئی تو اس کی نگاہ اپنے وجود پر جا پھری۔ نیوی بلیو کڑا اس کے مناسب سراپے پر خوب بیچ رہا تھا۔

احسن کی گاڑی مسلسل ہارن بجاتی روش پر دوڑتی، پورچ میں آرکی۔ انہم کی اکھڑی سانس بحال ہوئی، وہ باہر کی طرف بڑھی۔

دعا کے ہاتھوں میں بھی تیزی آ گئی، بالوں کو ڈھیلا سا کچر میں بکڑ کے اس نے برش سے آنکھوں میں کاجل لگایا اور پنک لب کلوں ہونٹوں پر پھیرا۔ خود پراسپرے کر کے اس نے آخری تنقیدی نگاہ خود پر ڈالی وہ بالکل سادہ اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسے کبھی باہر گہرے رنگ بھانے لگے تھے۔ انہم ابھی چند قدم پیچھے تھی کہ احسن اندر داخل ہو گیا۔

”آئی دیر کی آپ نے، اب تو میں سیر سیلی پریشان ہونے لگی تھی۔“ اس کی بے تاب عیون پر تھی۔

”اتنی بڑی خوشی کی خبر، اب کیا میں خالی ہاتھ کھر آجاتا۔“ چار ملازم مٹھائی کے ٹوکے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

”مٹھائی میں سے ملازمین کا حصہ رکھ کے، باقی سب پڑوسیوں میں تقسیم کرو اور سلیم تم جا کے منڈی سے دو کالے بکرے صدقے کے لیے لے آؤ۔“ احسن نے ملازمین کی ڈیوٹی لگائی۔

انہم کچھ بولنے جا رہی تھی، اس کے الفاظ منہ میں اور ہونٹ کھلے رہ گئے۔

”دعا کدھر ہے، نظر نہیں آ رہی۔ دعا۔۔۔۔۔“ احسن آوازیں لگاتے لگاتے۔

وہ اپنی مسرت میں انہم کے تاثرات نوٹ نہ کر پایا اور نہ دعا کو آواز بھی نہ دیتا۔ بظاہر یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی مگر انہم کے لیے تھی۔

وہ اسی پکار کی منتظر تھی، اسے احسن کا سامنا

کر تے حیا آ رہی تھی، اس نے بیڈ پر پڑا دوپٹہ اچھے سے اوڑھ لیا۔

”دعا۔۔۔۔۔ دعا۔۔۔۔۔“ اس کے نام کی دوبارہ پکار پڑی۔ وہ ہڑ برا کے باہر کود پڑی۔

”جی۔۔۔۔۔“ پھولی سانس لیے وہ اس کے سامنے موجود تھی۔

انہم جو پہلے ہی غصے سے بھری جا رہی تھی، دعا کو دیکھ کر جامد ہوئی جسے اس نے ریٹ کرنے سے پہنچا تھا، وہ چودھویں کے چاند کی مانند چمک رہی تھی۔ وہ اسکول دکان کے فنکٹر میں بھی لائٹ فلر استعمال کرتی تھی، نیوی بلیو کڑا شاید بنا ہی اس کے لیے تھا وہ جنت سے آئی کوئی خورگ رہی تھی، لمبے بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ کچھ ایسی ہی حالت احسن کی بھی ہوئی تھی، انہم نے وہ لمحہ پکڑ لیا تھا۔

”دعا آئی ایم سو پٹی۔۔۔۔۔ ڈھیروں ڈھیر مبارک ہو تمہیں۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو جاؤں گا، تم سیر سیلی نہیں جانتیں کہ یہ میری زندگی کی کتنی بڑی خوشی ہے جو مجھ سے سنبھالی نہیں جا رہی۔“ وہ غیر ارادی بولنا جا رہا تھا۔

دعا شرم سے سر جھکاتی، اٹھاتی مسکرائے جا رہی تھی اس کے چہرے پر بھی الوٹی سی چمک پھیر گئی تھی۔

انہم جامد کھڑی، اس منظر میں ایک اسپتھو لگ رہی تھی۔ جس کی نگاہیں بھی احسن کے خوشی کا نور پھوٹتے چہرے پر اور بھی شرمیلی دکھائی دے رہی تھیں۔

”سلیم! تم ابھی تک نہیں کھڑے ہو، صدمے کے لیے دو کالے بکرے لے آؤ اور یہ مٹھائی اٹھا کے سب میں بانٹ دو اور غفور چچا سب ملازموں کے نئے کپڑوں اور آپ لوگوں کے کھروں میں مہینے بھر کے راشن کا حساب لگا کے بتاؤں اور منظر بھائی! آپ نے شام کو یتیم خانے اور مدرسے میں کھانا پوری ذمہ داری سے سمجھواتا ہے۔ سب اپنے حصے کا کام دھیان سے کریں، کوئی غفلت نہ برتے۔“ اس نے ایک ہی سانس میں وہاں کھڑے تمام ملازمین کو حکم جاری کر دیے۔ سب اثبات میں سر ہلاتے مٹھائی کے

ٹوکے اٹھا کے باہر نکل گئے۔

”ناہید! تم سارے گھر کے کام چھوڑ دو، صرف اور صرف دعا کا خیال رکھو۔ میں کسی قسم کی ذرا سی بھی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔“ اس نے انکی اٹھا کے حکمانہ لہجے میں ناہید کو بھی تنبیہ کیا۔

وہ مسکراتی ہوئی اثبات میں سر ہلاتی رہ گئی۔

”ماما جان کو کال کی ہے؟“

اب اس نے رخ ساکت کھڑی انہم کی طرف موڑا۔ اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا، وہ جو اس کی ہر رگ پکڑ لیتا تھا، اس کے چہرے پر کھمبے طوفان کو نہ پڑھ سکا۔

”چلو! ڈھکچہ ماما جان سے چپٹ کریں، وہ بہت ایکسٹنڈ ہوں گی۔“ وہ دعا سے کہتا ہوا صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

”تم بھی آؤ ناں انہم!“ دعا نے مڑ کر وہیں کھڑی انہم کو پکارا۔

وہ خالی دل اور خالی ذہن لیے ان کی طرف چل دی۔

☆.....☆

”راجہ بیگم میں بالکل فٹ فٹ ہوں آپ نے بلا وجہ مجھے چھٹی کر دالی ہے۔ آج تو کام کا برڈن بھی بہت زیادہ تھا، عمر اکبر پریشان ہوگا۔“

ریاض احمد کو بے چینی ہو رہی تھی، بار بار دھیان بیٹے میں جانتا۔

”نہیں پریشان ہوتا وہ اور نہ ہی آپ ہوں۔“ وہ معنی خیزی سے مسکرا دیں۔

”تم نہیں جانتیں، دو ایمپلائز کو فائر کر دیا گیا ہے، آج اسلام۔۔۔۔۔“

”سب جانتی ہوں میں، اپنا عمر ہے ناں، وہ چلا گیا ہے آفس۔“ بڑے عام سے لہجے میں کہتی وہ خالی برتنوں کی ٹرے اٹھائے چلی گئیں۔

”عمر۔۔۔۔۔ کیا عمر آفس گیا ہے۔“ ریاض حیران و بے یقین پھرتی سے چپل پیروں میں اڑس کے ان کے پیچھے چلے آئے۔

”جی بالکل گیا ہے، اب وہ روز جایا کرے گا۔ آپ کو کوئی اعتراض؟“ ٹرے رکھ کے وہ چلیں، انداز بہت اترا تا ہوا تھا۔

”نن..... نہیں..... مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔“ وہ کندھے اچکا کے رہ گئے، اپنے اندر کی انجمن کو چھپانے کے لیے وہ واپس لاؤنج میں آ گئے۔

”اعتراض ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ میرے بیٹے کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے، ہمیشہ فرسٹ ڈویژن.....“ ریاض احمد کی ہچکچاہٹ نے ان کا حوصلہ بلند کیا تھا، انہوں نے پیچھے سے ہرجوش پکار لگائی۔

”جی بالکل، جناب! تعلیم کے علاوہ بھی آپ کے بیٹے کے سارے ریکارڈ بہت شان دار ہیں، فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن۔“ انہوں نے مڑ کر، بڑی کوکھورتے چبا چکا کر جواب دیا۔ انہیں عمر پر فخر کرتی، وہ بہت بری لگی تھیں۔

☆.....☆

”السلام علیکم ماما جان!“ لپ ٹاپ احسن کی گود میں تھا، اس کے دائیں طرف دعا اور بائیں طرف انم براجمان تھی۔

”علیکم السلام میری جان اینڈ آئی ایم سوچی۔ میری فیملی ایک ساتھ مل جل کے کبھی ہے۔“

دل آرانے دل میں ہی ان کا صدقہ اتارا اور اسن و سلامتی کی دعا بھی مانگی۔

”دل تھام لیں ماما جان کیونکہ میں آپ کو بریکنگ بلکہ اسرارنگ نیوز سٹانے جا رہا ہوں۔“ احسن نے سنسنی خیز تمہید باندھی۔

”میرا دل بہت مضبوط ہے، تم سناؤ۔“ ان کے جسم کا ہر رواں کھڑا ہو گیا، وہ کیا سنانے جا رہا تھا جو سننے والوں کے کان برسوں سے منتظر تھے۔

”اگر آپ اتنی اسرارنگ ہیں تو چلیں پھر دس منٹ انتظار کریں۔“ وہ آج موڈ میں تھا، ماں کو تنگ کرنے میں اسے مزا آ رہا تھا۔

”پلیز احسن تنگ مت کرو، جلدی سے بتا دو۔“

وہ بھی بگڑنے لگیں۔

”ماما جان! آپ وادی بننے والی ہیں۔“ احسن نے چیخ مارنے والے انداز میں بتایا۔

”نہیں..... کیا..... سچ..... کیا تم..... میں وادی.....“ خوش خبری اتنی جلدی، اچانک اور بڑی ملی تھی کہ زبان الفاظ ادا نہیں کر پا رہی تھی۔

”انم! یہ سچ بول رہا ہے، ہے ناں۔ دعا..... دعا تم بتاؤ..... تم ماں بننے والی ہو؟“ ان کی خوشی سے بری حالت اور بے یقینی طاری ہو گئی تھی۔ انہوں نے باری باری تینوں سے تصدیق چاہی۔

دعا کا سر شرم سے جھک گیا تھا، انم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے، تو نے مجھے اتنے بڑے رتبے پر فائز ہونے کی نوید دی، میں گناہگار اس قابل کہاں..... تو نے میری سن لی۔“ وہ خدا کا شکر ادا کرتی رونے لگیں۔ ان کو اپنے جذبات اور حواس پر بس نہیں تھا۔

”اس خوشی کے موقع پر آپ رو رہی ہیں۔“ احسن کو یہ عجیب منطق سمجھ میں نہ آئی۔

”تم نہیں سمجھو گے، ابھی باب نہیں بنے بھلا اولاد کی تکلیف کیا جانو۔ اس وقت گے لیے میں نے کتنی دعائیں مانگی ہیں، خدا نے مجھ جیسی گناہگار کی بھی سن لی حالانکہ میں اس قابل نہیں تھی۔“ انہوں نے گال پر پھیلے آنسو صاف کیے۔

”تو پھر آپ کب آرہی ہیں ماما جان!“ احسن نے انم کو ٹوک دیا۔

”تم جانتے ہو، میں ابھی تک تمہارے پایا جان کو انفارم نہیں کر سکی“ اس لیے اتنی جلدی پکڑ لگا ناممکن نہیں۔ کوئی سولڈر ریزن بھی تو ہونا چاہیے۔“ انہوں نے مجبوری بتائی۔

”اب آپ پایا جان کو سب سچ بتادیں۔ وہ بہت خوش ہوں گے ماما جان!“ اس نے اپنے تئیں مشورہ دیا۔

”ایک دم سے ہرگز نہیں، وہ انم کے لیے بہت

پوزیو ہیں، ابھی مزید کچھ عرصہ خاموش رہو۔“ ان کی پلاننگ لگی تھی۔

”آپ انہیں سارا سچ بتادیں ماما جی! آگے میں خود ہی پینڈل کر لوں گی۔“ تب سے خاموش بیٹھی وہ بول پڑی۔

”اچھا کچھ کرتی ہوں، تم بتاؤ دعا کا صدقہ دیا، سب ملازموں میں کپڑے اور مٹائی بھی بانٹنا احسن!“ انہوں نے احسن کو محبت بھری ہدایات دینا شروع کی۔

”جی ماما جان! صدقہ بھی دے دیا ہے اور مٹائی بھی بٹ بٹ چکی ہے۔“ احسن نے ذمہ داری کا ثبوت دے دیا۔

”اور دعا تم نے خود اپنا خاص خیال رکھنا ہے، میں بھی کوشش کر کے جلد از جلد پاکستان پہنچتی ہوں۔ سنو دعا! تمہارے اسٹارٹ کے چند مہینے بہت احتیاط کے ہیں! خدا نخواستہ ذرا سی بھی کوتاہی عمر بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ اس لیے کوئی ذرا سی چیز نہیں اٹھائی، پراپر ڈاسٹ لو، اپنی نیند پوری کرو، ہر دم خوش اور فریٹش رہو۔ جس کام اور چیز کے لیے دل چاہتا ہے وہ کرو، جس کے لیے دل رضامند نہیں وہ چھوڑ دو۔ میں روز تم سے تمہاری روٹین ڈسکس کروں گی اور ناہید۔“

”ماما جان! ناہید کو میں نے کہہ دیا ہے وہ اس کا خاص خیال رکھے گی، ماشاء اللہ سے تین بچوں کی ماں ہے اسے تجربہ بھی ہوگا۔“ احسن نے ان کی بات کاٹ کے اپنی کارکردگی گنوائی۔ اس کے آخری جملے پر دل آرانے توجہ لگایا۔

”مگد احسن! تم نے بھی اپنی دعا کا خاص خیال رکھنا ہے، ڈاکٹر کے پاس ٹائم پر لے کر جانا، ایک ڈائریکٹر گھر کے لیے بھی گاؤں سے بلوالو۔“ وہ ایک ہی سانس میں اسے سب ہدایات دے جا رہی تھیں۔

”اور انو! تم نے تینوں وقت کا کھانا، خود دعا کو اپنے ساتھ بٹھا کے کھانا ہے۔“ دل آرانے اس خاموش صورت کو مخاطب کیا، وہ ہڑ بڑا گئی۔

”جی..... جی..... ماما جان! جی ضرور.....“ اس نے اکتے، جھجکتے ہوئے سر اٹھا کے ہاں میں ہاں

ملادی۔

☆.....☆

راجہ اور ریاض احمد لان میں آ کر بیٹھ گئے تھے، شام کی چائے عیسر کے ساتھ پی پی جانی تھی۔ راجہ احمد بہت خوش اور ہرجوش ہو رہی تھیں لیکن اپنے جذبات پر ضبط رکھے بیٹھی تھیں بھی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ گاڑی روش پر روک کر عیسر ڈرائیونگ سیٹ سے اور عمر دوسرا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

ریاض احمد نے دونوں جوان بیٹوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کے نظر لگ جانے کے ڈر سے ذرا رخ پھیر لیا۔

”کیا رہا تمہارا دن عمر!“ ابھی وہ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ پوچھنے لگیں۔

”بہت اچھا، بہت ساری غلطیاں کی ہیں میں نے“ حالانکہ پیر خیال تھا کہ میں دو چار جگہ جاب کر چکا ہوں مجھے آفس ورک کا تجربہ ہے۔“ عمر نے بڑے ریلیکس موڈ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”تمہیں صرف غلطیاں کرنے کا تجربہ ہے، اپنی زندگی میں صرف یہی کام تم نے دل لگا کے لیا ہے۔“ ریاض احمد کا انداز سنجیدہ تھا۔

ان سے عمر کی مسکراہٹ اور اطمینان برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ لاکھ خود کو سمجھاتے مگر اس کے سامنے آتے ہی ان کا پارہ چڑھ جاتا، وہ اسے دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔

عمر کا چہرہ تاریک پڑ گیا، راجہ احمد کی مسکراہٹ بھی سمٹ گئی۔ عیسر نے معاملے کی نزاکت بھانپ کر جلدی سے عمر کے کاندھے پر ہاتھ دھر کے اسے تسلی دی۔

”آپ نے پایا جان سے سیکھا ہے میں بھی سب کچھ ان ہی سے سیکھوں گا۔“ اس نے حوصلہ نہ ہارا۔

غلطیاں بھی تو بہت کی تھیں، اسی کی وجہ سے انہیں دل کا روگ لگا تھا۔

”عمر میری تمہارے ساتھ سر کھائے گا، میں بہت جلد تھک جاتا ہوں۔“ انہوں نے بڑے سجاو سے صاف انکار کے ساتھ جواز بھی پیش کر دیا۔

”چلو انور عمر اور میرا! آپ لوگ پہنچ کر وہاں جا لے لو گوانی ہوں۔“ رابعہ احمد موضوع بدلتے ہوئے گھڑی ہو گئیں انہیں بھی شوہر کا انداز برالگا تھا۔

”کل سے تم میرے ساتھ ہی جایا کرو گے۔“ عمر چلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں میری باریک ہے ناں۔“

ان کی آوازیں دور ہوئی جاری تھیں ریاض احمد ان کی پشت کو دیکھتے کھو سے گئے تھے۔

☆.....☆

احسن دعا کو بڑی احتیاط سے چلنے اور اٹھنے بیٹھنے کی ہدایات کرتا اس کے ساتھ بیڑ دم میں چلا گیا۔ انم کسی ہی دیر وہیں صوفے پر بیٹھ رہی اور پھر وہ بھی اٹھ کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کی رگ رگ میں تھکاوٹ اتر گئی تھی، وہ دم سے بیڑ پر گری اور تکیے میں سروے کے رونے لگی۔

اپنی کم مائیگی، ہانچہ پن کا احساس اس کی نس نس میں پرایت کر گیا۔ یہی التفات، محبت، خوشی وہ احسن کی آنکھوں میں اپنے لیے دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں اس نے اپنی تکمیل کے لیے۔ اللہ سے درود کے التجا کی تھی کہ وہ اس بنجر زمین کو ہرا بھرا کر دے لیکن اس نے لاکھوں نعمتوں سے نواز کے، ایک اس خوشی سے محروم کر دیا تھا۔

محرومی بھی اتنی بڑی کہ اس کی زندگی، اس کی سانسوں میں ہی محبت، دل کے ساتھ دھڑکنی محبت کا کا بوارہ ہو گیا تھا۔ دعا سے شادی کا مقصد اولاد کا حصول تھا، یہ سب تو ہوتا تھا پھر تکلیف اور آنسو کیسے؟

لیکن وہ دعا کے مال بننے پر نہیں رورہی تھی بلکہ اپنی محبت میں ایک اور حصے دار کی شراکت پر رونا آ رہا تھا۔

اس کی زندگی میں پہلی بار یہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ احسن کی خوشی میں خوش نہیں تھی۔ اس کے دل میں ڈر نے کٹدی ماری تھی اور ایسا بھی پہلی بار ہوا تھا، احسن اس کی چہرے کی اداسی، آنکھوں میں ٹھہری نمی اور ہونٹوں کی کپکپاہٹ کو دیکھ ہی نہ پایا تھا۔

کیونکہ آج اس کی نظروں میں صرف دعا کا عکس تھا، انم کا ردنا مزید شدت پڑ گیا لیکن ابھی بہت کچھ پہلی بار ہونا باقی تھا۔

☆.....☆

موبائل کی تیل بجے جا رہی تھی، وہ منہ پر تکیے رکھے روتے روتے سوچتی تھی۔ وہ کسمسائے لگی تھی، پانچ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد موبائل پھر سے بجنے لگا۔ اس نے بھاری ہڈیاں اٹھایا، دکھتی آنکھیں بشکل کھول کے بیڑ پر ہی ہاتھ پھیر کے موبائل ڈھونڈ لیا۔

”بیو، السلام علیکم؟“ اسکرین پر دل آرا کا نمبر دیکھ کر اس کے حواس قائم ہوئے۔

”علیکم السلام! کیسی ہو؟“ دل آرا کا دھیان اسی میں تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں۔

”نہ ٹھیک ہو نہ ہی خوش۔“ انہوں نے اسے جتلا دیا۔

انم کی آنکھیں یکدم پوری کھل گئیں، اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی محرومی اور اداسی کے ساتھ تنہا گھڑی ہے تو وہ غلط تھی۔ انہوں نے اس کے چہرے پر ٹھہرا کر پڑھ لیا تھا۔ کھوٹ اس کی محبت یا نیت میں آ گئی تھی، وہ رشتوں کی پہچان بھوتی جا رہی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں۔“ کافی دیر بعد وہ فقط یہی کہہ پائی۔

”تو پھر تم رو کی کیوں ہو؟“ وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھی مگر وہ جان گئی تھی۔

اب کے اسے حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں اور عقل پر پردہ پڑ چکا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

”کچھ نہیں ماما جی، بس یوں ہی مجھے رونا آ گیا تھا۔“ اسے ہلا خرتسلیم کرنا ہی پڑا۔

”دعا کے پریکٹس ہونے پر یا احسن کی خوشیوں پر۔“ انہوں نے دکھتی رگ پکڑ لی۔

”آپ جانتی ہیں، میں حسد نہیں کرتی ہوں۔“ انم کو برا لگا۔

”میں جانتی ہوں کہ تم خود سے کتر سے حسد نہیں کرتیں لیکن یہ تم اچھے سے جان لو کہ دعا ہمیں سات پوتے بھی دے دے تب بھی وہ کبھی تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔“ ان کا لہجہ مضبوط اور مستحکم تھا۔

”آپ یہ نہ بھی کہیں تب بھی مجھے یقین ہے لیکن جو آج پہلی بار میں نے احسن کی آنکھوں اور چہرے پر دیکھا ہے وہ احساس بہت اٹکھا اور انہوتا سا ہے۔“ اس کی آواز پر کپکپاہٹ واضح تھی۔

”بی بی پر یو انو! اب بہت کچھ ایسا ہوگا، جو پہلے نہیں ہوا۔ لیکن تم فکر نہیں کرو، ہونے دو، یاد رکھو کہ یہ بچہ ہمارے خاندان کے لیے کتنا اہم ہے۔“ دل آرا نے اس کے ذہن میں راسخ کرنا چاہا، وہ اسے احساس کتری سے باہر نکالنا چاہتی تھیں۔

”اس خاندان اور بچے سے بڑھ کر، میرے لیے صرف احسن اہم ہے۔“ وہ زور سے بولتی ہوئی رو پڑی۔

وہ بھی خاموش ہو گئیں، انم کے دل میں اٹھتے طوفانوں کا اندازہ تھا، احسن کی شراکت قطعاً برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”کیوں انو! میں نے جنہیں آل ریڈی ہی سب تفصیل سے سمجھا دیا تھا۔ تم یہ سوچ کر ہی اپنا ظرف بڑا کر لو کہ احسن دعا میں انٹرسلو نہیں تھا نہ ہی دعا اس میں۔ ساری پلاننگ ہم دونوں نے اپنے فائدے کے لیے کی ہے، دعا تمہیں بچہ دے گی، تمہاری گود بھر جائے گی۔ تمہاری محبت کا بوارہ ہوگا تو وہ بھی اپنی اولاد میں تمہیں حصہ دار بنائے گی، سودا گمانے کا نہیں ہے۔“ وہ اسے نری اور سجاو سے ٹال

رہی تھیں۔ انہیں افسوس تھا کہ اس نے اپنی عقل کا درست استعمال کرنا ترک کر دیا تھا۔

”نہیں ہے مجھ میں آپ جتنا ظرف، آپ نے ایک نیم دو مسکین تین سال کی انوکو سینے سے لگالیا۔ اللہ کی قسم اگر میری سگی ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی مجھے اتنی محبت نہ دیتی جتنی آپ نے مجھے دی لیکن ماں..... مجھ میں حوصلہ نہیں ہے، میں ٹوٹ رہی ہوں، مر رہی ہوں۔“ وہ پاگلوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

دل آرا خاموش ہو گئیں کیونکہ اتنی جذباتی حالت میں اسے کچھ بھی سمجھانا ناممکن تھا۔

☆.....☆

رابعہ احمد باری باری سب کے آگے ناشتے کے لوازمات رکھتی جا رہی تھیں، عمر تقریباً بھاگتا ہوا ٹیبل تک آیا۔

”سوری، میں لیٹ تو نہیں ہو گیا۔“ اس نے عمیر اور نوال کو باری باری دیکھا۔

ریاض احمد نے اسے اوپر سے نیچے تک گھورا، نوال نے شرارت سے مسکرا کے کندھے اچکا دیے۔

”پورے سات منٹ لیٹ ہو۔“ عمیر نے رسٹ واپ دیکھ کے حساب لگایا۔

”وہ کل میں ٹافٹ ایوس سائیر ہو کے آفس چلا گیا، آج میں نے خوب دل لگا کے تیاری کی ہے۔“

اچھا لگ رہا ہوں ناں۔“ اس نے اپنی تاخیر کی وجہ بتائی۔

رابعہ نے بولنے کے لیے منہ کھولا تھا اس سے پہلے ریاض احمد بول پڑے۔

”آفس آ جانا ہے فیشن شو میں نہیں۔“ وہ تلخ ہو گئے۔

”اگر میں فریش ہوں گا تو میرا ذہن بھی تازہ دم رہے گا جو کہ بہت ضروری ہے۔“ عمر نے جواز پیش کیا۔

”عمیر منہ پر ہاتھ رکھ کے اپنی ہنسی روکنے لگا۔ ”تمہارا ذہن صرف غلط رشتوں پر ہی دوڑ سکتا

ہے۔ ان کی بڑبڑاہٹ اتنی واضح ضرور تھی کہ سب نے سن لی۔

☆ ☆ ☆

انہم کو رات بھر ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی، منہ ہاتھ دھو کے وہ چہل قدمی کے خیال سے باہر آئی تو اچانک اس کی نظر کچن میں کھڑی دعا پر جا پڑی۔ وہ حیران ہی اس طرف آگئی۔

”گڈ مارننگ!“ اس نے چوکھٹ سے ٹیک لگالی۔

دعا پلٹی۔ ”گڈ مارننگ!“ وہ پھر سے آٹا گوند بننے لگی۔

”کیا کر رہی ہو؟“ اس نے ٹوہ لی۔

”آٹا گوندہ رہی ہوں۔“ سادہ سا جواب تھا۔

”اچھا آٹا گوندہ کے میرے لیے جوس بنا دو۔“ انہم آ رڈر پاس کر کے وہیں کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گئی اس کا جوس پینے کا ارادہ ابھی بنا تھا۔

دعا آٹا پیالے میں نکال کے پرات اور ہاتھ سنک میں دھونے لگی، برتن لگا کے وہ فرق میں سے پھل نکال لائی۔

”بہت خوش ہو تم دعا!“ اس نے تمہید باندھی۔

رات سے کرب اس کے اندر پل رہا تھا۔

”ہاں خوش ہوں۔“ اس نے بچ بولا۔

”ماں بننے پر یا احسن کی نظروں میں برتری حاصل کرنے پر۔“ اب لہجہ کڑوا ہو چکا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”برتری کیسی؟ شاید تم بھول گئی ہو کہ اس شادی کا مقصد یہی تھا۔“ وہ اسے یاد دہانی کر داتے سیب دھونے لگی، اس نے انہم کے حملے سے بچنا تھا۔

”ہمارا تو بس یہی ایک مقصد تھا لیکن تمہارے

بہت سے مقاصد ہیں جواب ایک ایک کر کے پورے ہوتے جائیں گے۔“ اس نے ہوا میں تیر چلاتے الزام بھرا۔ رات دل آرا کی گئی نصحتوں کا رنی بھر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

”تم بلاوجہ مجھ پر شک نہ ہی کر دو تو بہتر ہے۔“ دعا پلیٹ میں سیب کاٹنے لگی۔

”چلو ہم کوئی اور بات کر لیتے ہیں۔“ دعا کو صبح صبح جھگڑا کرنا اچھا نہ لگا۔

کل ہی تو اسے اتنی بڑی خوش خبری ملی تھی، رات بھر اس نے اور احسن نے بہت خوب صورت سننے دیکھے تھے۔ احسن کی اپنے بچے کے لیے لمبی پلاننگز جس جوہر کے کھن مسکراتی رہی، انہم کا رویہ چھپلے دنوں نارمل رہا تھا۔

”اور بات یہ کہ..... احسن کو اب تمہارے پاس سونے کی ضرورت نہیں۔“ اس بات کی اسے تکلیف تھی جو زبان تک آگئی تھی۔ دعا کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے۔

”یہ بات آج تم اسے سمجھا دینا۔“ اس نے گیند دعا کی کورت میں پھینکی وہ خاموش رہی۔ اسے انکار کر کے غصہ دلانے کی جرأت نہیں تھی، احسن واک پر گیا تھا۔ اسے بھی ابھی آ جانا تھا، وہ اس تلخ گفتگو کو سمیٹ دینا چاہتی تھی۔

”شوگر مت ڈالنا۔“ نیا آ رڈر۔

”اب تم احسن کو غرے دکھا دو گی، فرمائش کرو گی، تمہارے پاؤں جم گئے ہیں، اب اسے خود سے

باندھ کے، مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کی جائے گی اور تم.....“

دعا نے مشین کے بٹن پر انگلی رکھ دی تاکہ شور میں اس کی آواز دب جائے۔ انہم دانت کچکا کے رہ گئی دعا کو اس کی سوچ پر ہنسی بھی آ رہی تھی، جب تک مشین نہ بند ہوئی وہ دعا کی پشت کو گھورتی رہی۔

”میرا اتنے اوجھے جھکنڈے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں البتہ تم جو چاہو، احسن کو سمجھا دو۔ مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں۔“ دعا نے نرمی سے اپنا موقف بتا دیا۔

”ظن کر رہی ہو؟“ اس کی نرمی بھی زبر گئی تھی۔

اس نے اپنے آگے جس رکستی دعا کو گھورا۔

”مشورہ دے رہی ہوں۔“ وہ کہہ کر پلیٹ لگی اور فرق میں سے قیمہ نکالنے لگی۔

”مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔“ وہ مزید چڑ گئی۔

”دعا..... دعا..... احسن باہر سے ہی آدازیں دیتا آ رہا تھا۔

انہم کے کان سائیں سائیں کرنے لگے، وہ صبح انہم کے اسی کو پکارتا تھا اس گھر میں صرف انہم کے نام کی گونج سنائی دیتی تھی۔ آج دعا کا نام بھی درود یوار سے ٹکرا گیا تھا۔

”تم یہاں ہو میں تمہیں بیڈروم میں ڈھونڈ آیا ہوں۔“ وہ کچن میں آ گیا۔

”جی میں آپ کے لیے قیمہ والا پرائیڈ بنا رہی تھی آپ کو پسند ہے ناں۔ آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے۔“ اس نے قیمہ میں سوکھا دھنیا اور زیرہ کس کرتے پوچھا۔

”مگر تم جو لیے کے سامنے اتنی دیر کھڑی نہیں رہ سکتیں، ماما نے رات تمہیں منع کیا تھا ناں۔ اب کیا مجھے ڈائنٹ پڑاؤ گی۔“ احسن ناراض ہونے لگا۔

”کیا ہو گیا ہے، صرف آپ کا بیک فاسٹ ہی تو بنا رہی ہے۔“ انہم فٹ سے بچ میں کود پڑی۔

”ڈاکٹر ماہرہ کہہ رہی تھیں، فرسٹ بے بی ہے،

بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی کوتاہی بہت بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی ہے۔“ احسن کا فرمان سن کے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”آپ نے خود ڈاکٹر ماہرہ کو کال کی تھی؟“ اس کے منہ سے سیٹی نما آواز نکلی۔

”ہاں میں نے کی بھی، بار انہم! تم پرائیڈ بنا دو، ساتھ میں ہری مرچ کی چٹنی بھی بنالینڈ میرا دل کافی دلوں سے چاہ رہا تھا اور تم چلو کمرے میں۔“ احسن نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔

انہم اس کی جرأت پر حیرت کے زیر اثر تھی، اس

کا کلائی تھام لینا، اسے لگا کہ جھٹ سر پر آگری ہے۔ اس کے ہاتھ سے جس کا گلاس کرتے کرتے بچا، اس نے ہشکل اپنے حواس قابو میں رکھے۔

”ہاتھ تو دھو لینے دیں۔“ دعا احتجاج کر رہی تھی۔

اس کا دل بھی مٹھی میں جکڑا گیا تھا، احسن کی ان تمام حرکات کا خمیازہ اسی کو بھگتنا تھا کیونکہ انہم نے تیور بدل لیے تھے۔

”اچھ ہاتھ میں دھو لینا۔“ وہ اسے باہر لے گیا تھا۔

”آئندہ میں تمہیں کوئی کام کرتے نہ دیکھوں۔“ وہ اس سے کہہ رہا تھا جو انہم نے بھی بخوبی سن لیا۔

اس کے جسم سے جان لگی جاری تھی وہ ساکت دجامد میر کی سطح کو گھورتی رہ گئی۔

☆ ☆ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

گل کھستار

نزدیکی

قیمت - 400 روپے

مکتبہ ایس کاہنہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی



”ہر وقت تسبیح گھماتی رہتی ہیں اماں۔ نجانے کیا پڑھ پڑھ کے اپنے بیٹوں پر پھونک مارتی ہیں۔ اس لیے تو دونوں بیٹے ماں کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے عمل کرتے ہیں!“

نانکھ نے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے کن اکھیوں سے اپنی ضعیف ساس کی طرف دیکھا جو پاس بیٹھے ہوئے بڑے بیٹے پر پھونک مارتی تھیں۔

”ارشاد کے لیے بھی کھانا لے آئیں۔ میرے ساتھ کھالیتا۔ آج کتنے دنوں کے بعد تو فراغت ملی ہے اسے!“ اماں نے بڑے بیٹے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ارشد جو نانکھ کے اشارے پر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تھا، اماں کی بات سن کر رک گیا۔

”ارے اماں! ارشد ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں! کچھ ویر آرام کریں گے۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ آپ آرام سے کھانا کھائیں، چلیں ارشد! میں آپ کے کپڑے نکال دوں۔“

ہمیشہ کی طرح نانکھ نے باتوں کے ہیر پھیر میں ارشد کو الجھا کر اماں کے پاس سے اٹھا دیا۔ ارشد بھی ہمیشہ کی طرح بیوی کی آنکھوں اور کانوں سے دیکھنے اور سننے والا۔ فوراً سر جھکا کر اٹھا اور اماں کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اماں نے گہری سانس لی۔ دل کے نہاں خانے سے اٹھتا اداسی کا ہلکا سا دھواں، سانس کی دھڑ سے الجھا تو اماں کا دل گھبرانے لگا۔ وہ سر جھٹک کر سامنے رکھے سادہ سے کھانے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ کچھ دیر تک دیکھتی رہیں اور پھر بم اللہ پڑھ کر پہلا نوالہ توڑا۔ چند نوالے بمشکل کھائے اور پھر اماں نے روٹی لپیٹ کر رکھ دی۔

”ایسی سمجھ تم رہنے ہی دو میرے بھائی! ابھی میں چلا۔“ زوہیب نے ہیملٹ پہنچے ہوئے ہاتھ ہلایا اور زن سے بانٹ کر لے گیا۔

☆☆☆

”یہ دیکھیں اماں!“ کھانے کے بعد زوہیب ماں کے ساتھ لیٹ کر باتیں کرنے لگا اور پھر ہاتھ

میں پکڑے موبائل پر انھیں نعین لگا دیں۔ اماں بہت خوش ہو کر دیکھنے لگیں۔

”زوہیب! میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں اللہ کے گھر جاؤں مگر۔۔۔!“ اماں نے حسرت سے موبائل میں نظر آتے خانہ کعبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر کیا ای! میں تھوڑے پیسے جوڑ لوں۔“



”آج ویک اینڈ ہے۔ سب دوست کریم مارکیٹ میں اپنی مخصوص جگہ پر جمع ہو رہے ہیں۔ زبردست سا پیزا لڑائیہ میرے طرف سے! آخر خواہ میں اضافہ جو ہوا ہے۔ تم بھی ناٹم سے آ جانا بلکہ ایسا کرو۔ میرے ساتھ ہی چلو۔ گھر جا کر کیا کرو گے!“

فیضان نے آفس سے نکلنے کے بعد زوہیب سے کہا تو بانٹک میں چابی لگا تا، وہ مسکرا دیا۔

”نہیں یار! جھپٹل کچھ دنوں سے اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اکیلے گھبرا جاتی ہیں! ویسے بھی سارا ہفتہ انہیں ٹھیک سے وقت نہیں دے پاتا ایک ویک اینڈ تو ملتا ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ نہ گزاروں۔“

”ایک تو تم بھی نا یا را اپنے والدین سے سب ہی محبت کرتے ہیں مگر تم نے تو حد ہی کر دی ہے۔ اپنے لیے بھی تھوڑا ناٹم نکالا کرو۔ کل کو تمہاری شادی بھی ہوئی ہے۔ اپنی فیملی کے لیے کیسے وقت نکالو گے!“

فیضان نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھایا۔

”تو کیا اماں میری فیملی نہیں ہیں؟“ زوہیب نے تعجب سے پوچھا۔

”تم سمجھ نہیں رہے یار!“ فیضان نے کچھ کہنا

ان شاء اللہ آپ کو ضرور لے کر جاؤں گا! ” زوہیب نے یقین سے کہا تو اماں دھیر سے مسکرا دیں۔

”بیٹا! بیماری نے کسی قابل کب چھوڑا ہے۔ اب مجھ سے سفر کہاں ہوگا! بس میری دعا ہے کہ تم بہت جلد اللہ کے گھر کا دیدار کرو۔ اگر تم نے کر لیا تو میں سمجھوں گی کہ میں نے بھی کر لیا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی اماں! ہم دونوں ساتھ ہی جائیں گے دیکھ لیتا!“ زوہیب نے کہا تو اماں خاموشی سے کچھ سوچنے لگیں۔

”زوہیب بیٹا! تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ میری ہر بات مانی ہے۔ بیٹا! میری خواہش ہے کہ اب تم شادی کر لو۔ دیکھو تمہارا بڑا بھائی خیر سے شادی شدہ بال بچوں والا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں سیٹ ہے۔ اس لیے میں اس کی طرف سے مطمئن ہوں مگر میرا دل ہر وقت تمہارے لیے بے چین رہتا ہے۔ میرے بعد تم کیا کرو گے!“

اماں نے کہا تو زوہیب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”اماں! آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں!“ زوہیب نے ماں کا گمراہ ہوا ہاتھ تھام کر کہا۔

”بیٹا! سوچنا پڑتا ہے۔ آنے والے وقت کے لیے! بس تم اب کچھ نہیں کہو گے۔ میں کل ہی تمہاری چھپو کے گھر جاؤں گی۔ لیکن سے تمہاری منگنی ہوئے بھی کئی سال گزر گئے ہیں۔ وہ لوگ بھی پوچھ پوچھ کر تھک کر خاموش ہو گئے۔ اگر لیکن کی مرضی اور پسند شامل نہ ہوتی تو شاید وہ یہ رشتہ ہی ختم کر دیتے!“ اماں نے آہستہ سے سمجھایا۔

”ہاں تو کر دیں! کسے فکر ہے!“ زوہیب نے لاپرواہی سے کہا تو اماں نے مسکرا کر اس کا کان پکڑ لیا۔

”اچھا زیادہ ڈرامے مت کر ماں کے سامنے جانتی ہوں حیرے دل کی بات! روز رات کو اس سے باتیں کرتا ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ میں سو رہی ہوں اس لیے مجھے کچھ نہیں پتا۔ مگر سب خبر ہوئی ہے مجھے!“

اماں کے کہنے پر زوہیب کھیٹا ہو کر ہنس پڑا۔ ”اچھا مان لیا! میری ماں لی بی بی ہے نا۔!“ ”وہ کیا ہوتا ہے؟“ اماں نے حیرت سے سوال کیا۔

”وہ جسے سب کی خبر رہتی ہے!“ زوہیب نے ماں کو ٹالا۔

”سب کی تو نہیں، ہاں مگر ماں کو اپنے بچوں کی خبر ضرور رہتی ہے!“

اماں نے بھی اطمینان سے جواب دیا تو زوہیب مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

☆ ☆ ☆

”ارے تم لوگ آج بھی گھر پر ہو؟ کہیں آؤنگ پر ہی چلے جاتے!“

نانکھ گنگنائی ہوئی نیچے اتری تو لاؤنچ میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی لیکن کوئی دیکھ نہ سکی۔ زوہیب کی شادی کے بعد وہ لوگ اوپر والے پوریشن میں سیٹ ہو گئے تھے۔ نانکھ دن میں اکثر نیچے جا چکر لگا کر سن گن لینے کی کوشش کرتی۔ چھ مہینے گزر جانے کے باوجود اسے اپنے مطلب کی کوئی بات نہیں ملی مگر پھر بھی وہ اپنی طرف سے پوری ”ایمان داری“ سے کوشش کرتی رہتی تھی کہ کسی طرح ان لوگوں کی پرسکون زندگی میں، پچھل چاکر تماشادیکھ سکے۔

”آئیں بھابھی! میں ابھی اچھے بنانے کے لیے اٹھ رہی تھی۔ اچھا ہوا آپ آئیں۔“ لیکن نے خوش دلی سے کہا۔

”چائے کچھ چھوڑو! میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو! زوہیب آج بھی اپنی اماں کے گودے سے لگ کر بیٹھا ہوگا اور تم یہاں اکیلی!“

نانکھ کے کہنے پر لیکن گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”ایسا نہیں ہے بھابھی! آپ کے دیور تو اپنی بائیک کی ہفتہ وار صفائی میں لگے ہوئے ہیں۔ اماں دوپہر کے کھانے کے بعد سے سو رہی ہیں۔ عصر کی اذان ہو جائے تو انھیں اٹھا دوں گی۔“ لیکن نے نرمی سے جواب دیا تو نانکھ ”ادنبہ“ کر کے رہ گئی۔

”ویسے تم اچھے پردے ڈالتی ہو! آخر مجھے کیا دکھو ہر کوئی حقوق کا احساس نہیں دلاؤ کی تو وہ ایسے ہی لاپرواہی سے پیش آئے گا۔ مجھے دیکھو ہر دیکھ ایڈ پر آؤنگ کا پردہ گرام بناتی ہوں۔ چاہے ارشد مائیں یا نہ مائیں۔ اس کے علاوہ بھی روز نہیں نہ کہیں ان کے ساتھ جاتی ہوں۔ اماں کی تو عجوری ہے کہ کہیں آ جا نہیں سکتیں مگر ہم کیوں خود کو پابند کریں!“ نانکھ نے نفوت سے کہا۔

”دراصل بھابھی! بات اپنی اپنی پسند اور ترجیحات کی ہوتی ہے! ضروری نہیں ہے کہ سب کی سوچ اور پسند ایک جیسی ہو! آؤنگ کرنا مجھے بھی اچھا لگتا ہے مگر مجھے تمہارا اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مجھ پر کوئی پابندی ہے! میں اپنی مرضی اور خوشی سے زیادہ وقت گھر میں گزارنا پسند کرتی ہوں۔“ لیکن نے اطمینان سے جواب دیا تو نانکھ سر جھٹک کر رہ گئی۔

کچھ دیر وہاں بیٹھ کر بھر چلی گئی۔ لیکن سب کاموں سے فارغ ہو کر میگزین دیکھنے لگی۔

”سنو! آؤں کریم کھانے چلو گی؟“ زوہیب نے میگزین کے ورق پلٹی لیکن سے پوچھا تو وہ چونک گئی۔

”اس وقت؟“ لیکن نے رات کے گیارہ بجاتی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”ہاں تو؟“ زوہیب نے ٹیکھے انداز میں پوچھا تو لیکن اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اماں رات کے کھانے کے بعد دوپہر کھا کر سو چکی تھیں۔ لیکن نے آہستگی سے دروازہ کھول کر اماں کو بخواب دیکھا تو اطمینان سے سر ہلاتی باہر نکل گئی۔ زوہیب نے اسے آتے دیکھ کر ایک اسٹارٹ کی۔ رات کی خاموشی میں بائیک کی آواز گونجی تو اوپر والی کھڑکی کا پردہ ہٹا اور نانکھ نے نونوں کو باہر جاتے ہوئے دیکھا تو منہ بنا کر رہ گئی۔

”ادنبہ! لیکن جنوں!!“

زوہیب اور لیکن قریبی آؤنگ کریم پارلر میں آئے۔ لیکن بیٹھے، اپنے سامنے رکھی مزیدار اور پسندیدہ کریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”ویسے آج بہت مہربان ہیں لوگ!“ زوہیب کے کپ میں سے پیچ بھر کر مزے سے کھاتے ہوئے لیکن شرارت سے بولی۔ تو جولیا زوہیب نے بھی اس کے کپ کی طرف پیچ بڑھایا مگر لیکن نے جلدی سے کپ پیچھے کر لیا۔ زوہیب اسے گھور کر رہ گیا۔

”ویسے ایک بات بتاؤ! کیا تم بھی نانکھ بھابھی کی طرح ہی سوچتی ہو کہ اماں۔۔۔!“ زوہیب کے چپ ہونے پر لیکن گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ زوہیب نے نانکھ بھابھی کی باتیں سن لی تھیں۔

”کیا آپ کو ایسا لگتا ہے؟ دیکھیں زوہیب! ہمارا رشتہ بنے زیادہ وقت نہیں ہوا مگر ہم دوستی کے ایک تعلق میں کئی سال سے بندھے ہوئے ہیں۔ شادی سے پہلے ہی میں بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ آپ کی سوچ اور ذمہ داری کیا ہے؟ میں نے یہ سب دل سے قبول کیا ہے۔ اور اماں صرف میری سانس ہی نہیں، میری مائی بھی ہیں۔ میرے دل میں ان کی جگہ اور مقام بہت اونچا ہے۔ آپ کسی دہم کا شکار مت ہوں۔“

لیکن نے نرمی سے کہا تو زوہیب کے دل میں جہاں اس کا مقام مزید اونچا ہوا، وہاں اس سے محبت میں بھی اضافہ ہو گیا۔

”سچ پوچھو تو تم سے اتنے سال ملتگی رہنے کے باوجود میں شادی کرنے سے ڈر رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ شاید میں ماں اور بیوی میں توازن نہیں رکھ پاؤں گا! نانکھ بھابھی اور ارشد بھائی کو دیکھ کر میں بہت حیران ہوتا۔ جس طرح نانکھ بھابھی نے ارشد بھائی کو اماں سے دور کر دیا، کہیں میری بیوی بھی آکر ایسا نہ کرے! میں بہت چھوٹا تھا جب ابائیں چھوڑ کر چلے گئے! اماں نے ہم دونوں بھائیوں کو بہت مشکل اور مشقت سے پالا پوسا ہے۔ میں ہمیشہ سے اپنی ماں کے زیادہ قریب تھا۔ ان کے ہر دکھ، درد کو بن کے سمجھنے والا۔۔۔! میں شاید بھی نہیں بھول سکتا کہ میری ماں نے ہمارے لیے کتنی قربانیاں دی ہیں! اور شاید اسی وجہ سے

میں ان کے بارے میں بہت حساس ہوں!"
زودیب نے سمجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ کھڑا دیکھیں گے زودیب!، علی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو زودیب اس کی آنکھوں سے جھانکتے یقین کو دیکھ کر مطمئن سے انداز میں مسکرا دیا۔

☆☆☆

"آپ کی بات ہوئی اماں سے یا نہیں!" نائلہ نے روز کی طرح جلدی جلدی کھانے کے برتن سینے ہوئے پہلا سوال یہی کیا تو ارشد گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"ایک بار کہہ تو دیا ہے تمہیں کہ اماں سے سب ملے ہو گیا ہے پھر بار بار سوال کیوں کرتا! دیکھو اونے پونے میں گھر بیچنے کو کوئی فائدہ نہیں بھی نہیں ہوگا۔ جب اچھی قیمت لگے گی تو گھر بیچ دیں گے یا مجھے میرا حصہ دے دیں گے۔ اب تم بھی کچھ صبر سے کام لو۔ تمہارے کہنے پر اپنی ماں اور بھائی کو چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔ تمہاری پسند کے مطابق شہر کے پوش ایریا میں کرائے پر گھر لے لیا ہے۔ گھر سیٹ کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں رہی۔ جو تم نے چاہا، وہی سامی تو ہو رہا ہے!"

ارشد نے تیز لہجے میں کہا تو نائلہ سنبھل کر بولی۔
"ہاں وہ تو مجھے پتا ہے۔ بچے بھی یہاں آ کر بہت خوش ہیں اور ہم سب گہری نیکیوں رہے ہیں؟ اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے نا!"
نائلہ نے ہمیشہ کی طرح بچوں کا نام لیا تو ارشد سر جھٹک کر رہ گیا۔

"ویسے کیا آپ کو لگتا ہے کہ زودیب کے پاس کبھی اتنے پیسے ہوں گے کہ وہ ہمیں ہمارا حصہ دے سکے؟" نائلہ کی سوئی گھوم پھر کے دہاں ہی آ کر رکی۔ ارشد بھی سوچ میں پڑ گیا۔

"مشکل ہے! اس کی تنخواہ تو اتنی نہیں ہے اسے گھر بیچنا ہی پڑے گا! میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔ آخر مجھے بھی کاروبار میں ڈالنے کے لیے

رقم چاہیے!" ارشد نے دو ٹوک لہجے میں کہا تو نائلہ کے دل میں سکون پھیل گیا۔

ارشد کو اس گھر سے یہاں تک لانے والی وہی تو تھی! ارشد کا روز بہ روز ترقی کرنا کاروبار، پیسے کی ریل پیل نے نائلہ کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ زودیب کی ترقی کی رفتار پچھوے بیسی بھی جبکہ ارشد خرگوش کی طرح لمبی لمبی چھلانگیں مارتا، بہت آگے نکل گیا۔ اماں ان کے گھر چھوڑ کے جانے سے بہت افسردہ نہیں مگر وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھیں۔ نائلہ نے بہت جالا کی سے، ان کا بیٹا دور کر دیا تھا۔ وہ سب سمجھتی تھیں مگر سب کچھ بھی چپ تھیں۔ نائلہ کی حرکتیں اور چالاکیاں ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ بس وہ گھر کا سکون برقرار رکھنے کے لیے خاموش رہتیں۔ جسے نائلہ ان کی کمزوری یا لاعلمی سمجھتی رہی۔

دوسری طرف لیلیٰ تھی۔ لیلیٰ جو بھی کرتی، اس میں کوئی دکھا دیا جبوری کا عنصر نہیں ہوتا تھا۔ لیلیٰ کا ہر عمل اس کی اچھی نیت اور صاف دل کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ اپنی ساس کی تنہائی اور بڑھاپے کو سمجھتی تھی۔ اس لیے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتی۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں سے اس کے سچے اور صاف دل کا پتا چلتا تھا۔ اماں بھلے پر ہیزی کھانا کھاتی تھیں مگر لیلیٰ انہیں دسترخوان پر اپنے ساتھ بیٹھنے پر اصرار کرتی اور وہ سب کھانا ایک ساتھ اور ایک جگہ پر کھاتے۔ پہلے پہل اماں نے منع کرنا چاہا تو لیلیٰ کے جواب نے انہیں لا جواب کر دیا۔

"اماں! آپ سے برکت ہے!"
لیلیٰ جب کبھی زودیب کو پریشان دیکھتی یا اس کی طرف سے پریشان ہوتی تو دوڑی ہوئی اماں کے پاس چلی آتی۔

"اماں! زودیب کے لیے دعا کریں! وہ آج کل پریشان ہیں۔"
"بے فکر ہو! میری ہر دعا میں شامل ہے وہ!"
اماں تسلی گھاتے ہوئے تسلی دیتیں۔

"جی اماں! مجھے پتا ہے مگر جب بھی میں آپ سے ان کے لیے دعا کا کہتی ہوں تو ان کی مشکل فوراً ختم ہو جاتی ہے!"

لیلیٰ کے کہنے پر اماں دھیرے سے مسکرا دیتیں۔ لیلیٰ بے خبری میں کائنات کے سب سے بڑے راز کو جان گئی تھی۔
کہ ماں کی دعا، اولاد کے لیے نجات کا ذریعہ ہے!

☆☆☆

"آج آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی!"
نائلہ نے سمجھے ہارے ارشد کو پانی کا گلاس پیش کرتے ہوئے پوچھا۔ ارشد نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"بس کیا بتاؤں! کوئی کام بھی سیدھا نہیں ہو رہا۔ کاروبار میں مسلسل نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ قرض ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو ارشد نے پریشانی سے کہا تو نائلہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جہاں جھکن اور پریشانی کا گہرا جال بچھا ہوا تھا۔

"ایک بات کہوں! آج صائمہ کا فون آیا تھا میری پریشانی دیکھ کر اس نے ایک بابا جی کا پتا دیا ہے جو کچھ لینے نہیں ہیں! اگر آپ اجازت دیں تو میں صائمہ کے ساتھ ان کے پاس چلی جاؤں!" نائلہ نے جھجکتے ہوئے کہا تو ارشد نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جودل چاہے کر دو!" ارشد کہتا ہوا اٹھ گیا۔ نائلہ نے گہری سانس لے کر اپنی چھوٹی بہن صائمہ کو کال کی اور گرین سگنل ملنے کی نوید سنائی۔ اگلے دن نائلہ بابا جی کے پاس سے ہو کر آئی تو بہت بُرا امیدوار مطمئن تھی۔ ارشد کو تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگی کہ "بابا جی بہت نیک اور نورانی چہرے والے ہیں! انھوں نے پڑھنے کے لیے کچھ وظائف دیے ہیں اور دعا بھی کی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" "اچھا چلو دیکھتے ہیں!" ارشد چپکلی سے

مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

☆☆☆

"عجیب سی مشکلات میں گھر گیا ہوں۔ ایک مسئلہ حل نہیں ہوتا اور دوسرا اٹھ اٹھتا ہے۔ زندگی کتنی مشکل ہو گئی ہے!" اپنے بچے کو ہسپتال سے ڈسچارج کروا کر ارشد گھر لایا تو تھک کر کہنے لگا۔ پچھلے ایک مہینے سے بچے کو لے کر مختلف ہسپتالوں کے چکر کاٹ رہا تھا کسی کو اس کی بیماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مشکل بچے کی حالت سنبھلی تو وہ شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے گھر کو لوٹے۔

"ہاں کیا کہہ سکتے ہیں!" نائلہ نے بھی مدھم لہجے میں کہا اور اٹھ کر گھر کے گھر کو سینے لگی۔
"مولوی صاحب! میں بہت پریشان ہوں! میرے لیے دعا کریں!" ایک مدھم سی آواز پر ارشد نے سر اٹھا کر دائیں طرف دیکھا۔ جہاں ایک آدمی مولوی صاحب سے دعا کے لیے کہہ رہا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد بہت سے لوگ جا چکے تھے۔ بس کچھ لوگ ہی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جن میں ارشد بھی تھا۔

"ہاں ضرور! دعا تو رحمت ہے اور رحمت تو سب کے لیے ہوتی ہے!" مولوی صاحب نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

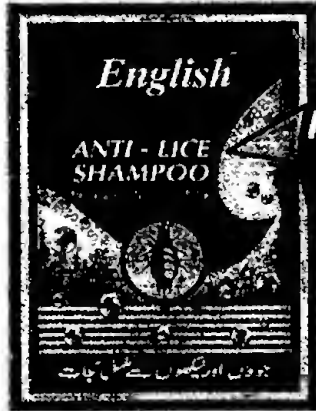
"ایک بات بتاؤ بھائی! کیا تمہاری ماں حیات ہے؟" مولوی صاحب کے پوچھنے پر اس شخص کے ساتھ ساتھ ارشد بھی چونکا۔

"اگر ماں حیات ہوتی تو فکر ہی کیا تھی مولوی صاحب! ان کی دعا تو ڈھال بھی میرے نیلے!" اس شخص کا لہجہ نرم ہو گیا۔ مولوی صاحب نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھیک کہا آپ نے! جس نے ماں سے دعا کی ہو، وہ دعا کے لیے درود کی ٹھوکریں نہیں کھاتا۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"اگر آپ کی ماں راضی تھی ہیں تو ان کی دعا کا سایہ ہمیشہ آپ کے سر پر رہے گا! فکر مت کریں!"

نہ کھجائیں.. Health ہو جائیں!



اصل کی پہچان
HOLD GRAPHIC PRINT

5 منٹ میں جوڑوں اور لکھوں سے مکمل نجات

”نانک! کیا تمہیں اماں کی طرح دم کرنا آتا ہے
ارشاد نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو
نانک! اس کی سرخ آنکھوں میں تیرے آنسو دیکھ کر
ساکت رہ گئی۔

”تم جانتی ہو آج میں کہاں گیا تھا؟“ ارشد
نے دوبارہ سر جھکا لیا۔

”کہاں؟“ نانک! نے سر راتی آواز میں پوچھا۔
”اماں سے ملے۔۔۔!“ نانک! لرز کر رہ گئی۔

”مگر نانک! اتنی دیر تک ان کے پاس بیٹھنے پر
بھی وہ نہیں ملیں۔ انھوں نے مجھے پریشان دیکھ کر
ہمیشہ کی طرح دم نہیں کیا۔ نانک! کیا مرنے کے بعد
ماؤں کی قبر کی مٹی بھی خاموش ہو جاتی ہے؟ اگر ایسا
ہے تو زوہیب کیوں کہتا ہے کہ اسے ہر بار اس مٹی
میں سے ماں کی خوشبو، ماں کا لمس، ان کا احساس نظر
آتا ہے۔! کیا اماں صرف زوہیب کی تھیں؟

دیکھو میں اماں کی قبر کی مٹی سے لپٹ کر اتار دیا
ہوں کہ خود مٹی ہو گیا مگر اماں کی خوشبو نہیں آئی اکیادہ
مجھ سے ناراض ہیں؟“

نانک! بچہ کا بت بن کر کھڑی تھی۔ اس کی
آنکھیں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مرد کوچوں کی طرح
پھوٹ پھوٹ کر رہا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

آج اس کے اندر کی حاسد عورت کو شکست کا
سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ جو آج تک اپنے تے بہت
چالاکی سے کھیلتی آرہی تھی۔ آج منہ کے بل گری تو
اسے اپنا بنایا ہوا یہ گھر بھی ہوا میں چوں کی طرح اڑتا
ہوا نظر آ رہا تھا۔

اس نے شکست خوردہ وجود کے ساتھ خود سے
یہ اعتراف کیا تھا کہ

”مکاری اور چالاکی میں بھٹلے میں کتنی بھی آگے
سہی! مگر میرے پاس اماں کے دم کا کوئی ٹوڑ نہیں ہے۔“



وہ شخص اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ارشد کے دل
کو کچھ ہوا۔ اسے اچانک یاد آیا کہ اماں بھی ہر وقت
اس پر دم کرتی رہتی تھیں۔ اماں کے ساتھ رہتے
ہوئے، وہ ایک عجیب سے حصار میں رہتا تھا۔ شاید وہ
اماں کی دعاؤں کا حصار تھا۔ جو کسی مشکل یا پریشانی کو
اس کے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ جب کبھی وہ پریشان
یا بیمار ہوتا تو اماں کے کچھ پڑھ کے پھونک مارنے
سے فوراً ہی ٹھیک ہو جاتا۔ نجانے اماں کے دم میں ایسا
کیا جادو تھا۔ وہ بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور
تھکے ہوئے قدموں سے مسجد سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ جب اپنے پرانے گھر پہنچا تو مغرب کی
اذان ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ مین گیٹ کی لائٹس
روشن تھیں۔ گھر کے دروازے پر ہوا نیا پیٹ اور پورچ
میں کھڑی مٹی کی گاڑی، اور زوہیب کے نام کی نیم
پلیٹ، اس کی ترقی کی نشان دہی کر رہے تھے۔

”دیر سے ہی کبھی مگر سب کچھ تو زوہیب نے
بھی حاصل کر ہی لیا نا! اپنا گھر، اچھی گاڑی، ترقی،
اچھی بیوی، پیارے بچے اور سب سے بڑھ کر اماں کی
محبت اور رضا۔۔۔! زوہیب کتنا خوش نصیب
ہے۔۔۔!“

ارشاد نے گہری سانس لی۔ مغرب کی اذان کا
نور ہر طرف پھیلنے لگا تو وہ مغرب کی نماز پڑھنے کے
لیے قرعہ مسجد کی طرف چل پڑا۔

وہ اپنے گھر لوٹا تو رات کا اندھیرا چھیل چکا تھا۔ نانک!
اسے دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھی۔

”حد ہے بھی! میں نے کتنی کالری ہیں مگر آپ
کافون ہی آف تھا! کہاں رہ گئے تھے آپ!“

نانک! نے اس کے شکن زدہ اور مٹی سے اٹے
کپڑوں کی طرف جبر سے دیکھا۔

ارشاد خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”سنو نانک! تم ہر فن میں طاق ہونا!“ ارشد نے

مدغم لہجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ نانک! نے الجھ کر پوچھا۔

خانہ کھانا

”اف منت کیا بتاؤں تمہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ لندن میں رہتے ہوں گے۔ آئی تو خیر شروع ہی سے مولویانی (مولویانی) تھیں۔“ اس کے برٹش لہجے میں اردو میں بات کرنے پر ادھر منت ہنس ہنس کر دہری ہو گئی تھی۔ مولانا ہاتھ میں پڑے وہ پہلے کھڑکی میں کھڑی تھی پھر بیڑ پر گر گئی۔

”ان کی اولاد بھی ان ہی پر گئی ہے۔ جب تم یہاں آؤ گی تو دیکھنا کیسے کیسے نمونے بھرے بڑے ہیں ان کے گھر میں۔“ اس کے انداز پر اس کا نفرتی نقطہ کمرے کی خاموش فضا میں جلتر گلا بجانے لگا۔

”اب تو مجھے بھی دیکھنے کا بہت شوق ہو رہا ہے۔ کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ آئی سے تو ملاقات سال دو سال بعد ہوئی جاتی ہے جب وہ پاکستان آتی ہیں مگر ان کی اولادیں۔۔۔ کافی عرصہ ہو گیا ان کو دیکھے۔“ کچھ سال پہلے دیکھی گئی اپنی کزنز اور لمبا سر مل سڑو سے یاد آ گیا۔

”کر لینا شوق بھی پورا نہیں دیکھنے کا نہیں تو آتا ہے تمہیں۔ ملاقاتیں بھی ہوں گی۔“ اسی نے اس کے شوق کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم سناؤ تمہاری تیاری کہاں تک پہنچی۔ ہم تو ساری تیاری ادھر آ کر ہی کریں گے پاکستانی لیسٹ

مکمل ناول



ڈرمسز۔ واہ۔ اس نے سوچ کر ہی خوب صورت کام والے کپڑوں کا نذر لیا۔

”کچھ ہوئی کچھ ہو رہی ہے۔ چل رہا ہے سب کچھ۔“ اسنے کالے گھٹے ہاتھوں میں ہاتھ پھیرتے اس نے سامنے غیشے میں اپنا عکس دیکھا اور کتنی دیر تک دیکھتی ہی رہی۔

”شادی کے ڈرمسز بھی فیضی اور تم اپنی مرضی سے لے لیتا۔ آج کل تو ویسے بھی اتنی دراگنی ہے کہ چو اکر مشکل ہو جاتی ہے۔“ آخر وہ جس کا تذکرہ سننا چاہتی تھی اس کا ذکر ہو ہی گیا تھا۔ اس کا گلابی رنگ مزید گلابی ہو گیا۔

”ہوں۔“ ہولے سے بولتے ہوئے وہ مسری پر پھٹی چوڑے کے ڈیزائن پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ فیضی یعنی فیضان احمد کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی مگر ایسے

کے بیٹے کے رونے کی بدولت پوچھ نہیں سکی تھی۔
”اچھا مہمان کو دیکھ لوں ذرا پچھات کر س گے اور ہاں تم دو چار اچھے اچھے ڈرمسز کی فوٹوز سینڈ کر دو مجھے کچھ تو اندازہ ہو کہ کس طرح کا ڈریس لوں میں اپنے لیے۔“ ایسے اسے تاکید کرتے فون رکھ کر جا چکی تھی اور وہ آنے والے دنوں کے سنہری خواب آنکھوں میں سنبھلے خواہ مخواہ مسکرا رہی تھی۔

برش لمبے میں بات کرنے والا وجیہ فیضان احمد صرف اس کی پیچھو کا بیٹا ہی نہیں تھا اس کو پسند بھی تھا۔ شاندار، من چاہی زندگی اور من پسند ساتھی۔ اس کی دھڑکنوں کی لے لے تھم تھم کر چلنے لگی۔ وہ شاید پندرہ سال کی تھی جب پیچھو نے اسے فیضان کے لیے مانگا تھا۔ لپا کی لاڈلی بہن تھیں وہ بھلا ان کی بات کیسے ٹال سکتے تھے۔ سو اس کے ہاتھ میں فیضان کے نام کی انگوٹھی جگمگانے لگی تھی۔ ہر دو سال بعد آنے والی اس کی پیچھو اگر اس کی انیڈیل تھیں تو ان کی اولادیں اس کی دوست۔۔۔

محمد رؤف صدیقی پیر مل کے مالک تھے جو انہوں نے انتھک محنت سے بنائی تھی ان کی چار بیٹیوں میں سب سے بڑی منت جو انگلیش لٹریچر میں ماسٹر کر رہی تھی۔ تحریک ملی ایس سی میں تھی اور حرم اور اول دونوں جڑواں تھیں اور میٹرک میں تھیں۔ حرارؤف ان کی بیگم بڑھی لکھی خاتون تھیں انہوں نے بہت سال پہلے ایک اسکول کھولا تھا جواب اچھے اسکولوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی ساری دلچسپیاں اسکول کے ساتھ تھیں۔

رؤف صدیقی کی دو بیٹیاں تھیں۔ حنا صدیقی اور ہما صدیقی۔ دونوں بہت سال پہلے بیاہ کر لیے گاؤں اور پھر لندن چلی گئی تھیں۔ حنا بڑی تھیں۔ گاؤں میں شادی ہوئی تھی پھر وہیں سے لندن جانے کا سلسلہ چل نکلا تھا اور ہما ابھی انہوں نے ہی بیاہ لیا تھا۔ حنا کی تین اولادیں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں اور ہما کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

رؤف صدیقی دونوں بہنوں سے چھوٹے تھے اس لیے ان کی اولادیں بہنوں کی اولاد سے چھوٹی تھیں۔ ہما کا بڑا بیٹا نعمان اور بیٹی ایسہ شادی شدہ تھے اور فیضان کے لیے انہوں نے منت کو مانگ لیا تھا۔

”من“ آج چلو میرے ساتھ شاپنگ کرلو۔ اتنے سارے کام جو بیڈنگ میں پڑے ہیں ان کو بھی تو نمٹانا ہے ویسے بھی تمہاری پیچھو کے آنے پر شاپنگ والی بات تو اب ختم ہوئی کیوں کہ ان کو صرف دو دن پہلے آنا ہے۔ اب ساری تیاری وہیں سے کریں گی۔ تم بھی مکمل کر لو اپنی شاپنگ۔“

حزاییم اس کے سامنے جس کا گلاس رکھتے اسے تفصیل سے بتا رہی تھیں۔ انہوں نے آج اسی وجہ سے چھٹی کی تھی۔ منت ویسے ہی پیرز کے بعد فارغ تھی۔ اس نے سرسری سا انہیں دیکھا اور گھونٹ گھونٹ جوس اپنے اندر اندر لینے لگی۔

فیضان اس کا کزن اور منگیت تھا، مگر ساری بے قراری اور بے چینی صرف اسی کی طرف سے تھی۔ ہر کوئی فیضان کی بے انتہا مصروفیات کا ہی رونا روتا نظر

آتا تھا۔

”لیدر فیکٹری نہ ہوگئی، آری والوں کے رول ہو گئے۔“ بے دلی سے سوچتے اس نے جوس ٹیبل پر رکھ دیا۔ ”نوں بھی وہی کیا کرتی اور کبھی بھڑاس سے بات ہو جاتی۔ وہ میری انگلیاں پھیرنے لگی۔“ منت تم خود ہی شاپنگ کرلو۔ کوئی اچھا سا مگر چوز کر لیتا۔ میں تو ایک دن پہلے ہی آسکوں گا۔“

اسے اس کی کچھ دن پہلے کی باتیں یاد آئی تھیں۔ اس نے کیسے آرام سے کہہ دیا تھا اور اس کے سارے منصوبے دھڑے کے دھڑے رہ گئے تھے۔ کچھ سال پہلے تک کیا بنس کھ ہوا کرتا تھا۔ اس نے ٹانگیں گرسی کے اوپر کر لیں۔ کچھ دن پہلے تحریم کے ساتھ کی محنتی گفتگو اس کے ذہن میں ابھرنی رہی۔

”وقت کے ساتھ میچ جوبلی آگئی ہے۔ اچھا ہے ہاں۔“ بھی تو وہ اس سے چھوٹی مگر ملا کی سمجھ دار تھی۔ اپنے خدشات اس نے صرف تحریم سے شیئر کیے تھے

اور تحریم نے اسے مطمئن بھی کر دیا تھا۔

”ہاں پروگرام کیا ہے آج کل۔ میں نے اسی لیے چھٹی کی ہے اور تمہاری خالہ بھی آ رہی ہیں اسی مقصد کے لیے۔“ حنائے اسے وہیں بیٹھے دیکھ کر اس کے قریب آکر پوچھا تھا۔ وہ سوپ کے لیے سبزیاں نکال رہی تھیں جانے سے پہلے کچھ کام بنانے تھے۔ ”آپ تحریم کو ساتھ لے جائیں وہ پسند کر لے گی سب کچھ۔“

”شادی تمہاری ہے اور پسند تحریم کرے گی۔ واہ! تمہارا بھی جواب نہیں۔“ وہ اسے شاباشی دے کر کندھا ٹھیکنے لگیں۔ ان کے انداز پر اسے ہنسی آئی۔ ”اچھا ٹھیک ہے ہو جاتی ہوں تیار۔“ بے دلی سے کہتی وہ چیل ٹھیکنے لگتی تھیں کہ کر کے کی جانب چل دی۔ ”ہاں ہاں مولائی ہے جناب کی۔“ انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

”آخر یہ فیضان آسکوں نہیں جاتا۔“ اب وہ تحریم کے سر پر سوار تھی۔ اس کیچ بناتے بناتے اس نے اس

کے منہ کے مجڑے زاویوں کو دیکھا۔ چہرے پر بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ ”منم ابیہ کو کیوں نہیں بلا لیتیں۔ آخر کو تمہاری سہیلی مند ہے تمہارے ذہن میں فوٹو ڈالنے والی۔ اب آکر شاپنگ کروا دے تمہیں۔“ بڑے محل سے اس نے اسے راہ دکھائی۔

”ہاں کہہ چکی ہوں کئی بار ہر ایک کی مصروفیات میری شادی کی منتظر ہیں۔ اس کے بچوں کے بھی پیپر ہیں۔“

”اگر تم پیروں سے فارغ ہوگئی ہو تو کیا ضروری ہے کہ باقی سب بھی ”ویسے“ ہوں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ شادی کی تاریخ آگے کر دی جائے جب سارے فارغ ہوں تو۔“ اس کے چیمپرنے پر اس نے پاس پڑا تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا۔

”من کی بیٹی امیرا سارا اس کیچ خراب کر دیا۔“ اسے گھر کتنے وہ اپنا اس کیچ ٹھیک کرنے لگی۔

بڑے سے صحن میں پھیلی دھوپ کی حدت ابھی جوں کی توں تھی۔ صحن میں لگا ہرے بھرے پتوں والا درخت اپنے نیچے چھاؤں کے ”سروانی“ اور اس کے بچوں کو اپنی پناہ میں لیے ہوئے تھا۔ کالے رنگ کی مرغی اور اس کے بچوں کو اس نے برآمدے سے درخت کے نیچے اونگھتے دیکھا تھا۔

”حسین کے لیے روٹی بناؤں پھر ان کو دانہ ڈالتی ہوں۔“ دل میں سوچتے ہوئے اس نے بچن کی جانب قدم بڑھا دیے۔

روٹی بنا کر روٹل میں لپیٹتے اس نے سامن گرم ہونے کے لیے رکھا اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چوزوں کے آگے ڈالے۔ مرغی اور چوزے جیسے کھانے پر ایک دم ٹوٹ پڑے تھے۔ مرغی زمین پر چوچ مار مار کے بچوں کو متوجہ کر رہی تھی۔ انہیں وہیں چھوڑ کر وہ اندر گئی، گھسیٹ کر بیڈ سٹل فین برآمدے میں لائی، چٹائی، بچائی اور ایک بار پھر کمرے

ہی غلطی ہے سب۔ اگر پہلے انہوں نے دیکھے لہجے میں اعتراض کیا۔

”تو کیا آپ مجھے پہلے بتا دیتیں۔ ذلیل کرنے کے لیے کیا آپ کو میں ہی ملتا تھا اب جب کہ سب لوگ میرے گھر میں جمع ہیں۔ بات کے آنے سے پہلے آپ مجھے بتا رہی ہیں کہ آپ کا بیٹا بھاگ گیا ہے۔“ انہیں شدید غصہ آیا تھا ان پر لڑی لیے آواز اٹھی ہو گئی۔ ہا نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے معاف کر دو رؤف۔“ انہوں نے ان کے بندھے ہاتھوں کو نظر انداز کر کے دوسری جانب منہ پھیر لیا۔ ان کا عقد قابو سے باہر ہو جا رہا تھا۔

”اگر ایسا ہی ہے قابو اور آوارہ تھا آپ کا بیٹا تو میری بیٹی مجھے پہلے دیا ہوتا۔“ نہ جانے انہوں نے خود کو کیسے کنٹرول کیا تھا۔

”جائیں ایسا یہاں سے چلی جائیں اس سے پہلے کہ مجھے خود پر دبو نہ رہے۔“ ان کا چہرہ شدت جذبات

کئی مہینے گزر گئے تھے۔ اس کا اپنا کوئی بہن بھائی تھا نہیں جس سے مشورہ کرتا۔ جگہ کے بھائی سے مشورہ کرنا چاہیے۔ اس نے سوچنے کا وقت لے لیا۔

”ہا ہا ہا! کیا ریس لگا کر آئی ہیں۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟“ بڑے سے لان میں مہمانوں کا استقبال کرتے اسے ہاندر جاتی نظر آئی تھیں۔ ابھی رات مندی کے فنکشن پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پرسوں رات ان کی ساری فیملی کو انہوں نے ڈیورٹ پر ریو کیا تھا۔ گھر لانے کا ٹھکانا تھا۔ اور گپ شب میں وقت گزرنے کا علم ہی نہ ہو سکا تھا۔ ان کے بہت روکنے پر بھی وہ نہیں رکتے تھے۔ ان کے ہونٹوں میں کمرے پہلے سے بک تھے۔ سودھ سب ادا ہو چکے تھے۔ ہما کا چہرہ دیکھتے انہیں عجیب سا احساس ہوا تھا جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر رہے تھے۔

”رؤف رؤف وہ۔“ کمرے کا دروازہ بند کرتے کوئی تیسری بار ان کا نام پکارتے وہ پھر سے چپ ہو گئیں۔

”سب ٹھیک تو ہے نا ایسا۔ امانت بھائی کی طبیعت۔“ ہونٹوں کے کنارے انہیں کل کافی پریشان کیا تھا۔

”وہ ٹھیک ہیں۔ بس فیضان واپس چلا گیا ہے۔“ ان کی طرف سے جیسے دیکھے لہجے میں دھماکا کیا گیا تھا۔ ”کیا کیوں؟“ ”کیسے چلا گیا واپس۔“ ہما کے الفاظ توان کی سمجھ میں آگئے تھے شاید مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ہی اسے قسمیں دے دے کر منانا یہاں آنے پر راضی کیا اور آج۔“ اب کچھ چھپانا ممکن نہیں تھا۔ وہ پچھلے پچھلے کروڑ لگیں۔ وہ من سے وہیں کھڑے رہے۔ ”کیوں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

”کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر میں۔ میری

دریافت کرنے والا تھا اس کی بات کے دوسرے حصے پر ٹھٹھک کر پوچھنے لگا۔

”رجو تو یہاں ہوتی ہے ہاں پتا چلا تھا کہ مجھے آئی ہوئی ہے ہاں بچوں کے ساتھ جب اہل زندہ تھیں تو بہت آنا جانا تھا اس کا یہاں بیٹھا ہوا تھا اہل نے اسے۔ مجھے بھی بھائی کہتی تھی۔ دیکھو کتنے دن ہو گئے۔ ملنے بھی نہیں آئی ایک بار بھی۔“

حسین کو زیادہ بولنے کی عادت تھی۔ وہ بولا تو بولتا ہی چلا گیا۔ ”ویسے کیا کہا رہی تھی۔“

”کتنی ہے۔“ اوہ لندن میں مسجد میں بچوں کو قرآن پڑھایا کر دیا۔ اس کا میاں وہاں مسجد کی انتظامیہ میں ہے۔ کتنی بھی بھائی حسین کو بھی لے جاؤں گی اور مجھے بھی۔ آپ سے ملنے آئے کی تو میاں بھی ساتھ آئے گا اس کا۔“ اس نے اپنی طرف سے اسے حیران کر دیا تھا۔

”او مذاق کر رہی ہوگی۔ بڑی مذاقہ تھی۔ ہر وقت باتے میں پڑی رہتی تھی۔ اب بھی وہی کر رہی ہوگی۔ ویسے بھی ہم اپنا کھار چھوڑ کر نئی جگہ پر کیوں جائیں گے۔“

اس نے سر ہلادیا۔ ”یقیناً وہ بہتر جانتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ مذاق ہی کر رہی ہو بات آئی گئی ہو گئی تھی مگر اگلے ہی دن اس کی بات غلط ثابت کرنے کو وہ اپنے میاں کے ساتھ چلی آئی تھی۔

”بھائی! بلاش،“ خواہ اور اچھی جگہ پھر مسئلہ کیا ہے چلنے میں۔

رجو (رضیہ) کامیاب عاطف اچھا خاصا پڑھا لکھا چلتا پرزہ قسم کا بندہ تھا وہی حسین کو یقین دلانے میں کامیاب رہا تھا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔

”اگر آپ اپنے لیے پریشان ہو تو میں ہوں ناں وہاں آپ کی نوکری کا بندہ بہت بڑا ذمہ۔“ حسین کے سوچنے پر اس نے اس کی یہ پریشانی بھی دور کر دی تھی۔ وہ تب سے یہی سوچ رہا تھا کہ یہ آفر تو اس کی جگہ کے لیے تھی تو وہ کیا کرے گا وہاں۔ اہل کا انتقال ہوئے

میں آئی۔ حسین آنے والا تھا۔ جب وہ کھانا کھا چکا تو بچے پڑھنے آنا شروع ہو جاتے تھے اس کے گھر کی ہر روز کی مصروفیت تھی اور اس میں کبھی کبھار ہی بدلاؤ آیا کرتا۔

حسین کی گاؤں کے کٹر پر دکان تھی۔ تھوڑی بہت زمین بھی تھی جو اس کے اور اس کے چاچے کے بیٹوں کے درمیان تنازعے کا باعث تھی جس کی وجہ سے کئی سال سے مقدمہ چل رہا تھا۔ وہ تین سال پہلے ہجرات کے اس دور وراز گاؤں میں بیاہ کر آئی تھی۔ باجرہ احسان اس کے ابو کی دور پرے کی بہن تھیں اور حسین ان ہی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ آئی ابو کے مرنے کے بعد ان بہن بھائیوں کی زندگی جن مشکلات کا شکار رہی تھی اس میں حسین کا رشتہ ایک نعمت کی طرح تھا جسے فوراً قبول کر لیا گیا تھا اور وہ لاہور سے بیاہ کر ہجرات آئی تھی۔ اب تو وہ اس زندگی کی عادی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی حسین کی روز بروز بڑھتی محبت اسے کچھ اور سوچنے کی نہ دیتی۔

”کیا حال ہے میری جگہی کا۔“ کیسا گزرا آج کا دن۔“ پورے دن کی تھکاوٹ کے بلوچہ وہ اسے دیکھ کر ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔

”بالکل ٹھیک“ آپ سناؤ، کیسا گزرا آپ کا دن۔“ اس نے اس کا وہ بیان خود سے ہٹاتے سامنے رکھی روٹی کی طرف دلا دیا اور اس سے پوچھنے لگی۔ اس کے دیکھنے پر وہ اسی طرح مجبور ہو جاتی تھی۔

”اچھا گزرا بس آج شہر جانا پڑا دکان کی کچھ چیزیں ہم“ (ختم) گئی تھیں، کئی دنوں سے لوگوں نے پوچھ پوچھ کر جان تک کی ہوئی تھی۔ آج آخر کار لے ہی آیا جا کر۔“ وال کے ساتھ روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالتے وہ اسے تسلیلا بتا رہا تھا۔

”آج صبح ماسی حلیما اپنی بیٹی کے ساتھ آئی تھی۔ بڑی عجیب بات کر کے گئی ہے۔“ اس کی بات سنی سے سننے کے بعد اس نے اچانک بات شروع کی تھی۔ ”ہیں کیا عجیب بات۔“ وہ جو ماسی کا حال چال

ہیوٹی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں غلطی ختم
کرتے ہوئے ہاتھوں کو دھوئے
ہاتھوں کو مہذب اور چمکدار بناتا ہے

قیمت -/120 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر ہر روز سے منگوانے والے
دو ہفتوں -/300 روپے تین ہفتوں -/400 روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل ہیں۔

بڑے بڑے ڈاک سے منگوانے کا پتہ
ہی ٹیکس 53 اور گریڈ ایکٹ ایم کے جی راولپنڈی۔
ذاتی خریدنے کے لیے:

کتیہ عمران ڈاکسٹ 37 اور ڈاکٹر ایم کے جی راولپنڈی۔ فون نمبر 32216361

اور اشتعال سے وہک رہا تھا۔ مٹھیاں بند کرتے کھولتے ان کاہل نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر دیں۔
”یہ مسئلہ میری ساری ٹیکوں کا۔ امی ابو کے بعد آپ دونوں کی تعلیم شادی، آپ کا باہر میٹل ہو نہ کہ اس کی رہی تھی جو آپ کی اولاد مجھے یوں ذلیل کر گئی۔ اب یہ کی شادی، نعمان کی شادی ان کے رشتے۔ رؤف بھی کوئی رشتہ دیکھو یہاں کے لڑکوں سے تو میں اپنی لڑکی کا رشتہ بالکل کرنے کی نہیں۔“ انہوں نے اس کی نقل اندلی۔

وہ آپ سے باہر ہو رہے تھے، تھوڑی دیر کو سامنے لینے کے لیے رکے۔ اسی وقت حرا اور حنا کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ کمرے کے فضا ان کی توقع کے بالکل خلاف تھی۔ کونے میں روٹی ہوئی تھا اور سرخ چروہ اور تیز آواز میں بولتا رؤف۔

”آپ کی آواز اب ہر تک جا رہی ہے۔ آہستہ بولیں۔ کچھ پتا بھی تو چلے کہ آخر ہوا کیا ہے؟“ حرا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”جیسے ہو۔ ان سے پوچھو، ان کا بیٹا بھاگ کر لندن چلا گیا انہیں سب کچھ پتا تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کہیں اور منہ کالا کر رکھا ہے اس نے پھر بھی یہ اسے پہلا پھسلا کر یہاں لے آئیں، پوچھو ذرا۔“ حرا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

”یا اللہ خیر! باہر اتنے سارے مہمان جمع ہیں۔ اب کیا ہوگا؟“ انہوں نے حنا کی جانب دیکھا جو جن کھڑی بھی رؤف کو چپ کرانے اور بھی ہما کی ہچکیوں کو بند کروانے کی کوشش کر رہی تھیں۔
”ہا! اسے کال کرنے کی کوشش کرنا تھی۔ اگر یہیں ہے تو اسے سمجھا لیتے۔ حنا نے دوپٹا سنبھالتے رساں سے ہاتھ سے کہا تھا۔

”آ! بڑی کوشش کی پروہ فلائی کر چکا تھا۔ اب تک تو پہنچ بھی گیا ہوگا۔“
”تو آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ جاؤں چلی جائیں

یہاں سے۔“ رؤف نے ہاتھوں سے انہیں دروازے کی جانب دھکیل دیا۔

وہ بھائی کے عصبیلے چہرے کو نظر بھر کر دیکھتے وہاں سے باہر نکل آئیں۔ نا فرمان اولاد کیسے ذلیل و رسوا کرتی اور کرواتی ہے اس کا احساس کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔ آج ان کا اکٹوٹا بھائی ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو گیا تھا۔ مرے قدموں کو کھیت کر نہ جانے انہوں نے گیٹ تک کا راستہ کیسے طے کیا تھا۔

کمرے میں موجود تینوں انوس ایک، دوسرے کی طرف دیکھ کر نہیں رہے تھے۔ ”اب کیا ہوگا؟“ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ان تینوں کو معلوم ہوتے ہوئے بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔

”وہ اور بس، میرا بار نہ دو بار رشتہ مانگا اس نے مجھ سے منت کا۔ میں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگا بھائی باہر لے لڑکوں پر اعتبار نہ کرنا۔ میں نے خوب دلا کھل دیے اسے۔ اب اس کو موقع مل جائے گا مجھے ذلیل کرنے کا۔“ سر ہاتھوں میں تھا کہ وہ اچانک بولنے بولتے خاموش ہو گئے۔

”آ! آپ تو اسی شہر میں رہتی ہیں۔ آپ نے بھی کچھ نہ بتایا۔“ انہوں نے پریشان بیٹھی حنا سے شکوہ کر ڈالا۔

”بھائی! میں گھر میں رہنے والی عورت۔ مجھے کیا پتا.....“

”کچھ کریں رؤف! میری تو بیٹی کی زندگی خراب ہو گئی۔“ حرا روتے ہوئے ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔

”چار چار بیٹیوں کا ساتھ ہے۔ باقی رشتے کیسے کریں گے ہم۔ کیا بتائیں گے لوگوں کو۔“ رؤف صدیقی بھی کرسی پر بیٹھ جاتے بھی اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگتے۔ حرا ہاتھوں کو ایک دوسرے سے ملاتے، نم آنکھوں سے نہ جانے کیا سوچے جا رہی تھیں۔ ”اب کیا ہوگا“ کا ڈراؤنا جن منہ کھولے ان سے سامنے تھا۔

”آ! آپ ہی کچھ بتائیں، کریں اب باہر جا کر

لوگوں کو کیسے بتاؤں کہ بارات نہیں آ رہی، کیسے دوں گا جواب میں لوگوں کے سوالوں کا۔“ پنڈال میں پوچھتے جانے والے سوالوں کو سوچ کر ہی ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

”دوہا بھاگ گیا۔“ بھی ولسن تو سنی تھی بھاگتے یہاں تو دوہا ہی غائب ہو گیا۔ نیا زمانہ ہے بھی نیا زمانہ۔“

”آپ کا تو بھانجا تھا نا، پھر ایسا کیسے ہو گیا۔“

”کیا لڑکی پسند نہیں تھی اسے۔“

”لڑکی میں ہی کوئی عیب ہوگا۔ عین وقت پر بتا چلا تو چھوڑ کے چلا گیا۔“

طرح طرح کی آوازیں ان کی سوچوں کو پر آگندہ کر رہی تھیں۔ نیوی بلیو ڈنر سوٹ میں ملبوس باوقار سے رؤف صدیقی کے چہرے کا سارا خون جیسے کسی نے نچوڑ لیا تھا۔

”تو صلہ رکھو رؤف! اللہ بہتر کرے گا۔“ آف وائٹ شیفون کے سوٹ میں بڑے سے دوپٹے سے خود کو مکمل طور پر ڈھانپنے حنا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔

”حرا ہم بھی حوصلہ کرو۔ بیٹھو یہاں۔“ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر روٹی ہوئی حرا کو بیڈ پر بٹھا دیا۔

”پانی لاتی ہوں تمہارے لیے پھر مل کے کچھ سوچتے ہیں۔ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“

ان دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر وہ کچھ دیر کے لیے منظر سے غائب ہو گئی تھیں۔

”انسب بیٹے! کہاں ہو تم۔ ابھی تک پہنچے نہیں یہاں۔ میں تو تمہارا انتظار کر رہی ہوں کب سے۔“ ان کا لاؤ لا فریادوار بیٹا شاید اس بار اسی لیے پاکستان آیا تھا۔ انہیں اس پر خود سے زیادہ یقین تھا مگر اس سے بات کرنا بھی ضروری تھا۔

”بس امی! ابھی ماموں کے گیٹ سے اندر آیا ہوں۔ سوچا تھا پہلے پہنچ کر ماموں کی کچھ پہلپ کروں گا مگر جلدی نہیں آسکا۔“ وہ قریب ہی تھا انہیں حوصلہ سا ہوا۔

”انسب! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے سیدھے اندر آ جاؤ۔“ فون بند کر کے وہ اس کا انتظار کرنے لگیں۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ دوسروں کا پھیلا یا ہو آگند ہمیشہ ہم ہی ہمیشیں؟“ بلیک ڈنر سوٹ میں ان کے سامنے کھڑا ان کا چہرہ بیٹا ان سے جواب طلب کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک قنبلیلی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ اس کی صاف گوئی سے سراسیمہ ہو گئی تھیں۔

”اس طرح کی فضول باتوں کی مجھے تم سے توقع نہیں تھی۔“ ان کا لہجہ تاویسی تھا۔

”ہاں توقع تو بہت سی چیزوں کی نہیں ہوتی۔ آپ کے عزیز از جان، ہسٹری اور بہن نے کیا کیا؟ اس کی توقع تھی کیا آپ کو؟“

وہ نہ جانے کیا جتنا ناچا رہا تھا۔ وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئیں۔ وہ ان کے ساتھ ہی پاکستان آیا تھا مگر کراچی اپنے دوست کی شادی اٹینڈ کرنے چلا گیا تھا۔ کچھ کام اس کے ابو کے تھے جنہیں بنانے کے بعد وہ یہاں پہنچا تھا۔ اس کا انداز تھوڑا بد تمیز، تھوڑا متفرسا تھا۔ وہ کتنی دیر اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ وہ کبھی کبھار ہی تو ایسا بد مزاج ہوتا تھا۔

”بنو میں نے پوچھا ہے وہ بتاؤ، تم راضی ہو کہ نہیں۔“ دونوں انداز میں اس سے بات کر کے وہ اسے دیکھنے لگیں۔

اس نے ایک لمبا گہرا سانس لے کر کندھے اور ہاتھ اوپر اٹھائے جیسے ساری صورت حال اس کی سمجھ سے باہر ہو۔

”کیا یہ سب آج ہی ضروری ہے۔“

”ہاں۔“ اس کے پوچھنے پر انہوں نے صرف ایک لفظ کہا۔

تھا۔

”پہلے بھی ایک بار ”ساتھ دینے“ کا انجام بھگت تو بچی ہیں آپ؟“ متوازن وہ ہوا رعبے میں وہ انہیں جو یاد دلا رہا تھا وہ انہیں بھولا ہی کب تھا۔

”تمہیں غصہ آجاتا ہے جس بات پر آتا ہے یہ بھی علم ہے۔ مگر اس بات کو کرنے کے لیے نہ جگہ مناسب ہے نہ وقت۔ تم اپنی شادی کا ہر اختیار مجھے دے چکے ہو یا وہ یا نہیں؟“ آنے سے پہلے ہی تو انہوں نے اس سے بات کی تھی۔

”تو ٹھیک ہے“ آپ کی مرضی۔“

اس نے کندھے اچکا کر انہیں مکمل اختیار دے دیا۔ جیسے معمولی بات ہو۔ تھوڑا اختلاف تھا، لیکن خیر۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا نہ خوشی نہ غم۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”میرے بچے! جیتے رہو۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو غم۔“

اس پر بے تحاشا بار آیا تھا انہیں۔ وہ لینے تو پانی آئی تھیں مگر پانی کو بھول کر بھی بھائی کی سیرابی کا انتظام کر لیا تھا۔

”روفا! انسب کو اپنا بیٹا بنالو۔“

امداد غیبی کے مختصر روفا صدیقی کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے چونک کر مڑتے انہوں نے حنا اور انسب کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔

حنانے حرا کا ہاتھ تمام لیا جو ابھی تک اسی جگہ کھڑی تھیں جہاں وہ چھوڑ گئی تھیں۔ روفا صدیقی انسب کو سامنے دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئے تھے۔ چہرہ فٹ سے لکڑا قد، زبان سے چلتی آنکھیں، گندمی رنگت، مضبوطی سے جے قدم۔ ابھی پچھلے سال ہی تو وہ لندن میں اس سے ملے تھے۔ فیضان پہلے ہی اپنے چچا سے ملنے دئی جا چکا تھا۔ ہاں انسب سے ملاقات ضرور ہوئی تھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہو کر آئے تھے۔ یونیورسٹی آف لندن سے، سسٹری کی ڈگری لینے کے بعد

آج کل نہ جانے کیا کر رہا تھا۔

دل غ میں پتی الجھنیں پریشانیاں اور اب۔۔۔ ”تمہا آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ وہ بے یقین سے تھے۔ ایک دم جیسے انہیں اندھیروں سے کھینچ کر باہر نکال لیا گیا تھا۔

”باہر کے لڑکوں کا کوئی اعتبار نہیں۔“ اور یس ان کے اندر منہ پھاڑ کے چلا لیا۔ انہوں نے اندر کی آواز کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”آپ! آپ نے انسب کی مرضی معلوم کر لی۔“

”نواس کی مرضی کمال ہوگی بھلا۔ اسے پڑھائی سے فرصت ہو تو کچھ اور سوچے یا پھر باپ کے ساتھ ابھی بھی تو اسی کا سارا بندوبست کر کے آیا ہے۔ آرڈر لیٹ ہو گیا تو اس بار انہوں نے خود آنے کے بجائے اسے بھیج دیا۔“

ان کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ روفا کو اس کے اچھا ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ جو تھوڑا تہذیب تھا، حرا کے ہاتھ دبانے اور سر ہلانے پر وہ بھی جا رہا تھا۔ انہوں نے چھوٹی ہنسنے کو ہمیشہ تحقیر کرتے بڑی ہنسنے کا مذاق اڑاتے دیکھا اور سنا تھا۔ وہ کبھی ٹوک دیتے کبھی نظر انداز کر دیتے، لیکن ان کے لیے دونوں برابر تھیں۔ کیا ہو ابو ہما کے پاس زیادہ پیسہ تھا۔ فیضان بینک میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ امانت بھائی کا لیدر کا کاروبار تھا تو بڑی ہنسنے بھی اچھا کھاتی پتی تھیں۔ اولاد نیک تھی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا۔

انہوں نے خود بھی تو مفر سے شروع کر کے سب کچھ حاصل کیا تھا۔ جدی بستی رہیں تو تھے نہیں۔ ”ٹھیک ہے آپ! جیسے آپ کی مرضی۔“ انہوں نے کھینچ کر انسب کو سینے سے لگا لیا۔

”وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو یوں بے غیرتوں کی طرح منہ چھپا کے تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہ بھاگتا۔ اللہ نے اسی میں تمہارے لیے بہتری لکھی تھی۔ اگر بعد میں کسی اور سے شادی کر لیتا یا عورتوں

کے پیچھے۔“

بچی سے باتیں کرتے انہیں اس سے حد درجہ حیا آئی تھی لیکن جو کچھ وہ کہہ رہے تھے، گنا ضروری تھا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھے وہ اسے سمجھاتے رہے۔ نہ جانے وہ خود کو کسلی دے رہے تھے یا اسے۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ جیسے بچے کے ہاتھ سے من پسند کھلونا چھین کر کوئی ان چاہا کھلونا پکڑا دیا جائے۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ اسے اس شخص سے شادی نہیں کرنی تھی جسے وہ کل تک طنز و تمسک کا نشانہ بناتی رہی تھی، مگر اس کی تو ساری سوچیں ہی منجمد ہو گئی تھیں۔ ”باہر لوگ جمع ہیں۔ بارگاہ کا پوچھ رہے ہیں۔“ اسے اپنی جگہ جیسے کھڑے دیکھ کر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ غصے کے تیز تھے۔ ان کی بیٹیاں ان سے اتنی فری نہیں تھیں، مگر وہ اس کے جذبات سمجھ سکتے تھے۔ اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

”اس کا کیسے ہو سکتا ہے۔ فیضان اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے یقیناً مذاق کیا ہو گا۔“ سوچتے سوچتے اس نے اچانک کہا۔ آواز کمزور اور لہجہ بے یقین تھا۔

”مذاق۔ بارگاہ نے اسے مذاق۔“ حرا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے میری جان۔“

خوب صورتی اور مہارت سے کیے گئے میک اپ، سنہری عروسی لباس میں فیضان کے لیے پور پور نئی منت، تھوڑی دیر پہلے تک کتنی سرشار تھی، مہندی کی خوشبو اور اس کی سیپیلوں کی ہنسی سے بے مہر ویک دم جیسے دیران ہو گیا تھا۔ حرا نے سب کو باہر نکال دیا۔ صرف تحریم ایک کونے میں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اور منت سوچوں میں گم تھی۔

”میری عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے منت۔“ روفا صدیقی ہوئے سے کہہ کر ان ہی قدموں پر زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک دم ہوش میں آکر وہ تیزی سے ان کی جانب بڑھی۔ اسے زمین پر بیٹھے باپ کے سوا کچھ یاد

نہیں رہا تھا۔

میکا کی انداز میں نکاح نامے پر دستخط کر کے وہ انسب کی ہو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے ایک رذیل شخص سے چھٹکارا ملنے پر خوش ہونا چاہیے یا ایک ان چاہے شخص کے ساتھ پر رونا چاہیے۔ آگے کا سفر نہ جانے کیسے کٹنے والا تھا۔ وہ تو انہی سے تھک گئی تھی۔

پچھو اسے چوم رہی تھیں۔ لپٹا رہی تھیں۔ مبارک بادیں وصول کر رہی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ مگر لال رنگ، مضراری انداز میں اس نے انگلیوں سے مہندی کو کھینچنا شروع کر دیا۔

”دیکھو پریشان ہوتی ہے میری جگتی۔“ عاطف اور روج نے اتنا زور دیا تھا کہ وہ آدھا راضی تو ہو ہی گیا تھا۔ باقی جس جس سے بھی مشورہ کیا تھا انہوں نے بھی مثبت جواب ہی دیا تھا۔ عاطف کو کوئی لالچ بھی نہیں تھا۔ سارا کام بھی خود کروا رہا تھا تو انکار کرنا اسے مشکل لگنے لگا۔ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے گونا اسے بے وقوفی لگی، مگر جگتی نہ جانے کیوں دوسوئوں میں گھری ہوئی تھی۔

”تین سال ہو گئے ہماری شادی کو اور ابھی تک ہم۔۔۔ ہمارا شادی میرے بعد ہوئی تھی۔ دو دو اولادیں لے کر بیٹھی ہے۔“

اولاد نہ ہونا ایک ایسا غم تھا جو اس کے ہر غم پر بھاری تھا۔ ہر خوشی اس ایک غم کو سوچ کر آدھی ہو جاتی اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے نہ باہر جانے کی خوشی تھی، نہ بہتر زندگی نہ کسی اور چیز کی۔ اسے تو صرف ایک ہی دکھ تھا جو ہر چیز پر حاوی ہو گیا تھا۔

”تین سال تو تو نے ایسے کہا جیسے تین کے بجائے تیس سال ہو گئے ہوں۔“ ڈاکٹر کہتے ہیں سب ٹھیک ہے۔ اللہ کی رضا ہوگی تو اولاد بھی ہو جائے گی۔“

اس نے اس کا نرم ہاتھ پکڑ لیا بینک۔ دونوں ساتھ ساتھ ہی تو بیٹھے تھے۔ اس کا سر اس کے کندھے پہ ٹکا

تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس میں انگلیاں پھیرنے لگا۔
 ”زمین کے کاغذ تو میرے ہی نام ہیں۔ بات کرتا
 ہوں رب نواز سے جتنے پیچھے دے اسے ہی ٹھیک ہیں۔
 دکان بھی بیچنے کا کہتا ہوں۔“
 ”فیصل پر پہنچ ہی گیا تھا۔ اگرچہ فیصلہ مشکل تھا، مگر
 آفریز کشش بھی پھر زندگی کو بہتر بنانے کے مواقع زیادہ
 تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے مختلف
 سوچوں میں گھرے ہوئے تھے اس کی ہر سوچ بچوں
 سے شروع ہو کر بچوں پر ختم ہو جاتی، مگر وہ مروتھا اسے
 اور بھی بہت کچھ سوچنا تھا۔ اگر زندگی ایک موقع دے
 رہی تھی تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتا رہتا تو نہیں تھا۔
 پھر کچھ مہینوں بعد ہی وہ سب کچھ بیچ باج لندن کے
 اس گنجان آباد علاقے میں آگئے تھے۔

”امی نے کہا جانے سے پہلے ایک بار آپ سے مل
 لوں؟“ وہ بے حسی بے دلی اور لاتعلقی کی آخری حدوں
 کو چھوتی اسی کمرے میں موجود تھی۔ نکاح کے بعد
 سب کھانا کھانے جا چکے تھے جب وہ اچانک ہی اس کے
 سر پر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”امی نے کہا آتے ہی ننھے کا کے ہوتاں تم کہہ جاؤ
 کہیں گی وہی کرتے رہو گے۔“
 وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا، مگر نہ اس نے سر
 اٹھایا تھا نہ اٹھانے کی خواہش بھی۔ سر تو تب اٹھاتی
 جب دیکھنے کی کوئی خواہش ہوتی، مگر اسے اس سے کوئی
 سروکار نہ تھا۔ ہاں زہریلی سوچیں ضرور ذہن میں جنم
 لے رہی تھیں۔ اس کے پرسکون انداز پر اس کے اندر
 بھانپنے جلنے لگے تھے۔
 ”کیسے آرام سے بات کر رہا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ
 ہو۔“

وہ کرسی سمجھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اسے کس
 طرح اس کے سر تو ہوب دیا گیا تھا۔ کیا وہ اتنی بے کار
 فالتو اور کم رو تھی روتے جانے کاغذاب سے شاید پھر
 ہو گئی تھی۔ اپنی سوچوں میں گم شاید اس کی موجودگی

بھی بھول گئی تھی۔
 اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اسے انگوٹھی پہنائی۔
 ”امی نے دی ہے۔“ وہ ہنسا ہنسا۔
 ”امی نے دی ہو یا تم نے خودی ہو۔ مجھے کوئی سروکار
 نہیں۔“ اس کی خود سری ایک دم عود کر آئی اس نے
 ہاتھ گود میں دھر لیا۔
 اسے کچھ سال پہلے کا مکمل انسب یاد آگیا۔ ذرا ذرا
 سی بات پر گھبرا جانے والا عدم اعتماد کا شکار جسے کئی بار
 اس نے بے وقوف بنایا تھا۔ اس کی نظموں کی پیش
 محسوس کرتے ہوئے بھی اس نے اس کی طرف نہیں
 دیکھا تھا۔ اسے کوئی شوق بھی نہیں تھا اسے ویٹھے کا۔
 وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔
 ”تم ہوتے کون ہو مجھے اس طرح دیکھنے والے۔“
 مگر نہیں کہہ سکی تھی ابھی سارے حقوق خود تفویض
 کیے تھے اس نے اسے دیکھنے کے۔۔۔
 ”انسب بیٹا! تمہارے ابو تم دونوں کو دیکھنا چاہتے
 ہیں۔“ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد حنا کمرے میں داخل
 ہوئی تھیں۔ ”سراپ آپ آج سے لوہاں کر۔“
 ”چھپ چھپو رہے سب ہی چھپ چھپ رہے ہیں۔ ان کی تو
 جیسے مراد پوری ہو گئی ہے۔ میری شادی وہاں نہیں ہوئی
 تو انہیں موقع مل گیا۔“
 یہاں وہاں سب کے لیے نفرت ہی نفرت تھی اس
 کے اندر۔

پچھو سے فون پکڑ کر اس نے خود سلام کر کے اس
 کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بھی سلام کیا تھا۔ جانے
 کیوں کیا تھا۔ خود بھی نہیں جانتی تھی۔
 ”مبارک ہو بیٹا! بس جلدی سے آجاؤ یہاں
 تمہیں پتا ہی نہیں کہ ہم سب کتنے بے قرار ہو رہے
 ہیں۔“ وہ بڑے جوش میں نہ جانے کیا کیا کہہ رہے
 تھے۔
 ”نہیں میرے اربابوں کے خون اور بے عزت ہونے
 کی مبارک باد قبول کر لیں چاہیے مجھے۔“
 ”چھا ہوا اس بلاق کے لیے لڑی دھوڑنے نہیں
 جانا پڑا اور اسے روتا بھی کون بھلا۔“

”جی ابو جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“
 وہ اسے چھپڑ رہے تھے اور وہی بھر کے چھڑ رہا تھا۔
 ”ہاں واقعی! آپ ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ اس دو
 کنگے کے دکان دار کو جو باپ کے ساتھ پکڑوں کی دکان پر
 بیٹھا ہے۔ اسے بھلا مجھ جیسی لڑکی کہاں ملتی۔ میری
 بد قسمتی ہے نا۔“
 اس کی سوچیں خطرناک حد تک زہریلی ہو رہی
 تھیں۔ کبھی خود ہی ترس آتا، کبھی خود کو بد قسمت
 سمجھتی اور کبھی بہت ادنیٰ تھا دینی کس۔
 ”بھابھی! جلدی سے ہمارے گھر کی رونق ہمارے
 پاس بھیج دیں، ہم سے انتظار نہیں ہو رہا اب۔“ اب
 وہ حرا سے مخاطب تھے جو حنا کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی
 تھیں۔

”ہاں ہاں بھائی صاحب! آپ کی امانت ہے۔ بس
 کچھ دن انتظار کر لیں۔ باجی کے ساتھ آجائے گی آپ
 کے پاس۔ پیپر ڈیفیو تو بن چکے پہلے ہی۔“ حرا نے ہنستے
 ہوئے کہا۔
 طوفان اگر جا چکا تھا۔ سب مطمئن تھے خوش تھے
 سوائے اس کے۔ وہ خود کو بہادر سمجھتی تھی۔ اس لیے
 ابھی تک روٹی نہیں کھتی۔
 ”زندگی تو میری برباد ہوئی ہے۔ سب دیسا ہی چل رہا
 ہے۔ کسی کو اس سے کیا تعلق واسطہ۔“
 منقی انداز میں سوچتے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا
 تھا۔

”کیا میرے چار بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی تم مجھ
 سے اسی طرح شرمایا کرو گی۔“ اس کے گالوں کو
 انگلی سے چھوتے اس نے اس کے کان کے پاس کہا
 تھا۔
 آج کل اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ
 خوشی جس کا انتظار وہ چار سالوں سے کر رہے تھے۔
 لندن آنے کے کچھ مہینوں بعد مل ہی گئی تھی۔
 ”کیا ہر لڑکی اس روپ میں اسی قدر خوب صورت

ہو جاتی ہے یا صرف وہ ہو گئی تھی۔“ وہ سوچتا۔ اس پر تو
 نظری نہ تھرتی تھی۔
 لندن آنے کے بعد ایک دو کمروں کا چھوٹا فلیٹ
 انہوں نے مسجد کے قریب ہی کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ
 مسجد جانے لگی تھی اور وہ عاتق کے آفس کے باہر
 کے کام پٹانے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی تعلیم زیادہ نہیں
 تھی۔ صرف ایف اے تک ہی پڑھا تھا، مگر سیکھنے کی
 لگن اور شوق نے اسے سمیز لگائی تھی۔ ان مہینوں
 میں اس کی شخصیت میں بہت سی ظاہری تبدیلیاں آئی
 تھیں۔ جو عاتق کے بقول ضروری تھیں۔ شلوار
 قمیص کے بجائے جینز پہننے لگا تھا۔ انگلیش کی شبد تھی۔
 مگر اب بہت اچھے طریقے سے بول لیتا تھا۔
 ”یہ سب تمہاری دج سے ہے۔ میری قسمت کا
 چمکتا ستارہ تم ہی تو ہو۔“ اس کے ہم ہاتھوں پہ گرفت
 کچھ اور مضبوط ہو گئی تھی۔

”آپ اب جو بھی کر لیں مجھے کہیں نہیں جانا“ آپ
 کی عزت بیچ گئی سب کے سامنے، مگر اب۔“
 خود سری اور پد تیزی کے ساتھ بولتی انہیں وہ کوئی اور
 ہی منت لگی تھی۔
 انسب اسی دن واپس چلا گیا تھا۔ حنا کو اپنے سرسالی
 عزیزوں کے پاس جانا تھا۔ اس لیے وہ راولپنڈی چلی گئی
 تھیں۔ ان کی واپسی میں ابھی پندرہ دن تھے۔ وہ اسے
 سمجھانے بیٹھی تھیں اور وہ جو اتنے دن سے خاموش
 تھی۔ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ وہ حیران تھیں۔ اتنے
 دن وہ اس کی کیفیات سے کس قدر بے خبر رہی تھیں۔
 ”کیوں نہیں جانا تمہیں۔“ ٹھنڈے ٹھارے لہجے میں
 دریافت کیا گیا۔
 وہ چپ کھڑی فرش کریدتی رہی۔ ”اس لیے کہ وہ
 لوگ مجھے پسند نہیں ہیں۔ میں اس شخص کے ساتھ
 ساری زندگی نہیں گزار سکتی جسے میں ناپسند کرتی
 ہوں۔“
 ”کس دھڑائی اور بے شری سے تم اپنی پسند ناپسند

کی بات کر رہی ہو۔ جو تمہیں پسند تھا۔ اس نے تمہیں دھکا دیا اور جو تمہیں سرکا تاج بنا کر لے جا رہا ہے اسے تم پسند کرتی ہو۔“

ان کے انداز پر وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اتنے سخت الفاظ کی اسے توقع نہیں تھی۔

”کیا کچھ نہیں کیا اس دن سے تمہاری پیچھو نے تمہارے لیے“ ایک سے بڑھ کر ایک کپڑوں کی شانیں گت اتنے خوب صورت چولری سیٹ جہاں تمہارا رکھتی ہو وہ وہاں ہاتھ رکھتی ہیں۔ تمہارے خرقے برداشت کر رہی ہیں، کیسے چاؤ سے بھائی جان ہر روز تمہیں فون کرتے ہیں۔ چاہے تم بات کرو یا نہ کرو۔ ان سب ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اس وقت ہمارا ساتھ دیا جب ہمیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اور تم پھر بھی...“

بولتے بولتے تھک کر وہ رو پائی ہو گئی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں، دقیقہ کیفیت کے زیر اثر ہے۔ سامنے کا کچھ نہ کچھ تو اثر ہو گا اس پر، مگر وہ تو بالکل ہی پشیمانی سے اتر رہی تھی یہ سن کر چپ کھڑی رہی۔

”وہ واہیات“ بے غیرت شخص جسے تم اپنی پسند کرتی ہو وہیں سے انکار کرنے کے بجائے یہاں تک آیا، ہمارا تماشا بنائے۔ تمہیں تمہارے منہ پر دھکا کرنا پسند کر کے چلا گیا اور تم ابھی بھی...“ بولتے بولتے ان کا سانس چڑھنے لگا۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں اس شخص پر۔ آپ ہی کا پیٹے کیا ہوا رشتہ تھا، مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔“ اس نے ان کی بات کی سختی سے تردید کر دی۔

”اگر لعنت بھیج ہی چکی ہو تو اللہ کی رضا سمجھ کر اس رشتے کو بھی قبول کر لو کہ یہی تمہاری قسمت میں لکھا تھا۔“

انہوں نے اس کا سر پکڑ کر چہرہ اوپر کر دیا۔ خود اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس دن سے اس کے دل دباغ میں ایک کشش جاری تھی۔ بھی پیچھو اپنی محسنہ لگتیں۔ کبھی مندی پن عود کر آتا تو مکلا لگنے لگتیں۔

وہ یہ بھی مانتی تھی کہ اس دن سے کس طرح وہ اس کے لاڈ اٹھارہی تھیں اور وہ بد تمیزی کرتی رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ کبھی شعلہ، کبھی جہنم کا سامراج لیے ہوئے غصہ آتا تو عجیب ہو جاتی اور سوچتی تو اپنی ہی باتوں پر دکھ ہوتا۔

”مگر وہ نہیں آیا تھا، بھاگ گیا تھا تو کیا ضروری تھا کہ آپ مجھے کسی بھی ارے غیرے، تنہو خیرے کے ساتھ بیاہ دیتیں۔ یہ کوئی بادشاہ، شہزادی کی کمائی نہیں کہ صبح جو سب سے پہلے محل کے دروازے پر آئے گا اسی سے شہزادی کی شادی کر دی جائے گی۔ کیا بھی پہلے کسی کی بارات واپس نہیں گئی یا ایسا انوکھا واقعہ کسی اور کے ساتھ نہیں ہوا۔“ اب وہ سننے لگی تھی۔

کئی دنوں کے آنسو تھے جو چاکا چاکا باہر نکل کر قطار در قطار گر رہے تھے۔ وہ خوب صورت تھی اور اسے اپنی خوب صورت کا احساس بھی تھا۔ پھر ہمیشہ سے فیضان کو ہی اس حوالے سے سوچا تھا۔ ایک دم یہ ساری کلیا پلٹ اسے زور دین لگی۔ اتنے دنوں کا بھر اغبار نکل رہا تھا۔

”وہ کوئی ایریا غیو نہیں تمہاری پیچھو کا بیٹا اور بڑھا لکھا قابل شخص ہے اور فیضان سے زیادہ ہی چنڈن سم بھی۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہوسا دیا۔

”بڑھا لکھا قابل شخص دکان پر ہی بیٹھے گا۔“ جل کر کہہ بھی دیا۔

”ان کا اپنا کاروبار ہے۔ کیا برائی ہے اس میں۔ بیٹا! اپنے محسنوں سے محبت کرتے ہیں۔ متفرق نہیں ہوتے۔“

وہ بھی تو خود کو یہی سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔

”اور اپنے پیارے سامنے اس طرح کی کوئی بات نہ کرنا“ وہ پہلے ہی بہت پریشان رہے ہیں۔ پھر تم ان کے غصے کو بھی جانتی ہو۔“

ان سے بات کر کے دل کی بے چینی کچھ کم ہوئی تھی، جب تک دوبارہ یہی کیفیت نہ ہوتی تب تک تو سکون ہی تھا۔ ان سے کچھ بھی کہے بغیر وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔ نہ جانے آنکھوں سے آنسو کب بہنا شروع

ہوئے۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

”اب بس بھی کرو اور کتنا خود کو پریشان کر دیتی۔ کتنی اذیت دوں۔“ تحریم اس کے آنسو پوچھتی اس کے سامنے کھڑی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”کیا کروں۔ میرے اندر کی کشش ہی ختم نہیں ہوتی۔ خود کے رویے جانے کا احساس اس قدر اذیت ناک ہے کہ... پیچھو میری محسن ہیں مگر۔۔۔ ان سب کیا صرف وہی تھا میرے لیے اس دنیا میں۔“

وہ نہ جانے کس سے شکوہ کر رہی تھی اللہ سے اپنی بہن سے یا خود سے۔

”مجھنے کی کوشش کرو، پیچھو کو اگر اپنی محسنہ سمجھتی ہو تو ان سب بھائی بھی تمہارے محسن ہیں۔ اتنے ڈشنگ ویل منہ دو، اچھی تعلیم مان کو بھلا کس چیز کی کمی تھی، مگر انہوں نے صرف تمہارے لیے۔ اپنی ماں کی بات کی لاج رکھی اور اتنے دن سے تمہارا رویہ کیسا ہے پیچھو کے ساتھ۔ وہ شایگ کے لیے کتنی رہیں اور تم سر درد کا بہانہ کر کے کمرے میں بند ہو گئیں۔ دوسروں کی نظر سے نہیں ان کو خود کی نظر سے دیکھو۔ وہ کتنی اچھی ہیں، تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔“

اچھی بہنیں خدا کی نعمت ہوتی ہیں اس کی بہن بھی اس کے لیے نعمت تھی۔ دونوں کی دوستی اتنی تھی کہ کبھی کوئی اور دوست بنانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ منت غصے کی کچھ تیز اور جذباتی تھی تو تحریم اس کے جذبات کو قابو کرنا جانتی تھی۔

”پلیز خود کو بدلو، تاکہ پیچھو کو با ان سب بھائی کو کبھی اپنے فیصلے پر دکھ نہ ہو۔ تم بہت اچھی ہو، بس ذرا سی بے وقوف ہو۔“ تحریم نے اپنی لمبی انگلیوں کو ذرا سے اشارے کے لیے گول کیا۔

”اور ان سب بھائی اگر ماسٹر ڈی ڈگری کے باوجود اپنے ابا کے ساتھ دکان پر جاتے ہیں تو یہ ان کا کیئر کا ایک انداز ہے۔ چاہے بھی ہو سکتا ہے، کرنے کا ارادہ ہو۔ اگر نہ ہوا تو تم بنو لینا“ آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔

ویسے بھی کوئی بھی کاروبار ہو بزنس تو بزنس ہی ہے اب امانت پیچھا بھی تو لیدر کا بزنس کرتے ہیں اور نعمان بھائی اور فیضان بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔

”نام نہ لو اس کیلئے گا۔“ اس نے نفرت و تحارت سے سے کہا۔

”میں تو سمجھی اس فضول شخص کی محبت میں یہ سب کچھ کر رہی ہو۔ اگر محبت نہیں تو پھر کاہے کی پریشانی۔ اپنے بندے سے محبت کرنا، قسم سے اتنا ڈشنگ ہے۔“

آنکھ دبا کر کہنے پر اس نے اس پر نکیہ پھینک دیا۔

”مروت“

مگر کچھ دن کے بعد پھر سے اس پر وہی کیفیت طاری ہونے لگی۔

”اگر تمہارے ارادے کی خبر تمہارے لبا کو ہو گئی تو وہ ہم سب کی۔“ حرا ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔

روڈ صدیقی سامنے کھڑے کینہ توڑ نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ قدم بڑھاتے وہ منت کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

”کیا جاہتی ہو تم؟“ وہ عین اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ مگر اس میں ان کی آنکھوں میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ بہت دیر تک وہ کچھ بھی نہیں بول سکی۔

”میں لندن نہیں جانا چاہتی۔“ اس نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا تھا۔

”ٹھیک ہے حرا، اگر یہ لندن نہیں جانا چاہتی تو اسے کہیں اپنا ٹھکانا نہیں اور کرے، کیونکہ اب یہ اس گھر میں بھی نہیں رہ سکتی۔“

حکم دے کر وہ رے نہیں تھے۔ وہ ان دنوں کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن چکے تھے۔ مزید کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے سامنے وہ جملہ بھی نہ جانے کیسے منہ سے نکل گیا تھا اور اب وہیں کھڑی آنسو بہاتے وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔



ان گزرے سالوں میں جہاں حسین نے اپنی محنت

لگن، تجربے اور قلیل سرمایے کو کام میں لاتے ہوئے لیدر کا بزنس سیٹ کر لیا تھا وہیں اس کا گھر دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے وجود سے پر رونق ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی محبت مثالی تھی۔ وہ ابھی بھی اس کے اظہار محبت اور التفات پر بھولی موبی بن جاتی۔ فریال، رخ اور انسب زندگی کو کتنی خوب صورت تھی۔

”ساری عمر گزر گئی، ابھی تک تمہاری طرف سے اظہار محبت کا انتظار ختم نہ ہوا۔“ وہ اسے جگانے آئی تھی ہنس بٹھک کر اسے قریب کر لیا۔

”جناب آفس سے درہور ہی ہے۔ بچے کب کے اسکول جانچے ہیں۔“ اس کی گرفت سے نکل کر وہ پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”آج لیٹ جانا ہے آفس۔“ کسلندی سے کہتا وہ پھر سے بیڈ پر گر گیا۔ ابھی اس کا اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”یار! یہ ہی کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“ وہ پھر سے اسے چھیننے لگا۔

”کیا ابھی بھی اس کی ضرورت ہے۔“

”ضرورت تو ہمیشہ رہتی ہے اظہار کی، مگر تم بھی ایک زائد خشک ہو۔“ اس نے اس طرح منہ مچھا کر کہا کہ اس کا لفظی قہقہہ بے اختیار ہی بلند ہوا۔

”شکر ہے تمہاری ہنسی تو سننے کو لی ورنہ تو ہنسنے کے نام پر ایک لکیری ہونٹوں پر پہنچ جایا کرتی تھی۔“ وہ پھر سے شرم سے لگا۔

”اب اٹھ جاؤ، آج ہمارا امانت بھائی اور بچوں کو ریسیور کرنے لایز پورٹ بھی جانا ہے آپ کو۔“ اس کو یاد دلا کر اس کا دھیان مکمل طور پر موڑ دیا۔

”ہاں یا بس۔ تم چلو گی انہیں لینے۔“ وہ اس سے پوچھنے لگا ”آخر کو بہن تھی اس کی وہ بھی چھوٹی۔“

”نہیں! آپ لے آئیں، تب تک میں کھانا تیار کر لوں گی، پھر کچھ دن تک تو وہ ہمارے ہاں ہی ٹھہریں گی۔ فلیٹ میں جن چیزوں کی کمی ہوگی وہ خود دیکھ لیں گے۔“

ہمارا کو فیملی سمیٹ پاکستان سے یہاں بلانے میں اسی کا ہاتھ تھا۔ لیدر کا بزنس روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔ ایسے میں نئے درگزر کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، ہمارا اول روز سے اس گھر میں تنگ تھی۔ امانت اللہ پر دھا لکھا شخص تھا، مگر نہ جانے باب پر تنگ کر کام کیوں نہیں کرتا تھا، آئے دن ہمارا پریشانیاں اسے بھی پریشان کرتی رہتی تھیں۔ بچوں کے ساتھ نے اسے خود ترس اور زور ورج بھی بنا دیا تھا۔ وہ جب فون کرتی ہمارے لگتی۔ اس نے حسین سے بات کی تھی اور حسین بھلا اس کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔ کئی مہینوں کی کوشش کے بعد وہ انہیں اپنی کمپنی کا ایپلائی بنا کر لانے میں کامیاب ہوئی گیا تھا۔

اس کے اپنے کوئی قریبی رشتہ دار تھے نہیں بس یہ ہی سسرالی عزیز تھے جو اسے اپنی بیوی کی طرح بہت عزیز تھے۔ ویسے وہ نیکی کو پھیلائے کا قائل تھا، بہت پہلے اگر عاطف نے اس کے ساتھ نیکی کی تھی اور بغیر کسی صلے کے اسے یہاں سیٹ کروایا تھا تو وہ بھی کسی اور کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہتا تھا اور یہیں سے اس کی بد قسمتی کا آغاز ہوا تھا۔

”کبھی اتنا برا سفر نہیں گزرا جتنا اب گزرا ہے۔“ لایز پورٹ پر لینے والا انسب کئی سال پہلے دیکھے گئے انسب سے کتنا مختلف تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ وہیں کندھے جھک کر لافعلی بھی ہو گئی تھی۔ پچھو سفر کی طوالت، دھند اور نہ جانے کن باتوں میں ابھی ہوئی تھیں اور وہ گاڑی کے ایک کونے میں بیٹھی باہر کی روشنیوں میں نہ جانے کیا دھونڈنے کی کوشش

کر رہی تھی۔ کبھی اسے لندن گھومنے کا کتنا شوق تھا اور اب باہر دوڑتے بھاگتے، ملجے اندھیرے کتنے عجیب لگ رہے تھے۔ سچ ہے کہ ساری رونق، ساری خوب صورتی آپ کے اندر ہوئی ہے۔

”فریال اور رخ تو آئی ہوں گی اور لقمان، حسن

بچے۔۔۔؟“

”ہاں سب ہی آئے تھے، پھر آپ کا انتظار کر کے لقمان اور حسن بھائی تو پہلے گئے، ہاں دونوں آپاں ادھر ہی ہیں۔“ اس کی بھاری گھبر آواز گاڑی کی خاموشی میں گونج رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اس کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔

سفر نے واقعی تھکا ڈالا تھا۔ پچھو کے شکوے بجا تھے۔ تنے ہوئے اعصاب آرام مانگ رہے تھے۔ اس نے سر سیٹ کی پشت سے نکال دیا اس کی چوٹی پشت پر بیٹے دھیالی میں نظریں جمائے وہ اس کے اعتماد پر حیران تھی۔

”اتنا انتظار کروایا تو بس۔ اب تو انتہا ہو گئی۔“ فریال، منت سے ملتے ہوئے اس سے معصوم سا شکوہ کر رہی تھی۔

”ہمارا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ سوئے ہوئے بچوں کو چھوڑ کر لایز پورٹ پہنچ جائیں۔ بس ابو نے انکار کر دیا کہ اگر کوئی دیا تو ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ وہ کسی کی چوکیداری نہیں کر سکتے اس وقت۔“ رخ تپا اسے لپٹائے لپٹائے ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔

”بھئی کوئی ہمیں بھی تو ہماری بیٹی سے ملنے دے۔“ طارق بھی کمرے سے نکل کر وہاں آن کھڑے ہوئے۔ گھر میں ہونے والے شور نے انہیں جگا دیا تھا۔ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ڈھیروں دھانیں دے ڈالیں۔

”جیتتی رہو، خوش رہو، آباد رہو، ہمارے گھر کی رونق بنی رہو۔“ سارے رستے جس بے زاری اور لافعلی کا مظاہرہ اس نے پچھو سے کیا تھا اس پر اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ حالانکہ گھر سے ارادہ کیا تھا کہ وہ اپنی سوچوں کو صحیح رخ دینے کی کوشش کرے گی، مگر

گھوم پھر کے پھر وہی چیزیں داغ میں آجائیں اور اس کا داغ اٹ جائے۔

”بیٹہ جاؤ منت۔“ پچھو نے ہی آگے بڑھ کر اسے صوفے پر بٹھایا تھا۔

”ہم دونوں کے سونے کا انتظام کرو تم دونوں۔ ایسا برا حال ہے کہ بیان سے باہر ہے۔“

”حتا بیگم، فریال اور رخ سے مخاطب تھیں۔ منت کے ساتھ صوفے پر بیٹھے انہوں نے پاؤں اوپر کر کے رکھ لیے۔

”بیگم جہاز میں سفر کر کے آئی ہیں کہ گدھا گاڑی میں۔“ طارق کا چٹکلا سن کر سب ہنسنے لگے۔ ”گدھا گاڑی ہی سمجھ لیں۔ اتنی دیر میں تو اگر گدھا گاڑی میں بھی بیٹھ کر آتے تو جہاز سے پہلے پہنچ جاتے۔“

”انسب! تم بھی بیٹھ جاؤ، اتنا سوہو ہو کر ہاتھ باندھے کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں۔“ طارق حسین نے انسب کے مسلسل ایک جگہ کھڑے ہونے کو مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔ جس پر فریال اور رخ آپی کا مجموعی قہقہہ اسے سٹپلانے پر مجبور کر گیا تھا۔

”شروع ہو گئے ابو کے شوٹے۔“ اندر کی جانب جاتی رخ نے انسب کو دھکا دے کر اس کے برابر بٹھا دیا۔ سب بہن، بھائی شاید ایک دوسرے سے بہت فری تھے۔

”کچھ کھاؤ گی، بھوک تو نہیں لگی تمہیں۔“ حنا کے پوچھنے پر اس نے سر نیچی میں ہلا دیا تھا۔ خود کو ”کافڈنٹ“ سمجھنے والی منت تھوڑی نزو تھی۔ وہ اس کے ساتھ جڑ کے بیٹھا تھا۔ فریال کے دھکے پر ویسے بھی وہ بمشکل سنبھلا تھا۔ پھر صوفے پر جگہ ہی تنگ تھی۔ ایک طرف پچھو پھیل کر بیٹھی تھیں تو ایک طرف حنا۔

”ای منت کا ڈریس اس کے واش روم میں لٹکا دیا ہے اور آپ کا ڈریس بھی، بس انھیں اور جا کر ریٹ کر س، باقی سب منج۔ آؤ منت! میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دیتی ہوں۔“ فریال نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”چھ سال پہلے دیکھی ہوئی فریال ابھی بھی ویسی ہی تھی۔ دو بچوں کے باوجود نازک اندام سی اپنی کزن اسے بہت بھائی تھی۔

”ابھی منت کو ہمارے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں لے جاؤ، میں بھی آج اس کے ساتھ سوؤں گی، پر رات رات کمرے پھر کل۔“ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا جسے سمجھتے اس نے سر ہلا دیا۔

”آج تو تنہی ہوئی اتنی ہے، کل ذرا اچھی طرح تیار ہوگی تو رخصت کر دیں گے اس کے کمرے میں۔“ ان دونوں کے جانے کے بعد انہوں نے آہستگی سے طارق صدیقی سے کہا تھا، جس کے جواب میں انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔

کچھ دیر موبائل پر کھیلنے کے بعد وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ زندگی میں اچانک آنے والا انقلاب اس پر اثر کر سکا تھا یا نہیں لیکن بہت کچھ بدل ضرور گیا تھا۔ بلو جینز اور بلیک لی شرٹ میں اس کے کسرتی بازو نمائیاں ہو رہے تھے گھڑی اور موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھتے انارڈی میں سے کپڑے نکالتے شاور لیتے، سارے کاموں کے دوران اس کا وہیانا عجیب طریقے سے بنا ہوا تھا۔ اس دن ساری چیزیں کو سنبھالنے کے لیے جو کچھ اس کی ماں نے کیا تھا، انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، مگر اس کے ذہن و دل میں نہ جانے کیسے عجیب و غریب خیالات آتے رہے تھے۔

صبح اور فریال کی طرح اس نے بھی اپنی شادی کے سارے اختیارات ماں باپ کو دے دیے تھے۔ مگر بیڈ پر بیٹھ اس نے لیپ ٹاپ کھول لیا۔ نکاح کی تصویریں جو کچھ دن پہلے امی نے سینڈ کی تھیں اس کے سامنے تھیں۔

”کیا وہ اسے نہیں سوچتی ہوگی بچپن کی منگنی اوس۔“ اپنی کھینی سوچ پر لعنت بھیجتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ ساری سوچوں کو جھٹک کر خود کو ریٹیکس کرنے کی کوشش کی، ابھی اسے اور بہت کچھ سوچنا تھا۔



فیضی کے ساتھ میری کوئی رقابت نہیں تھی۔ نہ

ہمارا اسکول ایک تھا نہ گھر پاس پاس تھے اور نہ ہی ہمارے دیکھیاں ایک جیسی تھیں، مگر اس نے میری ایک کمزوری کو میرے لیے عذاب بنادیا تھا۔ میرے خیر خیر کر بولنے کا مذاق بناتے، مجھے چھوڑتے وہ ہر حد پار کر جاتا، مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ صرف اس ایک بات کی وجہ سے نفرت کچھ عجیب لگتا ہے، مگر اس کی صرف اس بات سے نہیں ہس کے ان سارے کڑوتوں کی بدولت جو گا بے بہ گاہے وہ مجھے بچا دکھانے کے لیے کرتا رہتا تھا۔

پہلے پہل میرا خیال تھا کہ اس کے آنے سے مجھے ایک دوست مل جائے گا۔ میں اگلو تاپا تھا اور وہ میرا خالد زاد، مگر وہ بھی میرا دوست بن سکا نہ بھائی۔ جس طرح اس کے والدین بھی میرے والدین کے ہمدرد اور بی خواہ نہ بن سکے، میں اس سے کسی چیز میں پیچھے نہ تھا۔ بہترین اسٹوڈنٹ، اچھی شکل و صورت کا مالک، مگر میرا شرمیلان ضرور ایسا تھا جو اس میں نہ تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتا تھا۔

ہمارے گھر میں ان کا آنا جانا تھا۔ میں اس کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ میری نکت، تھوڑی سی بدولت تقریباً ختم ہو چکی تھی اور ڈاکٹر کے خیال میں ری سی کسٹری آنے والے سالوں میں پوری ہو جاتی، مگر اس کی پیچیز جھاڑ اور مذاق نے مجھے احساس کسری میں مبتلا کر دیا تھا۔

وقت تھوڑا اور آگے گزرا، ہم تھوڑے بڑے ہوئے، میری اٹھان اچھی تھی۔ قدر گنت، ہر لحاظ سے میں اس سے بہتر تھا۔ امانت اٹھل کارنگ، مگر اساتوا تھا، اس لیے ان کی اولادیں بھی ایسی ہی تھیں، مگر میری ساری خوبیوں پر میری ایک خامی حاوی ہو گئی تھی۔ وہ مجھے چڑاتا، مذاق اڑاتا، شرارتیں کر کے میرا نام لگا تا اور میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہتا۔

ایک بار خود کرنے پر اس نے میرا نام لگا کر مجھے

خوب ڈانٹ پڑوائی تھی۔ اسی طرح کے اور بہت سے واقعات میرے حافظہ میں ابھی تک محفوظ ہیں۔

نیا نیا لڑکھن تھا۔ سب ہمارے گھر اکٹھے ہوئے تھے۔ لیونگ روم میں ایک طرف ہمارا آئی اور ای باتیں کر رہی تھیں اور ایک طرف ہم بچے بیٹھے تھے۔ میں کھیل میں شامل نہیں تھا۔ دونوں ہمیشہ راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم سب کا وہیانا ان کی طرف نہیں۔

”میں تو اپنے نسب کے لیے منت کو مانگ لوں گی“ مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ بہت پہلے سے سوچ رکھا ہے میں نے۔“

ای کی بات سن کر میرے اندر کچھ ہوا تھا۔ میں وہ مجھے اچھی لگتی تھی، مگر وہ بری کس کو لگ سکتی تھی؟ یقیناً کسی کو بھی نہیں، میرے دل میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ نئی نئی جوانی اور نیا ناس کا خیال۔ میں کتنے دن تک اس کے خیالوں میں کھویا رہا تھا، لیکن ٹھیک ایک ہفتے بعد آئی نے مٹھائی بھجوائی تھی کہ فضاں کے لیے انہوں نے منت کو مانگ لیا ہے جہاں مجھے ایک دھچکا لگا تھا وہیں امی بھی منہ کھولے کتنی دیر مٹھائی کا ڈبا پکڑے کھڑی رہی تھیں۔

فیضان یوں خوش تھا جیسے اس سے پہلے کسی خوشی دیکھی ہی نہ ہو، لیکن یہ خوشی اس لیے تھی کہ اس نے میرا رشتہ وہاں طے نہیں ہوئے دیا تھا۔ اس کے جانے پر اس کی کینکلی سے مجھے کچھ اور بھی نفرت ہو گئی تھی۔

اس کی منگنی کے بعد لڑکھن اور جوانی کا وہ بخار بھی اتر گیا تھا۔ پھر اس کے والدین نے جو کیا تھا اس کے بعد ان سب سے میری نفرت و بچہ ہو گئی تھی۔



لندن آنے کے بعد ہمارا امانت اور بچوں کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ ظاہری شخصیت کی تبدیلیاں اس قدر ٹھنڈا کرنے والی تھیں کہ اگر مالی والا گاؤں کا کوئی شخص انہیں دیکھ لیتا تو بچانے سے انکار کر دیتا۔ سب سے بڑی تبدیلی امانت علی کی سوچ میں آئی تھی اور باقی تبدیلیاں اسی کی بدولت تھیں۔ اس نے ہمارا

بچوں میں آنے والی تبدیلیوں کو نظر انداز کیا تھا یا وہ خود ایسا ہی چاہتا تھا۔

ہمارا بڑی چادر کی جگہ دوپٹا، پھر دوپٹے کی جگہ گلے میں پہننے والا اسکارف اور پھر گلے میں پہننے والے اسکارف کی جگہ صرف الماری ہی رہ گئی تھی۔ شلوار قمیص کی جگہ جینز نے لی تھی اور بعد میں یہی جینز اسکن ٹائٹ میں تبدیل ہوئی تھی۔

اب یہ اور نقصان بڑے تھے۔ انہوں نے بھی ماں باپ کی طرح کھلے ہاتھوں اور کھلے دل سے ان تبدیلیوں کا استقبال کیا تھا اور فیضان بھی انہی کے پیچھے پیچھے تھا۔ دو تین سال کے اندر اندر ہی ان کا لب و لہجہ برعکس ہو گیا تھا۔ اردو کو انہوں نے داغ کے ایسے حصے میں ڈال دیا تھا جہاں وہ ایک ناکارہ رڈی شے کی طرح اپنی بے وقعتی پر ماتم کیاں رہتی۔

حسین کی کمپنی ”حسینیز“ کی طرف سے ملنے والے پونڈ اسٹرنگ نے ان کے دل ہی نہیں دل بھی پھیر دیے تھے۔

جہاں تک ان تبدیلیوں کا تعلق تھا اگر وہ صرف ان کی ذات اور گھر تک محدود رہتیں تو ٹھیک تھا، مگر ان کا دائرہ کار حنا کے گھر تک پھیل گیا تھا۔ ان کے کپڑوں، بولنے چالنے پر تنقید کی جاتی، طرح طرح کے مشورے دیے جاتے، ان کا مذاق اڑایا جاتا۔

”ایا! آپ کے ہاں آکر تو لگتا ہی نہیں کہ ہم لندن میں بیٹھے ہیں یا پاکستان میں، وہی پاکستان والا حوالہ۔“ نہ جانے یہ طعنے یا تعریف، مگر بار بار سننے کو ضرور ملا کرتی۔

”ایا! کچھ تبدیلی لائیں اپنی سوچ میں۔ مجھے تو لگتا ہے وہی گھبرات میں بیٹھی ہیں آپ۔ کتنے سال ہو گئے مگر آپ نہ بدلیں بلکہ بچوں کو بھی ویسا ہی بتایا اپنے جیسا۔“ ماں نے اپنے سٹیکنگ کے بالوں میں ہاتھ پھیرا، ایک تنقیدی نظر فریال اور سخی شلوار قمیص پر ڈالی اور آکر کڑھوٹے پر بیٹھ کر بہن کے سر پر لیے

ہوا ہو گئی تھی۔

سب کے بیڈ روم اوپر تھے۔ بچے دھب دھب کرتے میڈرھیاں چڑھتے، بڑی مشکل سے ان کو نیچے لانا پڑتا۔ سچان اور ریان اس کے بیٹے تھے، جبکہ پری اور ڈائم رخ کے۔

”بیٹھ جاؤ تم، بچوں کو رخ دیکھ لے گی۔“ فریال
چائے ان کے سامنے رکھ کر ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔
”بیگ کھول کر دیکھ لینا، کچھ شاپنگ میں نے ادھر
سے ہی کی تھی۔ منت کے لیے کچھ زیور جو نہیں پہلے
بھی بتایا تھا اور کچھ کپڑے، اس کی الماری میں سیٹ
کردو اور ہاں ایک بھاری کام والا جوڑا ہے، وہ نکال کر
الگ رکھ لینا۔“

حنا بیگم چائے پیتے پیتے اسے ہدایات بھی دیتی
جاری تھیں۔ اکلوتا بیٹا اور اس کی شادی کے ارمان ان
کے دل میں کس طرح ٹھانٹھیں مار رہے تھے، کوئی ان
سے پوچھتا۔

”تپ بے فکر ہو جائیں، میں دیکھ لوں گی۔“ فریال نے انہیں تسلی دے کر فزہ داری اٹھالی تھی۔

”حسن اور لقمان تو آئیں گے، آج شام اچھا سا کھانا تیار کر لیتا ہوں دو دنوں بیٹیں مل کے اور منت کو بھی تیار کر دیتا۔“

فریال سرہلاتی سب سن رہی تھی۔
 ”ہم، آئی اور فیضان نے جو کیا جھلا، ایسے بھی کرتا
 ہے کوئی اپنے سگے رشتہ داروں کے ساتھ، غیر عیوں تو
 اور بت ہے۔“ بہت دنوں سے ذہن دل میں کھٹکنے
 والی بات آخر اس نے ماں سے کہہ ہی ڈالی تھی۔

”بس بیٹا زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ تفصیلات سے بتا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بخار ایک نہ دو پورے چار دن لگا کر ختم ہوا تھا۔
فیال کے شوہر ڈاکٹر تھے۔ دو ابھی انہوں نے ہی دی
تھی۔ سواب بہتر تھی۔ پردیس کی بیماری نے اسے زود
رج بنا دیا تھا۔ سب آئے، اس کے پاس بیٹھے، ادھر
ادھر کی باتیں کرتے اس کا دل بسلانے کی کوشش کی

ان کے بچے کمر میں اردو بولتے تھے۔ اسکو لنگ تو انگلش ہی میں تھی، مگر وہ خود اس بات پر سختی سے کار بند تھیں کہ بچوں کی تربیت کی ذمہ داری کسی اور جگہ پر اگر ساری کی ساری ماں باپ کے کندھوں پر آجانی ہے۔ کئی سال اس جگہ پر رہنے ان کی سوچ بڑی گہری ہوئی تھی۔

سب سے زیادہ تنقید اور مذاق کا نشانہ انسب کو بنایا جاتا، قدرتی طور پر اس کی زبان میں ناعسوس کی جگہ دالی لگت تھی، جو تھراپی سے دور ہو چکی تھی، مگر اس کے اعتقاد میں کسی اسی کی بدولت تھی۔ اسیہ فیضان اور لقمیان اس کا مذاق اڑاتے انک ایک کربات کرتے اس کی نفل اتارتے اسے چڑایا جاتا۔

ہماچوں کے ساتھ حنا کی طرف آئی تھیں اور اس کا ان کو بلانا غضب ہو گیا تھا۔ فیضان پور ہو رہا تھا اور اسے اپنی بورت دور کرنے کا ذریعہ مل گیا تھا۔
”اے اے اے اے اے اے اے“

اب یہ اس کے ساتھ بیٹنے لگی۔ انب کا چہرہ گرم ہو کر تپنے لگا۔ اب وہ زمین کو گھور رہا تھا۔ اس کی خود اعتمادی

فحسّی اس کے پورے وجود میں بچے گاڑے ہوئے تھے۔ ستریا کا کمرے کا لٹیا ہوا اجازتہ ایک بار پھر سے لیا جانے لگا تھا۔ صاف ستھرا عوادار روشن کمرہ بیڈ اور دو سنگل صوفوں اور ایک چھوٹی میز سے آراستہ۔ بڑی شیشوں والی کھڑکی جس سے باہر جھانکنے پر ہر ابھارا لان نظر آتا مگر دل پہ یہ جھوٹا خود قسم کا نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اپنی خاموش طبع تو ہرگز نہیں تھی جتنی یہاں آکر ہو گئی تھی۔ تحریک سے بات کر کے دل کو سکون ملا تھا۔

”لگتا ہے کوئی مسئلہ ہے، آواز نہیں آرہی۔ کلاٹ
 کر دوبارہ کال ملاؤ۔“ ماما کی آواز سننے ہی اس نے فون
 بند کر دیا۔

”قلیمہ کا دل ان ہی مقرر کر لیتے۔“ یہ سن کر شوہر نالدار تھے۔ اسے سامنے بٹھا کر نہ جانے سب کون سی باتوں میں مصروف تھے۔ گولڈن اور ریڈ بھاری کام والا ڈریس پہنچھونے نہ جانے کب خرید اٹھا۔ شاید یہ ہی جب وہ ان سے مکمل اظہارِ اشقی کر کے سوگ منانے میں مصروف تھی یا کسی اور وقت، مہرِ خال تھا بہت خوب صورت، برقع اور فریال نے اس کا میک اپ کرنے کی بھی کوشش کی تھی، مگر میک اپ کے نام پر صرف ایک لب اسٹک ہی لگوائی تھی اس نے۔ وہ بھی اگر تحریم کی طرف سے تازہ تازہ ڈوز نہ ملی ہوتی تو شاید ”یہ“ کپڑے پہننے سے بھی انکار کر دیتی۔ اب بابا یار سے تو ناراض تھی ہی، تحریم سے ناراض ہونا نہیں چاہتے۔

”من! اگر تم نے کوئی بے وقوفی کی تو مجھ سے دوبارہ بات کرنے کی ضرورت نہیں! اب تو کچھ بیچور ہو جاؤ۔“ وہ فون پر کیا کچھ بولتی رہی تھی اس کا بس نہ چلتا تھا کہ فون کے اندر گھس کر اس تک پہنچ جائے اور دماغ درست کر دے۔

”سنتے بعد کی تاریخ رکھ لیتے۔ ہال کی بنگلہ تو ہو ہی جائے گی۔“ رخ کے شوہر کا اپنا شاوی ہائی تھا یہاں اس لیے کوئی مشکل نہ تھی۔

بھانت بھانت کے لوگ اپنی اپنی بولیوں میں مصروف تھے۔ اس کا سر روایتی دونوں کی طرح جھکا ہوا ہی تھا مگر وہ سوچیں تھیں جو بغیر روک ٹوک کے وارد ہو رہی تھیں۔

”انسب کہاں ہے؟“ بھی کچھ تصویریں ہی ہو جائیں۔

طارق صدیقی اپنی لولاو سے دوستوں کی طرح بات کرتے تھے۔ اب بھی تصویریں لینا انہیں ہی یاد آیا تھا۔

”انسب انسب۔ اب آ بھی جاؤ۔ کہاں ہو بھی۔“

وہیں سے آواز لگاتے وہ کتنے عجیب لگتے تھے۔ اپنی ساری سوچیں ایک طرف رکھ کر اس نے اس مسخری فیملی کو دیکھنا شروع کر دیا۔ پچھلا اور کومنہ کر کے اسے آواز بن دے رہے تھے۔ پہلی بار ہی آئی تھی۔ اس نے پیچھے سر جھکا لیا۔ اچانک احساس ہوا تھا کہ اس نے اسے دیکھا تھا۔ سچہ لیں۔ اول روز کے بعد سے اس نے اسے دیکھا تھا۔ اس نے بھی اس کا حال احوال پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

”اب آ بھی چکو۔ دولہا صاحب کے “فنشن“ ہی ختم نہیں ہو رہے۔“

وہ بیڑھیوں کے قریب کھڑے پھر سے آواز بن دینے لگے جب اس نے اسے بیڑھیوں سے پیچھے اترتے دیکھا تھا۔ آف وائٹ شلوار قمیص میں وہ تیزی سے اتر رہا تھا۔

”اب بیٹھ بھی چکو، کتنا ملوگے سب سے۔“ لقمان

کی سرگوشی، سرگوشی تو ہرگز نہیں تھی، کیونکہ سب کو سنائی دے گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

”تارو بھی تصویریں۔ دولہا کا رخ روشن آخر نظر آ ہی گیا۔“

طارق صدیقی ایک بار پھر ایکشن میں تھے۔ نہ جانے انہوں نے طنز یہ کہا تھا یا مزاحیہ، بہر حال اسے ایک بار پھر سے ہنسی آگئی تھی۔ اتنے فون کے بعد وہ اس موڈ سے باہر نکلی تھی اور یہ سب کتنا اچانک ہوا تھا۔

”جیتے رہو، خوش رہو دونوں۔“ پچھو نے دونوں کے سروں پر پیار دے کر ایک ایک گلاب جامن ان کے منہ میں ڈال دی۔

”ولسن یہ جو صاحب! ناہر یا مجھ سے ہار جاتے ہیں۔“ سبحان اس کے سامنے کھڑا اسے بتا رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے سر ہلادیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا بول رہا تھا بلکہ سب ہی اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بھی چونچلاں موڈ میں تھا۔ اگر خاموش تھی تو صرف وہی تھی باقی تو پچھلی منڈی گرم تھی۔

”ہم تو اب نماز پڑھنے جا رہے ہیں، تم آٹھو ولسن کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔“

رخ کو ہوا کا پتہ نہ تھا۔ اپنے کمرے کی جانب برہہ گئیں۔ باقی سب بھی نماز پڑھنے جا چکے تھے۔ کمرے کی خوب صورتی اور خوبانگی دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

”ابو اور لقمان بھائی نے مل کر سجایا ہے۔“

رخ اسے ہٹا کر اب الماری کھول رہی تھی جہاں اس نے اس کی چیزیں سیٹ کی تھیں۔ کمرے کے کولوں میں جلتی موم بتیاں، دروازے سے بند تک بنا پھولوں کا راستہ، بیڈ پر پھولوں سے بنال، خود اس کا دل ایک دم اس خوب صورتی کا سیر ہوا تھا۔ رخ اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

”میں انسب کو بھیجتی ہوں۔“

جاتے جاتے وہ شرارت بھری مسکراہٹ اس کی طرف اچھال گئی تھی اور انسب کا ذریعہ اسے ہوش میں لے آیا تھا۔ دل ایک دم ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا۔

”انسب انسب۔ انسب یہ ناہم۔“ اس نے وائٹ کچکا پائے۔

کمرے کی ساری خوب صورتی اس ایک نام نے سیاہ کر دی تھی۔ الماری سے اپنے لیے ساڑھ بلیک سوٹ منتخب کر کے وہ ہاتھ روم میں گھس گئی۔ بہت دیر تک شاور لینے کے بعد باہر نکلی۔ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے کمر کا مساج کرتے اچانک اس کی نگاہ اپنے عکس پر جا ٹھہری تھی، بڑی بڑی شریقی آنکھیں، خوب صورت نازک ہونٹ، کھڑی ناک، نازک صراحی جیسی گردن، گلابی رخسار، لمبا قد، کیا وہ روکی جا سکتی تھی؟ مگر کی جا چکی تھی۔ اس نے لمبا سانس بھرتے برش ڈرائنگ ٹیبل پر پھینک دیا۔

جس شخص کے حوالے سے وہ اس کمرے میں موجود تھی اسے کبھی قابل اعتنا نہ سمجھا تھا اور جسے اس نے اپنے جیسے کی وجہ بنا لیا تھا اس نے اسے جنم میں دھکیل دیا تھا۔ ”فیضان“ بغیر آواز کے اس کے لبوں نے جنبش کی۔ کیا یہ زندگی تھی۔ ایک گرمی ٹھنڈی سانس بھرتے وہ مڑی، اسی وقت وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

اسے اس طرح بغیر روپے کے دیکھ کر جہاں ایک ٹانہ سے کے لیے وہ ٹھٹھکا تھا وہیں وہ بھی بدحواس ہوئی تھی۔ سامنے بیڈ پر رکھا عریض ڈریس الماری میں پٹنگ کرنے کے لیے پکڑ لیا۔

”کچھ دیر کے لیے ہی سہی۔ تم سے اتنا انتظار بھی نہ ہو سکا کہ جس شخص کے حوالے سے تم اس کمرے میں موجود ہو اس کے لیے تیار۔“ اس کے اس حلیے پر اس کی سوچ عجیب تو نہ تھی۔

نہ جانے اسے اس طرح سر جھاڑ منہ پہاڑ دیکھ کر دکھ کیوں ہوا تھا۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

بعض چیزیں واقعی اتنا ہماری بوجھ ہوتی ہیں کہ جتنی جلدی ان سے چھٹکارا پایا جائے اتنا ہی اچھا ہوتا

ہے۔ وہ عین اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، انداز نہایت سنجیدہ اور گھبرا ہوا تھا۔ اشارہ اس کے ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کی طرف تھا۔ اس کے کھین شیوہ چرے پر نازہ شیوہ کی نیلاہٹ تھی۔ جڑے بھینچے ہوئے اور کالی آنکھیں گھبرے پانیوں جیسی تھیں۔ ایک لحظے کو وہ واقعی شرمندہ ہوئی تھی اور حیران بھی۔

”کیا یہ وہی انسب تھا۔“

ایک قدم مزید بڑھا کر اس نے اس کے ہاتھ قلم لیے۔ ٹھنڈے برف ہاتھ ہماری مردانہ ہاتھوں کی گرمی سے جیسے کھلنے لگے تھے۔ سائڈ ٹیبل کی دروازہ کھولتے دو بھاری نگہن اس کے ہاتھوں سے ہوتے اس کے ہاتھوں میں مقفل ہوئے تھے۔ انداز میکا کی اور ردیو ٹک تھا، جسے وہ ابھی تک دو انسب سمجھتے ہوئے کسی خاطر میں نہ لارہی تھی۔ وہ غلطی باندھے اس کی آنکھوں میں ٹھنڈے کی کوشش کر رہا تھا۔ سر اسے ہو کر اس نے ہاتھ کھینچ لیے۔ اس کے سگتے ہاتھوں کا لمس اس کے چہرے تک کو وہ کا گیا تھا۔ اس کی انڈی۔

”کیا یہ بھی امی نے دیے ہیں۔“ اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

ایک تہی ہوئی خشمگین نگاہ اس پر ڈالتے وہ ہاتھ روم میں بند ہو گیا۔ ایک مسخرانہ ہنسی ہنستے وہ جیسے جانی دشمن کو زیر کر کے آئی تھی۔ کمرے کے ازسرنو جائزے نے جہاں اسے خائف کیا تھا وہیں پریشان بھی کر دیا تھا۔ اتنا برا بیڈ روم صوفے کے دو سوے خالی تھا بیڈ کے آگے پرا کا ڈوچ، دو سنگل صوفے اور چھوٹی چھوٹی سائڈ ٹیبلوں کا ڈوچ پر سونے کے خیال پر اس نے لعنت جیجی تھی۔ اب اس کے قدموں میں سونے سے تو رہی۔ بالی باہر کے بیڈ روم نہ جانے کس کس کے تھے۔ ایک ہی حل تھا اس کے آنے سے پہلے پہلے کبل اوڑھ کر بیڈ کے ایک کونے میں سو جائے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

”اوه ابو مس منت مجھے تاثر دینا چاہتی ہیں کہ ان

کے لیے میری اہمیت صفر ہے، حالانکہ جانتی نہیں کہ میں آپ کو صفر جیسی اہمیت بھی دینے سے قاصر ہوں۔ جس شخص سے آپ وابستہ رہی ہیں اس کا نام ہی مجھے اہمیت دیتا ہے اور آپ تو بے "اس" نے سر جھٹک کر سب سوچوں کو بھی جھٹکنے کی کوشش کی تھی۔

بیز کا دوسرا کوٹا آباد کرتے اس نے دوسری طرف پلٹے کبل کو چنداں اہمیت نہ دی تھی۔ اسے ابھی بہت سا کام کرنا تھا۔ اس لیے اس قسم کے فضول کاموں کے لیے اس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ لیپ ٹاپ کھول کر لاگ ان کرتے وہ مصروف ہو چکا تھا۔ بہت پرہیز اور پراعتقاد ہوتے ہوئے بھی وہ تھوڑا ڈری ہوئی تھی اور پھر نہ جانے کب نیند کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔

فیضان کے ساتھ مل کر میرا مذاق بنانے والی منت حاو ثانی طور پر میری زندگی میں شامل ہو چکی تھی۔ بیڈ کے دوسرے کونے پر موجود وہ لڑکی بھی فیضان کے ساتھ منسوب رہی تھی، مجھے یہ بات بھلائے نہ بھول رہی تھی۔ شاید میں بھول بھی جاتا اگر اس کا رویہ کچھ بہتر ہوتا مگر وہ تو اگلے روز سے "سوک" مٹا رہی تھی۔

اسے میری اور مجھے اس کی زندگی کا حصہ زبردستی بنایا گیا تھا۔ شاید وہ مجھے ابھی تک وہی دتو، جھینو اور رک رک کر بولنے والا کم اعتماد نسب سمجھتی تھی جو اس کی باتوں سے خائف ہو جایا کرتا تھا۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی تھے۔ رشتہ بھی وہیں تھا اور ہم بھی۔ اگر اسے میری پروا نہیں تھی تو میں کون سا اس کے عشق میں فنا ہو رہا تھا۔ گزریے وقت نے جہاں اور بہت سی تبدیلیاں پیدا کی تھیں میری ذات بھی نکھر گئی تھی اور اس میں سراسر میری اپنی کوششوں کا دخل تھا۔

رات بیت گئی تھی۔ اسے بیت ہی جانا تھا۔ خنکی نے اچانک ہی دھوا بولا تھا۔ ٹیرس کا دروازہ بند کرتے میں اندر آگیا، جہاں وہ آرام سے سو رہی تھی۔ نیند تو

میری بھی بہت اچھی تھی۔ دو جانی دشمن ایک چھت کے نیچے ایک بیڈ کے مختلف کونوں میں مزے کی نیند سو رہے تھے۔

میرا دل نہ لگنے کی وجہ اس کی عدم دلچسپی تھی۔ پچھو پچھا اس سے باتیں کرتے، فریال اور سن کرچہ جا چکی تھیں۔ مگر ہر روز فون کیا کرتیں، مگر اس کی خاموشی ختم ہونے میں نہ آئی۔

پچھو اس کو زبردستی مخاطب کرتیں۔ پرانے قصے سناتیں۔ پچھا اپنے دن کی روداد سناتے اور وہ ہوں ہاں کرتے سنتی رہتی۔ نسب کے معمولات وہی تھے جن میں اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہ آیا تھا۔ رات دیر تک بیڈہ کر تک نک کرتا دیر سے سوتا، دیر سے اٹھتا اور کام پر چلا جاتا۔ اگر اس نے اسے اس کی اوقات میں رکھا تھا تو وہ بھی اسے چنداں اہمیت نہ دیتا۔ سارا دن اور بچے کے چکر لگاتی، تحریم سے بات کرتی، ماما کی آواز سننے فون بند کر دیتی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ پچھا اور پچھو سے باتیں کرنے لگی تھی، جیسی وہ تھی نہیں کتنی دیر ایسی دن کے رہ سکتی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم کہ کسٹم والوں نے ہماری لیدر گڈز کیوں کپڑی ہیں مگر ایک بات تو طے ہے کہ ہمارے لیے ایک بڑی مشکل کھڑی ہونے والی ہے۔ اگر مال چھڑوایا جائے تب بھی اور اگر وہ اسے کثیر کرنے سے انکار کر دیں تب بھی مگر ابھی مسئلہ یہ نہیں ہے۔"

اس سات منزلہ عمارت کے چوتھے فلور کے تیسرے کمرے میں حسین بے چینی اور پریشانی کے عالم میں چکر کاٹ رہا تھا۔ ایک طرف کڑا امانت اس کی پریشانی کو اس کے وجہ چرے پر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر سے بند کر لیا۔

حسین ایک بار پھر بولنے لگا تھا۔

"مسئلہ تو پاکستان کا وہ آرڈر ہے جو پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہے، وعدے کے باوجود ہم ان کمپنیوں کو مال

پنجانے میں ناکام رہے ہیں۔ اب وہ ہماری پہلے کی ساکھ کی بدولت اگر ہمارے آرڈر کو اسی طرح ساتھ لے کر چل رہے ہیں تو ہماری خوش قسمتی ہے ورنہ۔۔۔

بہر حال میں یہاں کس قسم کے معاملات دیکھتا ہوں، آپ پاکستان جاتیں اور جو بھی مسائل ہیں انہیں فی الفور حل کرنے کی کوشش کریں۔"

اس کی آنکھیں بولتے ہوئے بھی گہری سوچ میں ڈوبی دکھائی دیتی تھیں۔ چاروں طرف سے مشکلات نے جیسے ایک دم دھوا بول دیا تھا اور وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ مگر زمرے سالوں میں ایسی کسی مشکل سے واسطہ نہیں بڑا تھا، مگر اب۔۔۔

"آپ فکر نہ کریں حسین بھائی، آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔"

امانت علی کے من کی مراد جیسے بر آئی تھی، وہ یہی تو چاہتا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے امانت اس کے ساتھ تھا، ہر چیز کے بارے میں جانتا تھا۔ پچھلی بار بھی تو آرڈر کی ساری تفصیلات وہی طے کر کے آیا تھا اور یہیں سے حسین کی بد قسمتی کا آغاز ہوا تھا۔ دونوں کے درمیان ہم زلف کارشتہ حسین کے لیے اہمیت رکھتا ہو یا نہیں، لیکن امانت بلاوجہ ہی مقابلے بازی کا شکار ہوا تھا۔ امانت کے جذبات کبھی بھی حسین تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ مگر اس کی اتنی ترقی نے امانت کے دل میں عجیب طرح کے جذبات بھر دیے تھے۔

اگر حسین اس وقت اپنی سوچوں میں گم سامنے پڑی میز کو گھور نہ رہا ہوتا تو امانت کے ہونٹوں پر آنے والی مکارانہ مسکراہٹ سے کچھ نہ کچھ جان ضرور جاتا۔

"اچھا بیٹے، میں جا رہی ہوں، اتنی چٹیاں ہو گئیں، اب تو بچے بھی مجھے یاد کر کر کے تھک گئے ہوں گے۔"

حنا خاتون سر پر چادر جماتے اس کے سامنے کھڑی اسے بتا رہی تھیں۔ اس نے ان کے خوب صورت چہرے پر نظریں جماتے سر کے اشارے سے جی اچھا کہا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھیں، اس کی نظریں ان ہی پر جمی

رہیں۔

"اگر نسب یا اس کے ابو آئیں تو کھانا نکال دیتا، چاول تو بنے ہوئے ہیں، صرف گرم کرنے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر سے سر ہلادیا۔

دروازہ خود کار لاک سے بند ہو گیا تھا۔ اس نے کسلندی سے ٹانگیں پھیلا لیں۔ کیسی عجیب بات تھی، لندن اگر جیسے وہ گاؤں میں آگئی تھی۔ وہی ماحول، کتنا عجیب تھا، نسب اس کی پچھو حنا صدیقی قریبی مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ شام دو گھنٹے وہ مسجد میں گزارتیں، بہت پہلے وہ اس مسجد سے اپنے روزگار کے لیے وابستہ ہوئی تھیں اور اب اسے کار خیر سمجھتے ہوئے ابھی تک اسی پر کار بند تھیں۔

پچھا طارق حسین کی فنیسی کپڑوں کی دکان تھی۔ لندن ساؤتھ ہل کا یہ علاقہ جس میں زیادہ تر ایشیائی آباد تھے۔ خوب پر رونق رہتا۔ پچھا بھی خوش رہتے گاؤں سے آنے کے بعد انہوں نے یہاں روزگار تو ڈھونڈا ہی تھا، بہت سی دوسری دلچسپیاں بھی ڈھونڈ لی تھیں۔ گاؤں کے حقے کی جگہ شیشے کے حقے لے لی تھی۔ شیشے کا نیا نازک حقہ وہ کبھی کبھار ہی گزرتا تے یا شاید دکان میں اپنا شوق پورا کر لیتے ہوں گے۔ فریال اور سن دونوں شادی شدہ تھیں۔ ہنسنے یا دہنسنے بعد بچوں کے ساتھ چکر لگاتیں، دونوں کے دو، دو بچے تھے۔ دونوں بڑھی لکھی تھیں اور اسکول میں جاب بھی کرتی تھیں۔

یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک تھا، لیکن جوں ہی اس کی سوچ نسب کی طرف جاتی اسے غصہ آنے لگتا۔ (ایم۔ اے انگلش کرنے والی میونی در سن کی بہترین اسٹوڈنٹ کے لیے یہی کپڑے بیچنے والا دکان دار ہی رہ گیا تھا۔ اس کی سوچیں زہریلی ہو جاتیں۔) (اول روز والی (میں) نہیں نہیں جانتی، کچھ نہیں سمجھتی۔) کیفیت ابھی تک برقرار تھی۔

گھر اس کی سوچ سے بڑھ کر خوب صورت اور بڑا تھا۔ کئی گھرے بہترین فرنیچر، بڑا لان، آنے سے پہلے اس کے ذہن میں تنگ و تاریک دو کمروں کا فلیٹ گھوم

جاتا جیسا کہ اس نے لندن کی رہائش کے متعلق پہلے سے سن رکھا تھا مگر یہاں سب اس کی سوچ کے الٹ تھے۔ کبھی اسے تحریک کی باتیں یاد آتیں۔
”ڈیل منز اور سافٹ اسپوکن سے ہیں انب بھائی۔“

دوسروں کے لیے تو وہ شاید سافٹ اسپوکن ہی تھا مگر اس پر عجیب طوف کے تیر رہا تھا۔ خیر وہ بھی کون سا کم کرتی تھی وہ خود سر تھی۔ اس کی تھک کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ باہر تو وہ لوں عموماً (سب تھک ہے) کی اینٹنگ کرتے پائے جاتے اور کمرے کے اندر بھی کھار کی نشتر زنی چلتی رہتی۔

اس کی اپنی طبیعت میں عجیب طرح کا بچپنا تھا بہت جلد ناراض ہو جاتی۔ جلدی مان بھی جانی حلال نہ وہ گھر میں سب سے بڑی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ ایسی ہی تھی۔ عجیب وغریب شخصیت کی مالک۔ کبھی بچہ پورے طرح پیار آتا چھپا ہوا باتیں سننے سننے کتنی دیر گزر جاتی اور بھی ہر چیز سے دل اوب جا تا۔ کبھی بچن میں سارا سارا دن گزار دیتی تو کبھی ایک منٹ کے لیے بھی وہاں کھڑی نہ ہوتی۔

وہ جیسے تھا۔ اسے اس بات سے کوئی انکار نہ تھا مگر اس دل کا کیا کرتی جو اس کی طرف مائل ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ اسے وہی دلوں جھینڈو انب سمجھتی تھی۔ جو اس کے قریب تک آنے کی جرات نہ کر سکا تھا۔

”تم کیا سمجھتے تھے کہ تم وہاں میرا تماشا بنا کر چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے تو میں وہیں تمہارے نام پر بیٹھی رہوں گی، سڑتی رہوں گی، دھو بیٹیں آگئی ہوں۔ میں اور بہت خوش ہوں۔“ ایک سی سانس میں جملے بولتے اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔

بچن میں چائے پلاتے بناتے اسے نہ جانے کیا ہوا تھا۔ وہ فیضان جسے نفرت سے سوچتے اس کا گریبان پکڑنے کی خواہش تھی۔ آج اچانک اس کا نمبر سامنے آنے پر اس کا نمبر ملا بیٹھی تھی۔ وہ اسے بتانا کیا چاہتی

تھی خود اس بات سے لاعلم تھی۔
”بس یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا تم نے یا کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو۔ ویسے بھی میں شادی کے نام پر ایک اور ”ملا“ پالنے کا قائل نہیں، ایک ہی بہت ہے میرے لیے۔ جب شادی کے بغیر ہی معاملات حل ہو رہے ہوں تو شادی نام کا پھندا گلے میں ڈالنے کی ضرورت کیا ہے۔“

اس کی مکروہ آواز نے دوسری طرف کی خاموشی کو توڑا تھا اور توڑتی چلی جا رہی تھی اور وہ جوں کے نہیں خانے میں اس کی معذرت، شرمندگی کی خواہش رکھتی تھی اس کی بے شرمی، ڈھٹائی اور بے غیرتی دیکھتے ہیں سن کھڑی رہ گئی تھی۔ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”لیزا اور میں ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے بغیر عرصے سے لیوگ ریلیشن شپ میں ہیں۔ نہ وہ میرے معاملات میں دخل دیتی ہے نہ میں اس کے سارا قصور میری مل کا ہے جو یہاں کی ہر چیز کو سینے سے لگا کر بس اسی چیز کو برا سمجھتی ہے۔ بار بار تمہیں بتانے کی کوشش کی مگر تم۔ اور میری مل اگر زہر کھانے کی دھمکی دے کر پاکستان نہ لے جاتی۔“ وہ نہ جانے کیا کیا کہتا جا رہا تھا۔

”تم اس قدر گھٹیا ہو گے اس کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی۔“ چائے ابل ابل کراؤں کے اوپری حصے میں پھیل چکی تھی مگر اسے اور گرد کا ہوش ہی کب تھا۔

”اس قدر گھٹیا!!“ اس کا جاتی تقہ اسے فون کے اندر سے کلن پھاڑنا سنائی دیا تھا۔
”اگر تمہارے ساتھ شادی کر لیتا لیرا کو بھی ساتھ رکھتا تو پھر اچھا ہو نایا؟“ یہی محبت کرتی ہو جھجھکتی۔
”ہاں آواز کرتے نہایت عامیانه انداز میں کہا گیا تھا۔ جیسے وہ محبت کرنے والوں کے درمیان راز و نیاز چل رہے ہوں۔
”محبت اور تم سے۔“ اس نے ایک طرف تھوک دیا۔

”مجھے صرف اپنے شوہر سے محبت ہے۔“ کمزور لہجے اور بے یقینی کے ساتھ شاید وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس پر اس کا تقہ پہلے سے بھی بلند آہنگ تھا۔ ”تمہارا شوہر؟ ہاں پتا چلا تھا۔ دیے ایک بات تو بتاؤ۔“ رازداری سے کہتے اس نے آواز کو بالکل ہلکا کر کے جیسے کان سننے کے لیے قریب کیا تھا۔ ”وہی شخص جو دوسروں کی آنکھوں میں دیکھ کر بات تک مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ وہی شوہر ہے نا تمہارا۔ تو کیا اتنا حوصلہ ہے اس میں کہ دیکھے بغیر ہی۔“

اس کے کلن کی لوں سرخ ہو گئیں۔ سارے جسم کا خون جیسے چرے پر اٹھا ہو گیا تھا۔ اس کی معنی خیز بات نے اسے جیسے جلتے جنم میں دھکیل دیا تھا۔ اس شخص کی خباثت سے وہ پہلے کیوں کر لاعلم رہی تھی۔
”جو اس بند کو گھٹیا عینے انسان۔“

مغالطات کا ایک طوفان زبان پر آنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے فون بند کر کے میز پر رخ دیا۔ لمبے لمبے سانس لیتے اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ آنسو نہ جانے کہاں کہاں سے اڈ کر آرہے تھے۔ کرسی پر گر کے وہ جھکیوں سے رو رہی تھی۔

”کیا یہی وہ شخص تھا جس کے لیے لعنت ہے تم پر فیضان لعنت۔“ اس کے مکروہ اور گھٹاؤنے کردار کو سوچتے ہوئے اسے اس سے نفرت ہو رہی تھی، بلکہ وہ خود سے بھی نظرس ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کیا اس نے اس شخص کو سوچا تھا۔ ایک بد کردار شخص جس کا مکروہ اور مخ شہدہ چہرہ اس کے سامنے تھا اس کی گندی ذاتیت اور اس کی باتیں اس کے دماغ میں چکرائی رہیں۔

وہاں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ پہلے پہل اسے اپنے فون کرنے پر بیچھڑا ہوا تھا مگر شاید یہ ہی بہتر تھا کیونکہ اس کے فون کرنے سے دل میں ذرہ برابر بھی اس کا خیال نہ رہا تھا۔ اس کا اعتماد اس کی وجاہت اس کی شخصیت سب کچھ اس کے کردار کی آلودگی سے آلودہ ہو گیا تھا۔ وہ شخص نفرت کیے جانے

کے قابل تھا۔

”آپ کا جو آرڈر آیا ہے اس میں کچھ ایسے کیمیکلز پائے گئے ہیں جو انسانی صحت کے لیے مضر ہیں ان کی ہم پڑاں کر رہے ہیں آپ کا سامان تب تک کلنڈر نہیں کیا جائے گا۔ جب تک یہ معاملہ مکمل طور پر حل نہ ہو جائے۔“ سامنے کھڑے آفیسر نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ یہ ایک برا آرڈر تھا اور اس کے اندر مضر صحت کیمیکلز کا ہونا صرف آرڈر کے لیے ہی نہیں کمپنی اور اس کی سادھ کے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا تھا۔

”تم اس سے بھی بری اور بری خبر یہ ہے کہ آپ کی کمپنی اس معاملے کے حل ہونے تک درکنگ پوزیشن میں نہیں ہوگی۔“

وہ ڈولتے قدموں سمیت گاڑی تک پہنچا تھا۔ کافی دیر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اس نے کچھ سوچنے کی کوشش کی۔ ابھی پنج ہی تو امانت علی سے اس کی بات ہوئی تھی۔ وہاں کا آرڈر بھیجا چکا تھا اور ابھی بھی کردی گئی تھی۔ اس کا حال بھی وہی ہونے والا تھا جو پہلے والے کا تھا یا۔ کمپنی درکنگ پوزیشن میں نہیں تھی تو یہ آرڈر۔

گاڑی چلاتے ہوئے اس کا ذہن مختلف خیالات کی آباد گاہ بنا ہوا تھا۔ ان ساری سوچوں نے اسے اس قدر تھکا دیا تھا کہ وہ صرف اور صرف آرام کرنا چاہتا تھا۔ اسی آرام کی خواہش میں اس کی آنکھیں ایک سیکنڈ کے لیے بند ہوئی تھیں اور وہ سامنے سے آئی گاڑی دیکھ نہیں پایا تھا۔ ایک دھماکے کو سنتے اس کا دماغ ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس نے اسے یکن ٹیبل پر سر رکھے روتے دیکھا تھا، وہ اس کی آمد سے بے خبر جھکیوں سے رو رہی تھی۔ فون پر ہونے والی گفتگو اس نے بلا ارادہ سنی تھی۔ دروازے کی چابی گھر کے ہر فرد کے پاس تھی اس لیے

اس کے اندر آنے کا اسے علم نہیں ہو سکا تھا۔ وہیں رک کر اس نے چپ کر دینے یا ویسے ہی چلے جانے کے بارے سوچا۔ پھر وہ کھڑا سوچتا رہا اور پھر اس کے حال پر چھوڑ کر ان ہی قدموں واپس چلا گیا۔ ستر تھا کہ اسے خود سے سوچنے، فیصلہ کرنے کا موقع دیا جانا، غبار نکل گیا تھا۔ یقیناً ”اب بہت کچھ بہتر ہونے والا تھا۔“

”آبا! میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ بغیر کچھ بھی کئے مجھے معاف کر دیجیے۔“ ہمارے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

وہ جو اس کے آنے پر حیران تھیں، وہیں کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور چہرے پر زحمت کا غبار چھایا ہوا تھا۔

”جس اولاد کے لیے سب کچھ کیا، اس نے دھوکا دے کر ثابت کر دیا کہ جو کچھ بونیس گے دی فصل کاٹنی پڑے گی۔ سوچا تھا فیضان کی شادی کر کے اسے اس کی حرکتوں سے باز رکھ سکیں گے اور لندن کے ساتھ کاروبار میں۔ مگر۔۔۔ رندھی آواز میں جملہ مکمل نہیں کر سکی تھیں۔“

حنانے آگے بڑھ کر انہیں بیٹھے کا اشارہ کیا، مگر انہوں نے انکار میں گردن ہلا دی۔

”نہیں“ میں رک نہیں سکتی۔ بس آپ معاف۔۔۔ شرمندگی سے جھکا سر کچھ اور بھی جھک گیا۔

”میں نے معاف کیا۔“ حنان کے منہ سے سنتے ہی وہ روتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

”حنان! ان لوگوں نے سب کچھ کھالیا، تم لوگوں کو گھر سے بے گھر کر دیا، کاروبار پر قبضہ کر لیا اور تم نے پھر بھی ان سے ملنا نہ چھوڑا۔“

رضیہ آپا لندن سے ناچسٹر منتقل ہو چکی تھیں۔ لندن آنے پر انب کی شادی کی مبارک باد دیتے آئے پر انہوں نے ہما کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خود

پر قابو نہیں رکھ پائی تھیں۔ انہوں نے حنا اور طارق حسین کو گاڑی سے بلوایا تھا۔ ان دونوں سے خاص الفت رکھتی تھیں، وہ اپنی آواز میں بول رہی تھیں۔ منت کے قدم دروازے سے اندر آتے وہیں جامد ہوئے تھے۔

”مجھے تو ابھی تک یاد ہے، کیسا مشکل وقت کا تاہم نے اور تمہاری اولاد نے۔ طارق بے چارہ زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا، بچے ابھی کسی قابل نہ تھے۔ کاروبار پر ہنونی نے قبضہ جمایا، بن کو بھی شرم نہ آئی، اسے تمہائی۔ احسان کا بدلہ دھوکے اور فریب سے دیتے پہلی بار دیکھا۔ کیسے لوگ ہیں، پھر اسی شکل و صورت کے ساتھ آجاتے ہیں۔“

گلی لپٹی رکھے بغیر بولنے والی رضیہ آبا کے متعلق اس نے پچھلا سے سنا تھا۔ دونوں پچھلا پہلے لیدر کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ وہ جانتی تھی، پھر بڑے پچھلا کا کاروبار ایک سیلنٹ کی وجہ سے ٹھپ ہو گیا تھا۔ مگر اندر کی حقیقت اسے آج معلوم ہوئی تھی۔

”عرصہ ہو گیا آبا! اس بات کو ہم بھول بھال بھی گئے، چھوڑیں آپ جاتیں، آپ کا کیا حال ہے، بچے کیسے ہیں؟“

حنان یکم نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کا دھیان کسی اور جانب لگانے کی کوشش کی۔

”کیسے بھول جاؤں؟ میرا بھائی، زمینیں بیچ کر اس نے سارا کا سارا سرمایہ یہاں لگا دیا تھا۔“ رضیہ آبانے پچھلا کو بھائی بنا رکھا تھا، یہ بھی وہ جانتی تھی کیسے کیسے راز منکشف ہو رہے تھے۔

”گھڑیا کا تپا میں، آبا کیسی ہیں، اس کے بچے کیسے ہیں، ہمیں ہے یا وہ بھی ناچسٹر چلی گئی۔“ حنا آخر ان کا دھیان بنانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

”ہاں وہ بھی ناچسٹر چلی گئی۔ میاں کی جاب جو وہاں ہو گئی تھی تو یہاں رہ کر کیا کرتی۔“

وہاں سے قدموں کو موڑتے بہت سے پروے آنکھوں سے بٹے تھے۔

چھوٹی پچھلا کا ہر سال پاکستان کا چکر لگانا بے دریغ

پیشہ خرچ کرنا، شوخیان، بڑی پچھلا اور ان کی اولادوں کی برائیاں، مذاق دینا، قیاسی ہونے کے طعنے، جاہل کہہ کر مذاق اڑایا جاتا، اوچھی حرکات اور وہ خود بھی تو کسی حد تک اس سب میں شامل رہی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر بڑے نقاب سرک گئے تھے اور اسے کراہیت، غم، غور رہی تھی۔

”ہی! کیا کرنے آئی تھیں آنٹی یہاں۔“ کچن میں سالن گرم کرتے اس نے اسے پہلی بار اونچی آواز میں بولتے سنا تھا۔

”تمہاری شادی کی مبارک دینے آئی تھی، صرف دو منٹ کھڑی رہی، پھر واپس۔“ ساری عمر وہ اپنی، بن کے لیے خود کو مجرم سمجھتی رہی تھیں۔

”انہیں دیکھتا ہوں تو میرے اندر دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ کیسا مشکل وقت تھا وہ، ابو کی دوائی کے پیسے نہ تھے۔ ہماری برہائی کے اخراجات، وہ ساری کسمپرسی یاد آجاتی ہے دیکھتے ہی۔ ویسے تو انہوں نے فراڈ کے ثبوت چھوڑے ہی نہیں تھے اور اگر کچھ تھے بھی تو اب کے اور ابو کے رویے کی بدولت۔ جب انہوں نے کوئی شرم نہیں کی تو آپ نے کیوں لحاظ رکھا ہرناے کا۔“

”ہم نے سب کچھ اندر چھوڑ دیا انب۔“ ان کے ایک جملے نے اسے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

آہستہ آہستہ اس پر سارے راز افاش ہوتے چلے گئے تھے۔ امانت پچھلانے کس طرح ”حسینہ“ کی جزیں کاٹنے خود کی بد رکھنی بنائی تھی۔ اگر بڑی پچھلا نے پیاسے ذکر بھی کیا ہو گا تو اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی، ویسے بھی شروع ہی سے اس کی ساری کی ساری توجہ چھوٹی پچھلا اور ان کی اولاد کے لیے تھی۔ وہ اس کے لیے ایک ماڈل تھیں، پھر فیضان کے ساتھ عرصہ منگنی رہی تھی دل خود بخود اس کے لیے نرم ہوتا چلا گیا تھا اور اب ہر راز سے پردہ اٹھ گیا تھا۔

بڑی پچھلا اور پچھلا کس قدر صابر اور اچھی طبیعت کے تھے، ان کے ساتھ رہنے پر اس پر منکشف ہو گیا

تھا۔ احساسات بدلے تھے، حقائق سامنے آئے تھے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ اس کا اٹھنا اس کا بیٹھنا، بات کرنے کا انداز، ہر چیز تو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ بھی کھینچ رہی تھی۔ ”جسوال سنگھ کے بڑے بھائی کی شادی بھی، برات دور جانی تھی تو ٹرین میں جانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔“ طارق حسین کو قہقہے سنانے کا شوق تھا، ابھی بھی وہ منت کے شوق اور اشتیاق کو دیکھتے ہوئے چائے بنوا کر اسے اپنے سکھ دوست کا پرانا قصہ سنا رہے تھے۔

ریڈ سوٹ میں ان کے ایک طرف بیٹھی وہ چائے بننے کے ساتھ ساتھ انہیں سن رہی تھی۔ ایک طرف چٹختی حنا بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھیں، حالانکہ یہ قصہ انہوں نے کئی بار سن رکھا تھا۔ اس نے انہیں بیڈ روم کے سامنے بنے ٹیرس سے دیکھا تھا۔ آج کل اس کی دلچسپی ہر ہر چیز میں محسوس کی جاسکتی تھی۔ صوفے پر پاؤں اوپر کیے اس کا اشتیاق قابل دید تھا۔

”ٹرین کے اس ڈبے میں جہاں باقی لوگ بیٹھے تھے، جسوال رش کی بدولت نہ بیٹھا، ٹرین کہیں رکی تھی، کوئی پھوٹا اسٹیشن تھا۔ ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔ لڑائی ہو گئی لڑائی ہوئی۔ جسوال سمجھا کہ اس کے بھائی کی لڑائی ہو گئی۔ سکھ تھا نا بارہ تو دیسے ہی بجے رہتے ہیں ان کے۔“ بات سنانے سنانے وہ خود ہی ہنسے تھے۔ وہ بھی اگر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ پوری طرح ابو کی طرف متوجہ تھی۔

”بارش کے دن تھے، اس کے ہاتھ میں لمبی کالی چھتری تھی، اس نے آؤ دیکھنا، تاؤ باہر نکل کر لڑائی والی جگہ کی طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں دو افراد باہم برسر پیکار تھے۔“

وہ تھوڑی دیر رکے۔

”ان کو الگ کرتے اس نے زور سے چھتری ایک کے منہ پر ماری۔ اس کی ناک سے بھل بھلی خون بہنے لگا۔ بعد میں پتا چلا لڑائی کسی اور کی ہو رہی تھی۔ قریب ہی پولیس کے جوان کھڑے تھے۔ انہوں نے سنگھ کو پکڑ لیا۔ بھائی بے چارہ جس کی شادی پہلے ہی بڑی

تھا۔ احساسات بدلے تھے، حقائق سامنے آئے تھے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ اس کا اٹھنا اس کا بیٹھنا، بات کرنے کا انداز، ہر چیز تو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ بھی کھینچ رہی تھی۔ ”جسوال سنگھ کے بڑے بھائی کی شادی بھی، برات دور جانی تھی تو ٹرین میں جانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔“ طارق حسین کو قہقہے سنانے کا شوق تھا، ابھی بھی وہ منت کے شوق اور اشتیاق کو دیکھتے ہوئے چائے بنوا کر اسے اپنے سکھ دوست کا پرانا قصہ سنا رہے تھے۔

ریڈ سوٹ میں ان کے ایک طرف بیٹھی وہ چائے بننے کے ساتھ ساتھ انہیں سن رہی تھی۔ ایک طرف چٹختی حنا بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھیں، حالانکہ یہ قصہ انہوں نے کئی بار سن رکھا تھا۔ اس نے انہیں بیڈ روم کے سامنے بنے ٹیرس سے دیکھا تھا۔ آج کل اس کی دلچسپی ہر ہر چیز میں محسوس کی جاسکتی تھی۔ صوفے پر پاؤں اوپر کیے اس کا اشتیاق قابل دید تھا۔

”ٹرین کے اس ڈبے میں جہاں باقی لوگ بیٹھے تھے، جسوال رش کی بدولت نہ بیٹھا، ٹرین کہیں رکی تھی، کوئی پھوٹا اسٹیشن تھا۔ ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔ لڑائی ہو گئی لڑائی ہوئی۔ جسوال سمجھا کہ اس کے بھائی کی لڑائی ہو گئی۔ سکھ تھا نا بارہ تو دیسے ہی بجے رہتے ہیں ان کے۔“ بات سنانے سنانے وہ خود ہی ہنسے تھے۔ وہ بھی اگر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ پوری طرح ابو کی طرف متوجہ تھی۔

”بارش کے دن تھے، اس کے ہاتھ میں لمبی کالی چھتری تھی، اس نے آؤ دیکھنا، تاؤ باہر نکل کر لڑائی والی جگہ کی طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں دو افراد باہم برسر پیکار تھے۔“

وہ تھوڑی دیر رکے۔

”ان کو الگ کرتے اس نے زور سے چھتری ایک کے منہ پر ماری۔ اس کی ناک سے بھل بھلی خون بہنے لگا۔ بعد میں پتا چلا لڑائی کسی اور کی ہو رہی تھی۔ قریب ہی پولیس کے جوان کھڑے تھے۔ انہوں نے سنگھ کو پکڑ لیا۔ بھائی بے چارہ جس کی شادی پہلے ہی بڑی

تھا۔ احساسات بدلے تھے، حقائق سامنے آئے تھے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ اس کا اٹھنا اس کا بیٹھنا، بات کرنے کا انداز، ہر چیز تو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ بھی کھینچ رہی تھی۔ ”جسوال سنگھ کے بڑے بھائی کی شادی بھی، برات دور جانی تھی تو ٹرین میں جانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔“ طارق حسین کو قہقہے سنانے کا شوق تھا، ابھی بھی وہ منت کے شوق اور اشتیاق کو دیکھتے ہوئے چائے بنوا کر اسے اپنے سکھ دوست کا پرانا قصہ سنا رہے تھے۔

ریڈ سوٹ میں ان کے ایک طرف بیٹھی وہ چائے بننے کے ساتھ ساتھ انہیں سن رہی تھی۔ ایک طرف چٹختی حنا بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھیں، حالانکہ یہ قصہ انہوں نے کئی بار سن رکھا تھا۔ اس نے انہیں بیڈ روم کے سامنے بنے ٹیرس سے دیکھا تھا۔ آج کل اس کی دلچسپی ہر ہر چیز میں محسوس کی جاسکتی تھی۔ صوفے پر پاؤں اوپر کیے اس کا اشتیاق قابل دید تھا۔

”ٹرین کے اس ڈبے میں جہاں باقی لوگ بیٹھے تھے، جسوال رش کی بدولت نہ بیٹھا، ٹرین کہیں رکی تھی، کوئی پھوٹا اسٹیشن تھا۔ ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔ لڑائی ہو گئی لڑائی ہوئی۔ جسوال سمجھا کہ اس کے بھائی کی لڑائی ہو گئی۔ سکھ تھا نا بارہ تو دیسے ہی بجے رہتے ہیں ان کے۔“ بات سنانے سنانے وہ خود ہی ہنسے تھے۔ وہ بھی اگر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ پوری طرح ابو کی طرف متوجہ تھی۔

”بارش کے دن تھے، اس کے ہاتھ میں لمبی کالی چھتری تھی، اس نے آؤ دیکھنا، تاؤ باہر نکل کر لڑائی والی جگہ کی طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں دو افراد باہم برسر پیکار تھے۔“

وہ تھوڑی دیر رکے۔

”ان کو الگ کرتے اس نے زور سے چھتری ایک کے منہ پر ماری۔ اس کی ناک سے بھل بھلی خون بہنے لگا۔ بعد میں پتا چلا لڑائی کسی اور کی ہو رہی تھی۔ قریب ہی پولیس کے جوان کھڑے تھے۔ انہوں نے سنگھ کو پکڑ لیا۔ بھائی بے چارہ جس کی شادی پہلے ہی بڑی

مشکل سے چالیس سال کی عمر میں ہو رہی تھی۔ اسے اپنی بڑائی کہ کہیں شادی ہی نہ رک جائے۔
 ”کیوں میرے دیادے پیچھے نہ گیا۔“
 (کیوں میری شادی کے پیچھے نہ گئے ہو۔)
 ان کا سنائے کا انداز اس قدر مزے کا تھا کہ اس کی آنکھیں اور ہونٹ دونوں ہنس رہے تھے۔ اس ہنسی نے اس کے گلابی چہرے کو مزید گلابی کر دیا تھا۔ آنکھوں سے پانی نکل نکل کر شفاف گالوں کو بھگور رہا تھا اور شاید پہلی بار اسے اپنی توجہ اس پر سے ہٹانی، اس قدر مشکل لگی تھی۔

”پھر شادی ہوئی کہ نہیں۔“
 اسے جان لینے کی جلدی تھی۔ آنکھیں صاف کرنے پر اس نے اسے سامنے بیٹھے دیکھا تھا۔ بظاہر لا تعلق نظر آتے طارق حسین کی طرف مکمل متوجہ۔
 ”ہاں شادی تو ہو گئی، پر ج سوال شادی ایشینڈ کرنے کی بجائے جیل میں بند رہا۔“

اس لیونگ روم میں اپنایت کا جو احساس اس نے محسوس کیا تھا، وہ کبھی کہیں بھی محسوس نہیں کیا ہی تھی، یہاں تک کہ ان کے اپنے گھر میں بھی ایک تکلف کی فضا ہر وقت برقرار رہتی تھی۔ محبت اور سادگی کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا، اسے یہیں اگر پتا چلا تھا۔

 لاہور میں وہ دیر سے ہی اٹھا کرتی تھی، مگر یہاں اگر معمولات تھوڑے بدلے تھے، کبھی دیر سے جاتی، کبھی جلدی جاگ جاتی۔ حنا پیچھونے اسے کبھی کبھی کما نہیں تھا، مگر انب تو دیر سے ہی اٹھتا تھا۔ نہ جانے رات رات بھر جاگ کر کیا کرتا رہتا تھا، رات کے کسی پہر آکھ کھلتی تو اسے لب ٹاپ پر مصوفی دیکھتی۔
 ”پاپا مجھے ایسے شخص سے بچانا چاہتے تھے جو عورتوں کے پیچھے بھاگتا نہ رہے، تو اب اس کے بھی تو وہی کر توت ہیں۔ ساری ساری رات جاگ کر اگر چیٹنگ نہیں کرتا تو کون سے وظیفے کیا کرتا ہے بیٹھ کر۔“
 ابھی بھی اس کی تک تک سے آکھ کھلی تھی۔

سونے کی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ جل کر سوچتے اس نے ذرا سا کمبل ہٹا کر دیکھا۔
 نہ جانے کس بات پر مسکرا رہا تھا، کچھ دیر وہ اسی طرح اسے دیکھتی رہی۔ اس کے سامنے پیچھے ہوئے لب اب مسکرا رہے تھے۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے پہ چھائی بشارت کچھ اور ہی کہانی سناری تھی۔ اس کی سوچیں آتش فشاں کی طرح اس کے اندر آگ لگا کر بھسم کر رہی تھیں۔
 ”کیا یہ تک تک بند نہیں ہو سکتی۔ دماغ کب گیا ہے میرا اسے سن سن کر۔“ جل کر آخر کمرہ ہی دیا تھا اس نے۔ نہ جانے وہ میلی لکڑی کی طرح کیوں سلگ رہی تھی۔

کمبل سے باہر نکلا چرو، تھوڑے بکھرے بال اور اوہ کھلی آنکھیں، وہ کتنی دیر سب کچھ چھوڑ چھاڑ اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ کٹ کٹ کٹ کٹ کی طرح دانت کچکچا رہی تھی۔ وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

دانت تو ایسے نکلے پڑے ہیں جیسے ہفت اقلیم ہاتھ آگئی ہو۔ وہ بھی اسے ٹھوڑے ہوئے سوچے جارہی تھی۔

اس کے مسکرانے یا نہ مسکرانے سے میرا کیا تعلق۔ اس کی سوچ اسے تسلی دے رہی تھی یا غم غلط کر رہی تھی۔

”سوری، میرا نہیں خیال کہ یہ آپ کو ڈسٹرب کرتی ہوگی، کئی بار سوچا لیپ ٹاپ بدل لوں، مگر اس کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ ہر بار ٹاپ دیتا ہوں۔“

وہ اس سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے ان کے درمیان بڑے دوستانہ تعلقات چلے آ رہے ہوں۔ اس کا معذرت خواہانہ انداز خلاف توقع ہی تھا، اس لیے وہ کروٹ بدل کر خاموش ہو گئی تھی۔

”کل ہی چنچ کر لوں گا۔ دراصل دوسرے لیپ ٹاپ یہ کام ہی نہیں ہوتا۔“ اس کی آواز اس کے پیچھے سے ابھری تھی۔

”ہاں بڑا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہو نا جو کام ادھر آگیا تو ”سیا پے“ میں پڑ جاؤ گے۔“ تب کر اس پر

لا حرف بھیجے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔
 آج کل پیچھا کے استعمال شدہ لفظ اس کے دماغ میں چکراتے رہتے۔ سیا پے والا لفظ بھی اس نے ان ہی سے سنا تھا۔ آنکھیں بند کرنے پر بھی نیند نہیں آتی تھی۔ حالانکہ اب وہ کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔

”اگر کچھ نہیں کر رہا تو کیا کر رہا ہے؟“ گھبراہٹ میں وہ اٹھ بیٹھی، عجیب مشکل تھی۔

”کیا ہوا؟ نیند نہیں آ رہی۔“ اس کی گھیسر آواز پر وہ

جلدی سے چپل پہن کر کھڑی ہو گئی۔
 اس طرح اور مشکل تھی، اس طرح اور بید کر اؤن سے نیک لگاتے وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا اور اسی نے اسے کمرہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا، مگر کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا گیا تھا۔ وہ نہ جانے کب اس کے پیچھے چلتا اس کے پاس آگیا تھا۔

”میں کسی اور کمرے میں چلا جاتا ہوں، تم سو جاؤ۔“ وہ ابھی تک اس کا بازو پکڑے اسے روکے ہوئے تھا۔

”میں پانی پینے جا رہی ہوں۔“ اس کی مکمل توجہ ساری نہیں جاتی، بے اعتنائی برداشت نہیں، نہ جانے وہ چاہتی کیا تھی، بازو چھڑا کر اس نے قدم آگے بڑھایا۔

”پاپی یہ رکھا ہے۔“ اس نے اس کے ہاتھ نہ کامنہ بند کر دیا تھا۔ ابھی شام ہی میں تو خود پانی کا جگ بھر کر رکھا تھا اس نے۔ اس نے ایک نظر چمک پر ڈالی اور دوسری اس کے شرمندہ چہرے پر، وہ واقعی اس کی نیند خراب کے جانے پر شرمندہ تھا۔

”میں کالی پینا چاہتی ہوں۔“ نظروں کے ارتکاز پر اس نے رخ موڑتے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

نی الوقت وہ اس کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ابھی تک تو وہ یہی سمجھے بیٹھی تھی کہ وہ اسے نظر انداز کر رہی ہے۔ اسے اہمیت نہیں دیتی اور یہ کہ وہ اتنی ہمت ہی نہیں رکھتا کہ اسے۔ لیکن آج اس کی اس سوچ کی نفی ہو گئی تھی۔ وہ مرد تھا۔ اختیار رکھتا تھا اور

اہمیت بھی رکھتا تھا، اگر چاہتا تو اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔
 باہر نکل کر کتنی ہی دیر وہ لاؤنج میں بیٹھی رہی، کافی پینے کو کس کا فر کاویل چاہ رہا تھا، مگر مانہ گلے پڑ گیا تھا، سو اب پانی پڑ رہی تھی۔

”کیا وہ اس دلو، بے اعتماد دکان دار سے خائف ہو کر کمرے سے بھاگ آئی تھی۔ اپنی کلاس کی سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ، جس کی خوب صورتی مسکور کر دینے والی تھی۔ وہ اس شخص کے سامنے بے بس ہو رہی تھی۔

 طارق حسین کی زندگی اس خوف ناک ایکیسیڈنٹ کے بعد کئی مہینے اسپتال اور پھر گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ”حسین“ کے سارے معاملات امانت علی کے ہاتھ آگئے تھے۔ وہ چپلے سے کسی موقع کی تلاش میں تھا، اس ایکیسیڈنٹ نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ چوری جیسے رجسٹر ہونے والی اس کی لیڈر کمپنی ”حسین“ کے بند ہونے کی بدولت سارے کے سارے آرڈرز ملنے کے بعد سب کی نظروں میں آگئی تھی۔ اکاؤنٹ کے سارے معاملات اسی کے سپرد تھے۔ اس نے کمپنی کا پیسہ اپنی کمپنی میں ایسے والا تھا کہ بستر پر پڑے طارق حسین کو کالوں کا نثر خیز نہ ہو سکی تھی۔

حسین کے علاج اور کمپنی کے کھاتے کلیر کرنے کے لیے قرض لینا پڑا تھا، جو بعد میں مکان بیچ کر ادا کرنے کی بدولت حسین، حنا اور بچے دوبارہ اسی دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں آگئے تھے، جو بہت پہلے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ بچے ابھی چھوٹے تھے، کچھ کرنے کے قابل نہیں تھے اور حسین مکمل طور پر بیوی کی تنخواہ پر گزارہ کرنے پر مجبور تھا۔

یہ وقت حسین اور اس کی فیملی کے لیے امتحان ثابت ہوا تھا۔ سب کچھ گولانے کے باوجود حنا کی حوصلہ مندی، صبر اور قناعت اسے بھی جینے کا حوصلہ دیتے، اسے اپنے مکمل ٹھیک ہونے کا انتظار تھا۔ جب وہ دوبارہ سے کام کرنے کے قابل ہو جائے، وہ امانت اور ہما کو ابھی تک اپنا خیر خواہ ہی سمجھتے تھے اور آخر وقت

تک ایسا ہی رہتا اگر اس کی ملاقات نذرا حسین سے نہ ہو جاتی۔

”فیکٹری سے تمہارا پتالے کریہاں پہنچا ہوں“ عرصے بعد پاکستان آیا تو تم سے ملنے کو دل چاہا، بس تھوڑی دیر دھوپ کرنی پڑی۔“

طارق حسین ٹھیک ہونے کے بعد ج سوال سنگھ کے ساتھ اس کی دکان پر بیٹھنے لگا تھا جو ساڑھ بال میں تھی۔ ج سوال سنگھ انڈیا سے فینسی کپڑے منگوانا تھا اور اس بار اسی کے کہنے پر طارق حسین پاکستان سے کپڑے لینے آیا تھا۔

اب وہ ایک عام شخص تھا جسے فیکٹری کے مالکوں سے ملنے نہیں دیا گیا تھا، مگر نذرا حسین اس فیکٹری کا مینجر تھا جو ریشاڑہ چکا تھا اور اس کے ساتھ طارق کے اچھے تعلقات رہے تھے۔ نذرا اس کو گھر کے اندر لاتے تھوڑا خائف تھا، مگر اب اسے اس طرح ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی، جس طرح وہ اس وقت ڈرا تھا، جس وقت طارق کے آرڈر کو خراب کیا جا رہا تھا۔ اپنے دل پر ابا بوجھ اس نے طارق کو حقائق بتا کر دور کر لیا تھا۔

”ہمانت علی نے تمہارے سارے کاروبار کو تباہ و برباد کر دیا، وہ تمہارا رشتہ دار تو تھا ہی آستین کا سانپ بھی نکلا، جس نے تمہیں ڈس لیا۔ وہ تمہارے ایک سیکنڈ ہنڈ سے بہت پہلے اپنی کمپنی رجسٹر کروا چکا تھا اور پھر یہاں تمہارے آرڈر میں ایسے اجزا جو خطرناک تھے اسی کے کہنے اور لالچ دینے پر استعمال کیے گئے تھے۔“

نذرا حسین سر جھکائے اس پر سارے راز کھول رہا تھا۔ دل کے درد سے بچ جانے والا فدا اپنے دل کا بوجھ لٹکا کر رہا تھا اور طارق پریشانی، حیرت، افسوس اور یقینی کیفیت میں گھر آس کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی یقین کر رہا تھا۔

”بھلا کوئی شخص احسان کا بدلہ بند دیا ہی دھوکے اور فریب کی صورت میں کیسے دے سکتا ہے۔“ لندن جانے کے بعد فدا کی کسی ساری باتیں

تحقیقات سے ثابت ہو گئی تھیں۔ کاروباری حلقے پہلے ہی اس راز سے واقف تھے جس سے وہ ایک عرصے تک ناواقف رہا تھا۔ جتنا کہ سب کچھ بتاتے جتنا کہ وہ تھا اس سے زیادہ حنا تھی۔ کیونکہ اس کا رشتہ بہن کے حوالے سے نازک تھا۔

”اب میں طارق سے کیسے نظریں ملایاؤں گی کہ میری بہن اور بہنوئی نے ایسا کیا۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو مجھے ساری زندگی طے دے کر چھلنی کر دیتا، مگر طارق نے چپ سا دھلی تھی۔“

طارق اور ہمانت کی آخری ملاقات خود انہی نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، جہاں ہمانت نے طارق کی باتوں پر اسے دھکے دے کر اپنے دفتر سے باہر نکال دیا تھا اور انہی ایک دھوکے باز شخص اور اس کی اولاد سے نفرت کرنے لگا تھا۔

باپ کی بے عزتی اسے راتوں کو پریشان کر دیتی۔ ایک مہینے شخص کی کمینگی اور دھوکے بازی نے اس کے ہنس کھ باپ کو سنجیدی کے لہلہ میں ملغوف کر دیا تھا۔ اس نے ”نسب نامہ“ کے نام سے بلاگ لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ بلاگ عموماً ”فیملی، کنڈز“ ریلیشن“ کے ٹاپک پر لکھا کرتا، مشورے دیتا، آہستہ آہستہ اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تھی اور وہ ایک مشہور بلاگ کرین چکا تھا۔

اس کا بلاگ معلومات کا خزانہ ہوتا۔ لوگ اس سے طرح طرح کے مشورے مانگتے، اس کے بلاگ پر تبصرے کرتے، یہی بلاگ اس کی کمائی کا ذریعہ بھی بن گیا تھا۔ اس نے ان ہی بیویوں سے گھر گاڑی طارق کی دکان خریدی تھی اور ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کی کوششوں سے طارق حسین کی جس مزاج پھرے لوٹنے لگی تھی۔

”تو یہ تھا تمہارا وہ کام جو تم تو اسی رات تک بیٹھے بیٹھے کیا کرتے تھے۔“

ٹیسرس پر سرگرم پھونکنے کے بعد وہ ہاتھ روم میں گھس گیا، اب وہ پندرہ بیس منٹ لگا کر باہر نکلتا۔ تناور لیتا، برش کرتا، اتنے عرصے سے کمرے میں ہونے سے

اس کے معمولات سے تو واقف ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے ہیڈ کے سائڈ پر رکھا لیپ ٹاپ اپنے سامنے کرتے اس کی مصروفیت سے آگاہ ہوتے وہ حیران تھی۔ بلاگ لکھتے لکھتے وہ اٹھ کر گیا تھا۔

”نسب نامہ“ اس کے سامنے تھا۔ اس کے فالوئرز کی تعداد دیکھ کر اس کا سانس اور کار اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ وہ روزانہ کی بنیاد پر بلاگ لکھنے والا ایک بڑا بلاگر تھا۔ اسکرول ڈاؤن کرتے اس کے مشورے لوگوں کی تحسین کوگوں کے کھنڈے اس کے سامنے آتے چلے گئے اس کا بلاگ معلومات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ حیرت کی انتہا گمراہیوں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی اور ابھر کر ڈوب رہی تھی۔

فیضان کی رذالت اور کمینگی نے اسے اس کی طرف مائل کیا تھا۔ پھر رضیہ آئی کی باتوں سے وہ پچھتا، پچھو اور اس کے صبر محو ملے اور احسان کی قائل ہوئی چلی گئی تھی اور آج اس کی ذہانت اور اعتماد نے اسے چاروں شانے جیت کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ لیپ ٹاپ پلڑے ساکت تھے اور آنکھیں گہری سوچ کی غماز لگا سا کھٹکا ہوا تھا۔ جلدی سے لیپ ٹاپ رکھتے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ لپٹے، کبل خود پر اوڑھتے، اس نے کبل کی بنی جھری سے اسے باہر آتے دیکھا۔

تو لیے سے بال رگڑتے وہ رفیم چمڑک رہا تھا۔ بلا کا نفاست پسند شخص تھا۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور نی شرٹ میں رات کے ایک بجے سوئے کی تیاری ہو رہی تھی۔ چوری چوری اسے دیکھنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ چوڑے شانے، لہلہ، وہ بہترین شخصیت کا مالک تھا۔ پسلیاں تو ڈر کر باہر آتے دل پر ہاتھ رکھتے اس نے کوٹ بدل لی۔ لائٹ بند کر کے اب وہ بیڈ پر آکر لیٹ گیا تھا۔ لال بھجوا کا چمچے پر پیمینی نرم گرم مسکراہٹ اندھیرے میں جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

”تو مس منت! تم ایک دکان دار کو دل دے ہی بیٹھیں۔“ سوچتے ہوئے اسے ہنسی آئی تھی، مگر ہنسی کا ارادہ موقوف کرتے۔ وہ پھرے سے سوچنے لگی تھی۔

پکنک کا پروگرام اچانک ہی بنا تھا۔ رخ نے بچوں کے ساتھ اچانک دھاوا بولا تھا اور اب انہی کی طبیعت صاف گر رہی تھی۔

”عرصہ ہو گیا تمہاری شادی کو نہ تم خود باہر نکلتے ہو، نہ اسے لے کر جاتے ہو نہ جانے کیسی عجیب طبیعت ہے تمہاری، باہر نکلو، گھومو پھرو، کچھ دکھاؤ، کیا گھر میں بند رہے گی؟“

فریال کو فون کیا تھا، مگر وہ اپنی مصروفیت کی بدولت آنے سے قاصر تھی۔

”تم کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، تیار ہو جاؤ جلدی سے۔“ اس نے منت کو اس کے کمرے کی جانب دھکیل دیا۔ آج وہ کسی کی سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ حد سے زیادہ باتونی اور شرخ تھی۔

”امی، ابو آپ بھی چلیں۔ یہ دونوں ایسے ہی نکلیں گے، ورنہ تو گھر میں ہی پڑے رہیں گے۔“ انہی بھی کچھ دیر کے لیے منتظر سے غائب ہوا تھا۔

پری کی فراک کے ٹخن بند کرتے اس نے طارق حسین اور حنا کو مخاطب کیا۔ طارق حسین نیوز پیپر پڑھ رہے تھے اور حنا دن سے مظہرین رہی تھیں۔

”تمہارے بھائے نکل رہے ہیں، وہ دونوں ہم بوڑھوں کو چھوڑو۔“

طارق حسین نے عینک کے اوپر سے جھانکتے اسے تاکید کی تھی۔

”آج اگر تمہارے ہاتھ میں موبائل دیکھنا تو اسے دریائے ٹیج میں پھینک دوں گی، ایک بھی لمحہ سوچے بغیر۔“ بیجو جینز اور گرے شرٹ میں بلیک کوٹ کے ساتھ اس کا موبائل اس کے ہاتھ میں دیکھ کر رخ نے اسے دھمکایا تھا۔

”ٹھیک ہے امی، ٹھیک ہے۔“ اس نے جلدی سے موبائل جیب میں ڈال لیا۔

”منت! اتم آگے بیٹھو۔“ پچھلا دروازہ کھولتے منت کے ہاتھ رک گئے۔ وہ گاڑی اشارت کیے اس کے بیٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

”ناموں! ہم آؤں کریم کھائیں گے اور جوس بھی

جیسے گے۔“ دایم اپنی فرمائش نوٹ کروا رہا تھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ سفید اور نیلے رنگ کا امتزاج لیے اسٹائلیش سوٹ میں وہ خاموشی سے رخ اور بچوں کو سن رہی تھی۔

”ہم صرف آس کریم کھانے اور ہائیڈارک میں پھرنے تک تمہارے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد ہم چلے جائیں گے، تم دونوں لندن میں کم ہو جانا۔“ بڑی رازداری سے انسب کے کان کے پاس منہ لاکر اسے بتاتے وہ ان سے زیادہ پرجوش تھی۔

”تو پہلا ہائیڈارک ہے۔“ انسب بے اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے گاڑی پارک کرنے تک وہ دونوں بچوں کے ساتھ آگے نکل چکی تھیں۔ نرم پتیلی دھوپ اور شفاف سڑکیں سب کچھ کتنا بھلا لگ رہا تھا۔

سچ ہے کہ سارے موسمِ دل کے موسم ہی سے نمو پاتے ہیں۔ فوارے سے نکلنے موتیوں کو ہاتھ پر سینٹے، رخ کے ساتھ ساتھ چلتے باتیں کرتے، بچوں کو تکیوں کے پیچھے بھگاتے دیکھ کر اس کا دل ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ نہ جانے ان خوب صورتیوں کو دیکھتے کتنا وقت گزر گیا تھا۔

”ہم یہاں سے واک کرتے گھر تک جائیں گے۔“ رخ بچوں کی انگلیاں پکڑے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کا گھر یہاں سے قریب تھا، اس لیے بے فکری تھی۔

”ہمارے ساتھ ہی رہو، شام میں میں خود چھوڑ جاؤں گا۔“ انسب نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں تو اس ساری سیر کے دوران اس کی باتیں سننے ہاں میں ہاں ملاتے رہے تھے۔

”بس ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔“ ڈرامائی انداز میں کہتے اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔

”دیرائے لہیز پر جانا، گارڈز کی تبدیلی دیکھنا۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے واک کرنا۔“ وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ منت نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

”اتنی شاعری کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب دیکھ

لیں گے۔“

انسب نے اس کے مزید فری ہونے سے پہلے اللہ حافظ کہہ دیا تھا۔

رخ اور بچوں کے اترنے کے بعد گاڑی میں ایک دم خاموشی چھا چکی تھی۔ وہ دونوں کبھی کبھار ہی ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے تھے۔ اب بھی وہ سیدھا دیکھتے ڈرامیو کر رہا تھا اور وہ اپنی انگلی میں پستی انگوٹھی کو بلاوجہ تھما رہی تھی۔ اس کی انگلیوں کی حرکات اس کی بے چینی ظاہر کر رہی تھیں۔ گاڑی میں مروانہ پرنیو، ایئر فریشر اور سکرٹ کی بلی جلی خوشبو اس کے حواس پر سوار ہو کر گاڑی کی خاموشی کو مزید پراسرار بنا رہی تھی۔ ”کہاں چلیں؟“

بات انسب نے شروع کی تھی، اس کی انگلیاں اسٹیرنگ و ہیل پر مضبوطی سے جمی تھیں اور آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔

”جہاں دل چاہے لے چلیں، دیے بھی آپ تو دوسروں کو مشوروں سے نوازتے ہیں۔“ اس کے ہونٹوں نے نامحسوس انداز میں جنبش کی تھی اور سر ”کہیں بھی“ کے انداز میں ہل گیا تھا۔

”یہ آکسفورڈ اسٹریٹ ہے، یورپ کی مصروف ترین شاپنگ اسٹریٹ۔“ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لوگوں کا جوم ارد گرد چلتی گاڑیاں، سمنگ بیس، لیکن اس کی نگاہیں تو اس جوڑے پر ٹھہر گئی تھیں جو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

گھنٹوں پر بیٹھا وہ لڑکا جو اس خوب صورت لڑکی کو رد پوز کر رہا تھا۔ وہ دونوں بھی اس وائرے کا حصہ بن گئے جو دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ پرجوش ہوتے اس نے انسب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاں وہ خوش تھی، بہت خوش۔ انسب نے حیرت سے اپنے ہاتھ پر مضبوطی سے جتے اس کے نازک ہاتھ کو دیکھا اور ایک نظر اس کے پرجوش چہرے کو دیکھا، وہ دنیا و مافیاسے بے گانہ لگ رہی تھی۔ لڑکی نے اس کا رد پوز اس کا پھول پکڑ کر قبول کر لیا تھا۔ ہاتھ پکڑ کر چلتے گاڑی میں آکر بیٹھے وہ دونوں ہی جیسے بے خود تھے۔

دیرائے لہیز پر وائٹن بجانے والے بوڑھے کے پاس رکتے پھولوں کا تاج سر پر پہنتے اس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے دیکھتے پہلی بار کم ہوا تھا۔ اس کی خوب صورتی سر پہ تھ کر پڑتی تھی اور انسان کو کسی قاتل نہیں رہنے دیتی تھی، وہ بھی نہیں رہا تھا۔ پلو شاہوں اور ملکوں کی اس سرزمین پر آنے والی شہزادی اس کی دھڑکنیں تک چرالے گئی تھی۔ سر پر جلتنگ بجانے والی یارنس سے بچنے کے لیے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر دونوں نے خاموشی سے بارش کو دیکھا، اسکرین پر گرے دیکھا تھا۔ بغیر کچھ بولے وہ اس بحر میں گم تھے۔

بائیکھم ٹیل میں ہونے والی گارڈز کی تبدیلی دیکھتے وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ وہیں اسے فیضان اپنی طرف آتا دکھائی دیا تھا۔ اس کے ساتھ چلتی نیم عریاں لڑکی۔ اس نے نگاہیں پھیر لیں۔ ساتھ کھڑے انسب نے بھی اس کی نظروں کا تعاقب کرتے انہیں اپنی جانب آتے دیکھا تھا۔

”لیزا تمہیں بہت شوق تھا نا اس لڑکی کو دیکھنے کا۔ یہ ہے میری وہ کزن جو شادی کے بعد بھی مجھ پر نڈا ہے۔ دیکھی ہے تم نے ایسی محبت۔“ اس نے ساتھ کھڑی لیزا کو لوفرانہ انداز میں آنکھ ماری۔ لیزا اس کو اوپر سے نیچے تک گھور رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر انسب کی جانب دیکھا۔

وہ خشمگین لگا ہوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ ”دیے مجھے اس کے ساتھ تمہاری شادی کا بے حد افسوس ہے، بہت افسوس۔“ اس نے پیچ پیچ کرتے جیسے غم کی اتھاہ گھرائیوں میں ڈوبنے کا اظہار کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر انسب کی جانب دیکھا، وہ کچھ بولنا کیوں نہیں۔

”اگر پہلے پتا ہوتا کہ تمہاری شادی۔ اس سے ہو جاؤ گی تو تبھی واپس نہ آتا، خود ہی شادی کر لیتا تم سے۔“ اس نے جیسے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ سنجیدگی کے لبادے میں لپٹی نفرت اہل اہل کر باہر آ رہی تھی

اور ہونٹ تمسخرانہ انداز میں ہنس رہے تھے۔ ”نکو اس، بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ جانے کے قابل نہ رہو۔“ انسب غریبا۔ ”واہ، اتم قبول بھی سکتے ہو اور وہ بھی رکے ب‘ ب‘ ب‘ بغیر۔“ مائی بجاتے وہ منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ ”چلو منت، اب میری ایک پریشانی تو دور ہو گئی۔ اب یہ بول لیتا ہے ایک جیلے میں۔“

ایک قدم آگے بڑھاتے وہ منت کے قریب ہوا، اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اس کے سر پر بچے پھولوں کے تاج کو چھونے کے لیے اس کا ہاتھ آگے بڑھا، مگر چھونے سے پہلے ہی اس کا ہاتھ آہنی ہاتھ کی گرفت میں تھا، جسے پوری قوت سے دباتے انسب نے اپنا پورا غصہ اس پر نکال دیا تھا۔ آہنی گرفت میں اس کی انگلیاں چبکی تھیں۔

”یو ہاٹش۔“ چھوڑو مجھے۔“ اپنی پوری قوت صرف کرنے کے باوجود وہ اپنا ہاتھ چھڑا نہیں سکا تھا۔ ”اگر میں نے دوبارہ تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو اپنے یا اپنے گھر والوں کے قریب دیکھا تو۔“ مائی کے جیلے اس کے ہاتھ نے اس کی زبان میں اوڑھ لیے تھے۔

مغلظات کا ایک طوفان اس کے منہ سے فوارے کی طرح پھوٹا تھا۔ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے دباتے وہ پتھر کھائے ہوئے کتے کی طرح بھونکتے ہوئے اس پر جھپٹا، مگر درمیان میں لیزا آگئی تھی۔

”فیضی، فیضی۔“ تبدیل ہونے والے گارڈز ادھر ہی آرہے تھے۔ لیزا اسے پیچھے کے لے جانے لگی۔ انسب کے ساتھ کھڑی تھر تھر کا پتی منت نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ قد آور اور طاقت ور تھا، مگر متوقع لڑائی کے ٹل جانے سے اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس طرف سے دھیان ہٹتے ہی اس کا دھیان فیضان کی باتوں کی طرف چلا گیا۔

”نہ جانے انسب کیا سمجھ رہا ہو گا۔“ ”میں نے صرف ایک بار اسے فون کیا تھا۔“ شرمندگی سے کہتے جھکا سر مزید جھک گیا۔ ”جیسی وہ



عمادہ خان

پہلے کون

”ارے نہیں نہیں میری بیگم جاب نہیں کرتیں
بھی، ٹوٹی ہاؤس دانف ہیں۔“
جاوید لاؤج میں دوسری بار چائے، پیتے
ہوئے، صوفے پر نیم دراز دوڑن سیدھے ہاتھ کی
کبھی کے نیچے تو ایک کمر کی طرف — پاؤں
صوفے کی کبھی پہ رکھے پرسکون انداز میں اپنے
دوست سے موبائل پر گفتگو میں محو تھا، جبکہ پاس ہی
اتوار کے دن کا فرما سی ناشتہ یعنی حلوہ پوری وہ بھی

گھر کی بنی ہوئی کی مہک پھیلی ہوئی تھی، تو سامنے
میز پر اخبار کے تقریباً سارے صفحات اپنی قسمت پہ
دور ہے تھے۔
”ہاں، تم جب چاہو آ جاؤ یا، میری بیگم کے
ہاتھ میں جادو ہے جادو، ایک بار کھاؤ گے تو یاد
کرو گے۔“
”اچھا، آج آؤ گے؟“
”چلو آ جاؤ بس پھر۔“

”یار! مجھے لندن کے متعلق تمہارا تھمسز نہیں
سننا، تمہارا کوٹ چاہیے۔“ کاش کہ وہ اپنی سوچ کو
لفظوں کا روپ دے سکتی۔
”گھڑی ابھی کتنی دور ہے۔“ اس سے پوچھتے
ہوئے اس نے بازو اپنے گرد لپیٹ لیے۔ وائٹ اب بچ
رہے تھے۔
”مہم تھوڑی دیر لگے گی۔“ اسے جواب دے کر وہ
اپنا کوٹ اتارنے لگا۔
”شاید خیال آ ہی گیا جناب کو۔“ اس کے ہاتھ سے
کوٹ چھین کر پہنتے اس نے ایک بار بھی ٹوکٹ لینے
سے منع نہیں کیا تھا۔ وہ اپنا موبائل بھی اس کے اندر
سے نکال نہیں پایا تھا۔ اس کا تھمہ بڑا جان دار تھا۔
”بہتر پرسکون زندگی نہ شخصیت کی محتاج ہوتی ہے،
نہ شکل صورت کی اور نہ ہی دولت کی۔ ہاں ابھی
انسان ہی زندگی کو بہتر اور پرسکون بناتے ہیں۔“ اس
کے سامنے کھڑا اس کی آنکھوں میں جھانکنے والا شخص
رشتوں کی اہمیت کو جانتا تھا۔ ان کی حفاظت کر سکتا تھا
اور اس کے کردار کو اس نے ایک جھپٹے آئینے جیسا پایا
تھا۔ اسے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں تھی۔
”چلیں۔“ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے اس نے کہا
تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ گھر پہنچ کر اسے ملا پایا
کو فون کرنا تھا۔ اپنی بد تمیزیوں کی معافی مانگنا تھی اور
اس شخص سے بہت کچھ کہنا تھا جو اس کے ساتھ بیٹھا
خواہ مخواہ مسکرا رہا تھا۔
اور مسکراتا وہ بھی رسی تھی۔
بعض باتیں اور چیزیں سامنے ہوتے ہوئے بھی
ہماری نظروں سے اوچل رہتی ہیں، مگر اب سارے
دھندلے منظر صاف تھے، راستہ واضح تھا، دینا اسکرین
پر کرتی بوند بوند بارش دل کی دھڑکی کو سیراب کر رہی
تھی۔

”جو اس کر رہا تھا ایسا کچھ نہیں۔ اس کی خیانت۔“
”مجھے معلوم ہے۔ کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں
ہے۔“ اسے چلنے کا اشارہ کر کے وہ چلنے لگا۔
”ساری عمریں باپ کے ساتھ میری بحث جاری
رہی کہ انہوں نے اتنی آسانی سے اپنا حق کیسے چھوڑ
دیا، کیسے قبضہ کرنے دیا، چیز چھوڑ جانے تو جیسے دھوکا دینے
والوں کو کچھ نہیں کہا، مگر اس کا اور اک تو اب ہوا ہے
کہ دھوکا فریب اور حرام لوٹ کر آپ کے پاس واپس
آتا ہے۔“
وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بول رہا تھا۔ اور وہ پوری
طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔
”الانٹ انکل نے فریب اور دھوکا دینے اپنے
محسنوں کو بھی نہ چھوڑا۔ کاروبار ہتھیالیا۔ ہم پائی پائی
کے لیے ترستے رہے تو ان کے ساتھ کیا ہوا۔“ وہ محفل
بھر کو ٹھہرا۔ اس کی طرف دیکھا اور پھر سے چلنے لگا۔
”ان کی اولاد حلال اور حرام کی تمیز بھول گئی۔ لقمان
نے انکل کو دودھ سے کبھی کی طرح نکال کر کاروبار پر
قبضہ جمایا اور اب وہ دونوں میاں بیوی محتاجوں جیسی
زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور فیضان حلال رشتہ بنانے
کے بجائے وہی تعلق حرام طریقے سے جاری رکھے۔
لیزا کے گلزاروں پہ پل رہا ہے شراب، جوا، عورتیں،
ایسی کون سی برائی ہے جس سے وہ بچا ہوا ہے۔“
اس بات کی تو وہ خود گواہ تھی وہ برائی کو برائی کہیں
سمجھتا تھا۔ دھڑلے سے اعتراف کرتے اسے ذرا برابر
بھی تو شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ
چلتے اس کی خود گواہی سنتے وہ اس قدر کم تھی کہ سڑی کا
احساس ہی نہ ہو سکا۔ مگر اب وہ کچھ باری تھی۔
”ساری ہیرو والی خصوصیات کے باوجود ابھی تک
جھوٹے منہ بھی مجھے کوٹ آفر نہیں کیا۔“ اس نے
گیلے ہوتے کوٹ کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھا تھا۔
”مجھے سڑی لگ رہی ہے۔“ منہ کے اتکا کھنے کے
باوجود وہ کچھ بھی پین کر نہیں آئی تھی نہ کوٹ نہ
سوٹر۔
”لندن کی دھوپ اور بارش ایسی ہی ہوتی ہے۔“



”ہاں ہاں بھابھی اور بچوں کو بھی یاد سے لانا۔“
”ارے بتایا تمہاری بھابھی کی کوئی خاص
مصرفیت نہیں ہے وہ کیوں برائیاں کی؟ پورا دن گھر
پر ہی ہوتی ہیں۔“

”اب دیکھو تم اجنبیت برت رہے ہو یا! آخر
میں تمہارا بچپن کا دوست ہوں، اتنا حق ہے میرا۔“
”بس بس زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں اب۔“
”میں انتظار کر رہا ہوں، ایک اتوار تو ملتا ہے جو
اپنا ہوتا ہے، اس دن کوئی اپنا مل جائے تو سونے پہ
سہاگہ نہ ہو جائے۔“

”ہاں یہی نایاب، ڈن ہوا پھر۔“
”کچھ لانے کی ضرورت نہیں جگر۔ تیرا ہی گھر
ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، اللہ حافظ۔“
لاؤنج کے در دیوار کے ساتھ ٹمن نے بھی یہ
ایک طرف گفتگو چکن میں برتن دھوئے ہوئے بخور سی
اور ایک چٹکی سی مسکان لیوں پہنچ گئی۔
”بے شک میں ایک ہاؤس وانف ہی تو ہوں،

در رنگ دو من نہیں، پورا دن صرف گھر ہی تو دیکھنا
ہوتا ہے ساتھ ٹمن بچوں کو اور سسرال میکے کا آنا جانا
بس اور کسی قسم کا کام نہیں کرنا پڑتا، واقعی میں خوش
نصیب ہوں جو جاوید نے جاب نہیں کرنے دی
لیکن ہو سکتا ہے اگر کرنے دینے یا میں کہیں کام کر لی
تو شاید ان ہی سب کاموں کے تیس چونتیس ہزار مل
جاتے ساتھ ایک میڈل بھی در رنگ دو من کا، واقعی
معاشرے میں، میرا مقام ایک باعزت عورت کا
ہے، جو اپنے گھر میں سکھ سے میاں بچوں کے ساتھ
بیٹھی ہے۔ تو کیا ہوا جو ایک اتوار بھی اس کا اپنا نہیں۔

تو کیا ہوا جو ہفتے کے باقی دنوں کے بعد ایک
اتوار کو بھی آرام میسر نہیں اور نہ ہی اس ایک لفظ سے
مستفید ہو سکتی ہوں کچھ چھٹی ہے،
ٹمن نے دوپہر کے لیے بریانی بنانے کے

سامان پہ بھی ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالی واشنگ ایریا
کی طرف بچوں کے میلے یونی فارم بھی پڑے اسے
یاد دل رہے تھے کہ ابھی ہم بھی پڑے ہیں راہوں
میں۔

دوسری طرف جاوید نے مکتلتاے ہوئے
موبائل سائیڈ میں رکھا اور پرسکون انداز سے
زوردار انگڑائی لیتے ہوئے من کو آواز دی۔
”ٹمن ڈارلنگ سنتی ہو۔“ موقع کی مناسبت
سے مناسب مقدار میں شہد گھلے لہجے میں آواز
گئی۔

”جی؟“ ٹمن نے بھی انخان بن کے پوچھا۔
”وہ یا رامیر ایک دوست کھانے پہ آرہا ہے، تو
مجھے لسٹ بنا دو کیا کالانا ہے۔“

”جاوید! آج مجھے امی کی طرف جانا تھا، پچھلے
اتوار کو بیچ آرہا تھا، تب آپ نے کہا تھا اگلے اتوار کو
لے جاؤں گا۔“ ٹمن نے کچھ ہوئے لہجے میں یاد
دلانا چاہا۔

”تو کیا ہوا یا، اگلے اتوار کو سہی، یا ایسا کرنا
کسی دن بیچ میں پروگرام بنالینا۔“ جاوید نے
شرمندہ ہوئے بغیر بات ختم کی۔

”کل سے زونیا اور عامر کے پیپر ز شروع ہیں،
آپ کو بتایا بھی تھا اور یہ اسکول والے پورے چدرہ
میں دن نکال دیتے ہیں پانچ پیپر ز میں ہی۔“ نہ
چاہتے ہوئے بھی سن کا لہجہ بھگ گیا

”بس اب سوئے نہ بہانا شروع ہو جانا ٹمن۔
اب تم کوئی ٹین ایج لڑکی تو نہیں جو ہاسٹل میں رہتی
ہے کہ پچھٹی ملنے ہی امی کی طرف دوڑی جائے، حد
کر لی ہو۔“ جاوید نے ٹمن کی طرف افسوس اور
ملاتی نظروں سے دیکھتے ہوئے سر جھکا۔

”امی نے پورے ہفتے انتظار کیا ہوگا میرا آپ
کو ذرا احساس نہیں ہے، اس بڑھاپے میں اگلی
بہنی کا انتظار کتنا جان لیوا ہوتا ہے ان کے لیے، ٹمن
نے بھرائی ہوئی آواز میں شکوہ کیا۔

”کیا بچوں والی باتیں کر رہی ہوں تم بھی ٹمن۔ یہ
کوئی وقت ہے ایسی بحث کا یا تم کوئی نئی تیاریاہ کے
آئی ہو جو ہر ہفتے حاضری لگاتی ہے، ایک اتوار نہیں
بھی جاؤ گی تو کوئی طرفان نہیں آجائے گا؟

حد ہوگی سالوں بعد کوئی دوست کے نام پہ گھر
آ رہا ہے، بیگم صاحبہ کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔
جاوید بڑبڑاتے ہوئے بائیک کی چابی ڈھونڈنے
میں مصروف سا ہوا۔

”تو آپ کو مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا کوئی
پروگرام میٹ کرتے ہوئے، آخر میں بھی گھر کا حصہ
ہوں، فرد ہوں اور وہ سو کا لفظ ہاؤس وانف بھی
ہوں۔“ ٹمن نے ایک دم چڑ کے ریک سے بائیک
کی چابی اٹھا کے جاوید کے سامنے پختے ہوئے کہا۔
”بیک بک کرالو تم سے جتنی مرضی، ایک اتوار
کا دن ملتا ہے مجھے، اس میں بھی آدھا تم سے بحث
میں نکل جاتا ہے۔“

”تو یہ آپ کو خیال کرنا چاہیے کہ ایک۔ ایک اتوار
کا دن ہوتا ہے آپ کے پاس اپنی فیملی کے لیے
جس میں آدھا دن سوئے اور آدھا دن منت
ساجت میں نکال دیتے ہیں آپ۔“

ٹمن نے بھی اچھی طرح پچھلے ہفتے کا غصہ باہر
نکالتے ہوئے آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

”اچھا میڈم ٹمن، آپ فرمائیں کیا منع کر دوں
فیصل کو؟ اور کیا بول کے منع کر دوں آج میری بیگم
نے اپنے میکے جانا ہے تو ہمارے گھر کر فو ہے، کوئی
نہ آئے، بس شادی کو تیار سال ہی تو ہوئے ہیں۔
لیکن ہماری بیگم کا دل ابھی بھی اپنے میکے میں ہی
ہے۔“

جاوید کا نہ صرف لہجہ خراب ہو چکا تھا بلکہ اب وہ
عورتوں کی طرح طعنے دینا بھی شروع ہو چکا تھا۔

”آپ سے تو بات کرنا ہی بے کار ہوئی جا رہی
ہے، کبھی تو کسی مسئلے کا حل نکالا کریں بجائے طعنے
دینے اور بات کا پتھر بنانے کے، ٹمن ہاؤس چھٹی
چکن کی طرف چلی گئی اور جاوید کے ماتھے کے ان

گت بل ہٹا رہے تھے اس ہفتے بھی امی کی طرف
جانا کھٹائی میں ہی پڑ گیا ہے۔

”ایک چھٹی کا دن ملتا ہے وہ بھی اس عورت
کے چکر میں ضائع ہو جاتا ہے۔“ جاوید نے
بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر جانے میں عافیت جانی۔
”فیصل مناسب نہیں لگتا اتوار کے دن کسی کے
گھر لے جانا، ایک بار پھر سوچ لیں آپ، مہوش
نے دبے دبے لہجے میں تیسری بار اپنی بات
دہرائی۔

”ایک تو میں تمہاری بحث کی عادت سے بہت
چڑتا ہوں مہوش! جب بتا رہا ہوں، اتنے مان سے
بلایا ہے اس نے تو اب کیا کہوں یہ کہ میری بیگم کیونکہ
ایک در رنگ دو من میں اتنا تو ان کا خیال ہے جیسے وہ
اتوار کو میکے جانا فرض سمجھتی ہیں اسی طرح تمہاری
بیوی بھی سمجھتی ہوگی، تو ہم پھر بھی مل لیں گے۔“

”تو غلط کیا ہے اس میں؟“ مہوش نے برائے
ہوئے ہوا اور چکن کی طرف رخ کیا۔

”ارے بابا، اس کی بیوی ہاؤس وانف ہے،

پورا دن گھر پہ ہی ہوتی ہے، ضروری ہے کہ اسے
تمہاری طرح ایک اتوار ہی ملتا ہو، میکے جانے کے
لیے۔“

”لیکن پھر بھی، گھر کے پچاس کام رکے ہوتے
ہیں، میرے بھی اتنے کام پینڈنگ ہیں، آپ کو
معلوم تو ہے، مہوش کی پوری کوشش بھی آج کا دن
کہیں آنے جانے میں ضائع نہ ہو، بلکہ وہ آج نئے
آنے والے مہمان کے لیے کچھ شاپنگ کرنے کے
ساتھ، گھر کی ضروری صفائی بھی کرنے اور لگے
ہاتھوں شام میں آنے والے پورے ہفتے کے لیے
ٹمن چار سان بھی پنا کے فریز کر سکے۔ کیونکہ روز
سیات بجے جب وہ فیصل کے ساتھ گھر واپس آئی
تھی تو تیارہ کھانا پکانا اس کی ہمت سے آگے کی چیز
ہو جاتی تھی، جاب چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا کہ فیصل
کی خواہ سے مکان کا کرایہ ادا کرنے کے بعد صرف

UHU® super glue

اب توڑ کے دکھاؤ



**instant bond
super
glue**

UHU® super glue

A Product from Germany

www.uhu.com facebook.com/uhupakistan

شاید میں کوئی ہیلب کرا دیتا، اب کوئی ماسی نہیں ملتی
شام کو، اس میں میرا کیا قصور ہے، پورے ہفتے باسی
کھانا کھاتا ہوں، اپنے ایمان سے بتاؤ کبھی شکوہ کیا
تم سے، نہیں نا، کیونکہ مجھے معلوم ہے ابھی پوزیشن
ایسی نہیں تم جاب چھوڑو، پھر کچھ ہی وقت کی بات
ہے، ہمارا بچہ ہوتے ہی تم نے گھر ہی بیٹھنا ہے اور
پھر مجھے تازہ کھانے بھی مل جائیں گے۔“ فیصل نے
اپنی طرف سے تسلی دیتے ہوئے مہوش کے رخسوں پہ
نمک چھڑک دیا۔

”سبحان اللہ، ابھی بھی آپ کو تازہ کھانے اور
باسی کھانے کی پڑی ہے، آپ کو یہ نظر نہیں
آتا، پورے دن کی نوکری کے بعد سیدھا بچن میں
کھتی ہوں اور ایک چمٹی ملتی ہے مجھے بھی آپ کے
ساتھ لیکن اس دن بھی ادھا وقت بچن کی نذر ہو جاتا
ہے۔ مہوش رونا بھول گئی۔“ آپ تو سارا دن سکون
سے لیٹ کے اپنی ٹھکن اتار لیتے ہیں اور میں،
میرے لیے ذیل کام انتظار کر رہا ہوتا ہے کیونکہ
آپ کو گھر کے کام کرنے نہیں آتے۔ مہوش نے
رندھے ہوئے لیچے میں کہہ کر فیصل کو دیکھا اور ترچھی
نگاہوں سے بیڈروم کا حال دیکھا۔

”واہ اب تم مجھے اپنی کمائی کے طعنے دو گی مہوش
بیگم؟ کیا میں اکیلا وہ لائٹ اور گیس استعمال کرتا
ہوں جن کے بل تم بھرتی ہو؟ کیا تم اس چھت کے
نیچے نہیں رہیں جس کا کرایہ میں بھرتا آیا ہوں اتنے
سالوں سے، میاں بیوی گاڑی کے دوپٹے ہوتے
ہیں، جیسے میں کام کرتا ہوں، تم بھی کرتی ہو، اس
میں احسان کس بات کا جھاڑ رہی ہو۔“

”احسان نہیں جھاڑ رہی، آپ کو احساس دلانے
کی کوشش کر رہی ہوں، انسان ہوں میں اور اس
حال میں ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں آپ کا ساتھ
نبھانے کی، لیکن بس اب تھک گئی ہوں، نہیں
ہوئیں دو دو نو نو کرایاں مجھ سے، گھر کی نوکری پھر باہر
کی نوکری۔“ مہوش نے اچانک روتے ہوئے بات
ادھوری چھوڑ دی۔

”اف اب اس میں رونے کی کیا بات ہے، تم
کو معلوم ہے یہ گھر در کے کام مجھے نہیں آتے ورنہ
☆

مکمل ٹاول

تاجدنگاہ پھیلے کھیتوں پہ اتری دھند کو صبح کی نرم
کرنوں نے عجیب اسرار بھرا حسن عطا کر رکھا
تھا۔ پرندوں کی چکار، چکی کی گھول اور فضا میں
گھلتی تازہ روٹیوں کی مہک زندگی کے بیدار ہونے کا
پہاڑے رہی تھی۔
کچے آنکھوں میں عورتیں اپنے گھر والوں کے
ناز و نغمے اٹھا رہی تھیں اور بے چارے کنوارے کسی
نازنین کے ہاتھوں کے نرم پچھے دار پرائیڈ اور
محبوبوں سے بلو کی گئی لسی کا ارمان دل میں
بسائے، تند و درولی ماسی زیتون کے سخت کھر درے
ہاتھوں کے موٹے موٹے پرائیڈ کھانے یہ مجبور
تھے۔ مگر پھر بھی ان کی امید جوان، تھپتھپے بے فکر اور
حالات حاضرہ پہ بحث گرنا گرم تھی۔ سادگی سے بھرا یہ
پُر خلوص ماحول یہاں کی ہر صبح کا خاصہ تھا۔
وہ بھی اپنے معمول کے مطابق سویرے ہی
در بار چلا آیا تھا۔ خادم سے حال احوال پوچھ کے اس
نے وسیع صحن میں پانی کا چھڑکا دیا اور ایک کونے میں
رکھی جھاڑو اٹھا کے وہاں کی صفائی کرنے لگا۔ یہ صفائی
نہ تو اس کی ذمہ داری تھی اور نہ ہی اس کی ضرورت۔
مگر اب پچھلے کچھ مہینوں سے اس کی ہر صبح کا آغاز
یہیں سے ہونے لگا تھا جو اس کی اس جگہ سے بڑھتی
ہوئی عقیدت کا ثبوت تھا۔

مہوش افتخار



"اچھا بزرگو، میں چلا۔" صفائی ختم کر کے اس نے محن سے ہی اندر بیٹھے خادم کو آواز لگائی اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں سے نکل کے اس کا رخ اسے گھر کی طرف ہو گیا تھا، جو اس گاؤں کی آخری دو گلیوں میں موجود گھروں میں سے ایک تھا۔

گھر میں آ کر وضو کر کے اپنے دھیان میں اٹھ کے پلٹا تو اپنے پیچھے اپنی بیوی کو کھڑا دیکھ کے لحظہ بھر کو ساکت رہ گیا۔

"ناشتہ بڑا واں؟" (ناشتہ بناؤں؟) اس نے

سپاٹ لہجے میں استفسار کیا تو اسے چند لمحے لگے اس بات کا یقین کرنے میں کہ اس کی بیوی نے کچھ نہیں دیکھا۔

"میں کی پیچھے رٹی آں؟" (میں کیا پوچھ رہی ہوں؟) وہ ماتھے پہ ہل لے گیا ہوئی۔

"ہاں۔" وہ اپنی گھبراہٹ چھپاتا، تار پہ جھولتے تولیے کی طرف بڑھ گیا۔ ہاتھ منہ خشک کرتے ہوئے اس نے دزدیدہ نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا جو چھپر تلے بے باورچی خانے میں، مٹی کے چولہے کے سامنے جا بیٹھی تھی۔ سکھ کا سانس لیتے ہوئے وہ بھی وہیں چلا آیا تھا۔

"کی گل اے اپنی چپ کیوں ایں؟" (کیا بات ہے۔ اتنی چپ کیوں ہو؟) اس کے مقابل چوکی سنبھالتے ہوئے اس نے ایک گہری نظر اپنی بیوی کے چہرے پہ ڈالی جو خلاف معمول خاموشی سے اس کے لیے روٹی بنا رہی تھی۔

"نیوں کی۔ تو جا کے کھے پاڑیں سراج دی تے ساڑے دی۔" (تمہیں کیا۔ تم جا کے مٹی ڈالو، اپنے سر میں بھی اور ہمارے بھی۔) روٹی پہ نظریں جمائے وہ سچے بولی تو وہ بے اختیار الجھ گیا۔

"اوج پتادی تو پلے؟" (ہاں جیسے تجھے تو کچ بٹای نہیں۔) اس نے

چمک کے ہاتھ میں پکڑا بیلن بٹایا۔ "آیا تھا تیرا ماما (ماموں)۔ دس گلاں کڈ کے (گالیاں نکال کر) گیا اے۔ تجھے دی اور مجھے دی۔"

"نا ماسے کو کیا تکلیف اٹھی ہے؟" اس نے تیوریاں چڑھائیں۔

"دبی جو سب کو ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تیری اس دیوانگی کا کیا علاج کروں۔ ادجہ کیا کم تھا ہمارے منہ پہ کا لک تھوپنے کے لیے جو تو اب روز ان مسلوں (مسلمانوں) کا تھڑا بونٹے (پونچھے) پہنچ جاتا ہے؟ تیری کیوں مت (عقل) ماری گئی اے

کبیرے؟" مارے بے بسی کے اس کی آواز جھنجھلا اٹھی تھی۔

سکبر سنگھ نے ایک خاموش نظر اس کے جھلائے ہوئے چہرے پہ ڈالی۔

"دیکھ بلوتے۔۔۔"

"دیکھنے کی مجھے نہیں تھوڑ (ضرورت) ہے کبیرا۔ یہ پیش دیکھ۔" اس نے اس کے گڑی میں چھپے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بگ (پٹری) یہ کڑا دیکھ۔" اس نے اس کی کلائی تھامی۔ "تو کیوں پل گیا ایں کہ تو کون ایں؟" (تم کیوں جھول گئے ہو کہ تم کون ہو؟)

"او میں کج نہیں پلا (نہیں بھولا)۔ گل صرف انی اے (بات صرف اتنی ہے) کہ مجھے شاہ صاحب کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ان کی خدمت کر کے سکون ملتا ہے۔ اور پھر دانے گرد جی نے بھی تو کہا ہے تاکہ اچھی مت (عقل والی بات) جہاں سے بھی ملے سمیٹ لینی چاہیے۔ اب اس میں کون سی گناہ والی بات ہے؟"

"گناہ والی نہ سہی شرمندگی والی بات ضرور ہے۔ ہم سب بھی ان کی عزت کرتے ہیں لیکن تو نے تو حد بکا (ختم) دی ہے۔ سارا خاندان تھو تھو کر رہا ہے۔ گردوارے کی میڑھیاں دیلے دے ویلے (وقت

کے وقت) چڑھنے والا روز سستی سویرے (صبح سویرے) دربار پہنچا ہو تو لوگ تو کہیں گے نا کہ وچوں (در حقیقت) مسلمان ہو گیا ہے۔"

"ایویں کہیں گے۔۔۔ اور ایک بات بتا۔ میں مسلمان ہوں یا سکھ مردوں، کسی کو کیا تکلیف ہے؟ یہ میرا اور میرے رب کا معاملہ ہے۔"

"جی نہیں۔ یہ میرا اور میرے اکو اک پتر (بیٹے) کا دوی معاملہ ہے۔ یہ ہماری نسل، ہمارے دھرم کا دوی معاملہ ہے۔" بلونت کو تیز ہوئی۔

"ہاں تو جا نبھا اپنا دھرم۔ لیکن میرے معاملے میں کسی کو بولنے کی لوڑ نہیں (ضرورت نہیں)۔"

"چنگا فیر (ٹھیک ہے بھر)۔ مگر میرے پتر کو دوبارہ اپنے ساتھ وہاں لے کے نہ جائیں۔" وہ تنک کے بولی تو کبیر کے چہرے پہ غصہ پھیل گیا۔

"وہ میرا پتر، میری نسل ہے۔ میں اسے جہاں چاہوں گا وہاں لے کے جاؤں گا۔ تو برداشت کر سکتی ہے تو کر۔ نہیں تو اپنے چاچے کے گھر چلی جا۔" آنکھیں نکال کر وہ ایک جھٹکے سے اس کے سامنے سے اٹھ گیا تو اس کے لہجے کی بیجاگی بلو کو ایک لمحے کے لیے ساکت کر گئی۔ کاش کہ ماں باپ کا مان بھرا سایہ اس کے سر پہ قائم ہوتا تو وہ اپنی ذات اور اپنی بات میں جھوٹا وزن پیدا کرنے کو ہی یہ گھر چھوڑ جاتی۔

لیکن اب تو وہ تنکے سے بھی زیادہ ہلکی اور بے وقعت تھی۔ بھائی کوئی تھا نہیں۔ بس بہنیں ہی بہنیں تھیں۔ جو دور قریب اسی کی طرح اپنی اپنی زندگیوں میں کبھی بیٹھی تھیں۔

کم مائیگی کا احساس اس کی آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ پلو میں منہ دیے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

☆☆☆

"صف بی بی، چائے کے لیے یہ والا سیٹ ٹھیک رہے گا؟" ملازمہ ہاتھ میں آف وائٹ رنگ کا کپ

اٹھائے کچن میں مصروف صدف کے پاس آئی تھی۔ اس نے بل بھر کو نظر اٹھائی۔

"ہیچ! ارے نہیں فضلی۔ وہ جو شاہ بی بی نے نیا سیٹ منگوایا ہے نا، وہ نکالو۔" اس کی ہدایت یہ جہاں فضیلت سر ہلاتی واپس پلٹی تھی وہیں اندر آئی معصومہ شاہ کے لیوں پہ بڑی استہزائیہ مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔

"نا نکالو یا پرتا، نتیجہ تو وہی نکلتا ہے۔" "اللہ نہ کرے بھر جاتی۔" صدف نے ناگواری سے انھیں ٹوکا۔ معصومہ نے بغور دیورانی کا انداز

ملاحظہ کیا اور سلیب سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئیں۔

"جب انسان نے گل ہی ایسے کھلا رکھے ہوں تو اللہ کیا کرے میری بہن۔" وہ سینے پہ ہاتھ باندھے خطا اٹھاتے لہجے میں بولیں۔ تو صدف اس فضول گوئی پہ انھیں دیکھ کر رہ گئی۔

"استغفار۔" یہ آواز بلند کبھی وہ سامنے رکھی مرغی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تمہارے استغفار پڑھنے سے کیا فرق پڑتا ہے بی بی۔ دعا کرو خدا آنے والوں کی عقل پہ پردہ ڈال دے تاکہ وہ اس گناہوں کی گھڑی کو ہمارے سروں پہ سے اتار لے جائیں۔۔۔ اس کی خاطر کیسا کڑوا کھوٹ پینا پڑا ہے اس کے بھائیوں کو، یہ وہی جانتے ہیں۔ یہ پہلی لڑکی ہوگی اس خاندان کی جس کے لیے باہر کے سیدوں میں رشتہ دیکھا جائے گا۔ کیونکہ خاندان میں تو اسے کوئی پوچھنے کو تیار نہیں۔" ان کی بات نے صدف کو سرتاپا سلگا کے رکھ دیا۔ لیکن بظاہر اس نے گل سے سراٹھایا۔

"سوائے آپ کے بھائی کے، جو اس گناہوں کی گھڑی کو اپنے سر پہ لا دینے کے لیے سالوں سے بے چین پھر رہے ہیں۔" صدف کے بیٹھے طنز پہ معصومہ گڑبڑا کے سیدھی ہوئیں۔

"میرے بھائی کی منگ تھی زرناب۔ جسے چاہا جی نے اپنی ضد میں آکر توڑا۔ ارے یہ تو ہاشم کی شرافت اور سنگی کی انتہا ہے جو وہ اس لڑکی کے ایسے کرکوت کے باوجود اسے اپنے نام کی چادر پہنانا چاہتا ہے، صرف اس لیے کہ وہ ہمارا اس اونچے نام و مقام والے خاندان سے بدنامی کا یہ داغ نہیں دیکھ سکتا۔ مگر نہ جی۔ اس کی قربانی کی تو کوئی قدر ہی نہیں۔ باہر کی خاک چھانسنے پر اتر آئی ہیں یہ ماں بیٹیاں۔" انھوں نے تقریر سے سر جھٹکا۔

"تو کون کہہ رہا ہے انھیں اتنی بڑی قربانی دینے کو؟ ایک بیوی کو تو وہ خیر سے فارغ کر چکے ہیں۔ اب بچوں کا احساس کرتے ہوئے کوئی نیک شریف سی ماں لائیں۔" صدف کے استہزائیہ انداز پر معصومہ نے پہلو بدلا۔

"ویسے بھی ٹوٹی وہ چیز ہے بھر جائی جو کبھی بڑی ہو۔ تایا بی نے تو زرناب کے لیے ہاشم بھائی کا رشتہ بھی قبول ہی نہیں کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ تائی جی بھی اس رشتے کو جوڑنا نہیں چاہتیں، جسے ان کے مرحوم شوہر نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ زرناب کو بھلانا شاید ہاشم بھائی کے بس میں نہیں۔" اس نے آخر میں اپنا لہجہ قصداً نرم آمیز بنایا تو معصومہ کے سر پہ لگی اور پیروں پہ بھیڑی۔

"ہونہہ! بڑی حور پری ہے نا تمھاری زرناب جو میرا شہزادوں جیسا دیراسے بھلا نہیں پایا۔ اٹھائیس سال کی ہو چکی ہے، وہ بھی اور تم بھی۔ ہم دو بچوں کی ماں ہو اور وہ اب تک در بدر خاک بسر۔ اور ان شاء اللہ اسی طرح رہے گی۔ ناواقفیکہ یہ لوگ ہاشم سے معافی نہیں مانگتے اور اپنی غلطی کا ازالہ نہیں کرتے۔" ان کا لہجہ اب مغرور ہو چلا تھا۔

"خدا سے ڈر کر بات کریں بھر جائی۔ آپ کی اپنی بھی ایک نہیں دو دو بیٹیاں ہیں۔" صدف کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

اپنی عزیز از جان سہیلی جو اس کی تایا زادی نہیں بلکہ نندہ بھی تھی، اس کے لیے یوں منہ بھر کے بربادی کی بددعا میں سنا، اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"خبردار! جو میری بیٹیوں کا مقابلہ اس بے شرم۔۔۔"

"معصومہ! زبان سنجال کے بات کرو۔" یک لخت کچن میں بی بی نور بانو کی سخت آواز گونجی تو دونوں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں ان کی ساس کھڑی تھیں۔ لیکن مقابل بھی معصومہ شاہ تھیں، دو دھاری کٹوار۔ بحال ہے جو اپنے الفاظ پہ ذرا سی بھی گھبراہٹ یا ندامت محسوس ہوئی ہو۔

"ہونہہ! ہم زبان تک سنجالیں اور آپ سے ایک بیٹی نہ سنجالیں گی۔ کیا کہنے بھی۔" وہ تیر چلائی، تنگنائی ہوئی ان کے پاس سے گزر کے باہر نکل گئیں تو صدف نے گھبرا کے اپنی تائی جی کی طرف دیکھا جن کا چہرہ اس وار پہ سفید پڑ گیا تھا۔

وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی تھی۔

"تائی جی۔ پلیز تائی جی۔" ان کی آنکھیں ہیکیتی دیکھ کر اس نے سرعت سے انھیں خود سے لگالیا تھا۔ اور وہ بے اختیار ہیمچک کے رو پڑی تھیں۔ صدف نے نچلا ب دانتوں تلے دبائے بہ مشکل تمام اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا تھا۔

"صبر تائی جی۔ صبر!" اس نے ان کی پشت سہلائی تھی۔

"ہور کتنا صبر کروں پتر۔ یہ آزمائش تو میری جان لے، لے گی۔" وہ سکتے ہوئے بولیں تو صدف نے ان کو نرمی سے خود سے ملیدہ کیا۔

"اگر آپ نے ہمت ہادی تو زری کی ڈھال کون بنے گا تائی جی؟" اس نے ان کے ہاتھ تھامے۔ "ہم سب کو، خاص کر زری کو ابھی آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ بس اللہ سے دعا کریں کہ وہ زرناب کا برا چاہنے والوں کو اس کی ایسی خوشیاں

دکھائے کہ وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں۔"

"آمین۔ شہ۔ آمین۔" وہ دل کی گہرائیوں سے گویا ہوئی تھیں۔ "جاؤ جا کے زرناب کو دیکھو، تیار ہوئی ہے یا نہیں۔"

"ابھی جاتی ہوں۔ آپ بھی کپڑے تبدیل کر لیں۔" وہ دھیرے سے مسکرائی تو بی بی نور بانو اک بوجھل سانس لیتی اپنے کمرے کی چل دیں۔

صدف سڑھیاں پڑھ کے اوپر زرناب کے کمرے میں چلی آئی۔

"زری کی بچی! تم ابھی تک فریش بھی نہیں ہوئیں۔" تیز قدموں سے چلتی اس نے آگے بڑھ کے بیڈ پہ نیم دراز زرناب پہ سے چادر پھینکی تو اس نے تیزی سے آنکھوں پر رکھا بازو دھرایا۔

"کیا تکلیف ہے تمھیں؟"

"یہی کہ فوراً سے پیشتر اشو اور ہاتھ دوم جاؤ۔ آپ کی کافون آیا ہے، وہ لوگ بس آدھے پونے ٹھٹھے میں بیٹھنے والے ہیں۔"

اپنی بہن، شمع کا حوالہ دیتے ہوئے، وہ زرناب کی الماری کی طرف پلٹی تو وہ آہستگی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی جھکی جھکی سی نگاہیں کھڑکی سے جھانکتے نیلے آسمان پہ جا گھبریں۔

"یہ والا کیا رہے گا؟" چند لمحوں کی چھان پھٹک کے بعد وہ سرخ اور سفید استرجاج کا پلکی سی کڑھائی والا سوٹ لیے اس کی طرف مڑی تو زرناب کی بے تاثر نظریں صدف کے چہرے پہ آ گھبریں۔

"کوئی فائدہ ہے اس سب کا؟" اس نے ساٹ لہجے میں سوال کیا تو صدف کا رنگ ایک پل کو ہکا پڑ گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ خود کو سنبھالتی مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔

"کیوں نہیں؟ تم کو دیکھ کر بھلا کون کا فرانکار کر سکتا ہے؟"

"مگر میرے بارے میں سن کر ضرور انکار کر سکتا

ہے۔" اس نے لحظہ بھر کو رک کر صدف کی آنکھوں میں دیکھا۔ "ہمیشہ کی طرح۔"

"ایسے مت کہو۔" صدف بے بسی سے اسے دیکھتی اس کے قریب آ بیٹھی۔ "اللہ نے چاہا تو اب کی بار ایسا کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ آپ کی بہت اچھی سہیلی کی نیکی ہے۔ اسلام آباد کی روشن خیال اور پڑھے لکھے سید لوگ ہیں۔ وہ نہ تو ہمارے کسی ملے والے کو جاننے ہیں اور نہ ہی انھیں کسی سنی سنی انصاف گوئی سے کوئی سروکار ہے۔"

"جب میرے اپنے خاندان والوں کو ان فضول باتوں سے سروکار ہو سکتا ہے تو غیر دل کو کیوں نہیں؟"

"انھیں کچھ پتا چلے گا تب ناں۔"

اس کی بات پہ زرناب زہر خند سا مسکرائی۔ "بے فکر رہو۔ جنھوں نے ہر مرتبہ یہ کارنامہ انجام دیا ہے ناں۔ وہ اب کی بار بھی یہ کام احسن طریقے سے کر لیں گے۔"

"ہاں تو کرنے دو۔" صدف نے تیوریاں چڑھائیں۔ "بات اس بار آپ کی ہے ہاتھ میں ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ اگر ایسی کوئی ذلت ہوئی بھی تو وہ سب سنبھال لیں گی۔ اللہ نے چاہا تو منہ ٹوٹ کر رہ جائے گا، معصومہ اور اس کے کہنے بھائی کا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے زرناب کا ہاتھ تھاما۔ "تم بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور دعا کر دو کہ اگر اس رشتے میں تمھاری بھلائی ہے تو یہ کام ضرور ہو جائے۔ جانتی ہو بہت مشکل سے وہاں شمع نے سلمان بھائی کو اور یہاں تائی جی، شاہ بی بی اور امی نے مل کر قاتل کیا ہے بھائی اور صبور کو، ورنہ یہ لوگ خاندان سے باہر کے لیے کہاں ماننے والے تھے۔"

"کیا ضرورت تھی اتنے پاؤں بیٹنے کی۔ شاہ بی بی بھی تو ہیں ناں۔ ان کی طرح میری بھی زندگی کسی طور گزر رہی جائے گی۔" اس نے سر جھٹکا۔

"شاہ بی بی کے پاس ماں باپ کے بعد پیرسید
نظر حسین شاہ جیسا بھائی تھا۔ جنھوں نے ہر آن انھیں
دنیا کے سرد گرم سے محفوظ رکھا۔ انھیں بوجھ بکھ کے
کسی ایسے ویسے کے حوالے نہیں کیا۔ تمھارے پاس
تائی جی کے بعد یہ مان ہے؟" صدف نے سنجیدگی
سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو زرتاب کی آنکھیں
آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"وہ تو بس ایک ہی تھے۔ ان جیسا دوسرا
بھلا کہاں سے لاؤں۔" اس نے سسکی لی۔ "لیکن
میں اپنے دل کا کیا کروں صدف؟ کبھی کبھی مجھے لگتا
ہے کہ میری ہمت جواب دے جائے گی، میرے
اندر اتنی دیرانی ہے کہ اب کسی کے ساتھ کی کوئی تمنا
نہیں رہی۔ جبکہ دوسری طرف اماں جان کی
پریشانی دیکھتی ہوں تو اپنا آپ ان کا مجرم لگنے لگتا
ہے۔ جب دل کرتا ہے کہ خود کو ختم کرنے میں ایک لمحہ
نہ لگاؤں۔" نڈھال سے انداز میں کہتے ہوئے اس
نے اپنا سر بیڈ کی پشت سے ٹکا دیا تو صدف نے
محبت سے اس کا ہاتھ سہلایا۔

"جب تک تم نے خوابوں اور نئی خوشیوں کو
اپنے اندر جگہ نہیں دو گی، یہ دیرانی کیسے تمھارا پیچھا
چھوڑے گی۔"

"کیسے جگہ دوں؟ یہ احساس کہ کسی کی زندگی
محض میری وجہ سے داؤ پر لگادی گئی، مجھے سکون سے
جینے نہیں دیتا۔" اس کی آنکھیں یکا یک جھللا
اٹھیں۔ "بارہ سال گزر گئے ہیں اس بات کو۔ لیکن
مجھے آج بھی وہ دن نہیں بھولتا جب اس حویلی میں
ایک قیامت برپا ہوئی تھی اور اس قیامت نے
میری ذات کی وجہاں بکھیر دی تھیں۔ میرا
وقار، میرے ماں جانے مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھن
گئے۔ میں اپنے نقصان کو کس طرح فراموش کر
دوں صدف؟" وہ گھٹنوں پہ پیشانی ٹکائے پھوٹ
پھوٹ کے رو پڑی اور صدف اس کے دکھ میں
ڈوبے وجود کو بے بسی سے تکی لب کاٹ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

گاؤں کی فضا میں آج خوب رونق تھی۔ اور اس
خوشی کا مرکز سفید حویلی تھی۔ جس کے وسیع و عریض
صحن اور باغ میں آج سارے گاؤں والوں کی
ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گاؤں نور دلالاں
(ایک خیالی نام ہے) اور اس سے ملحقہ علاقے کی
جان سفید حویلی اور اس سے منسوب پیر نظر حسین شاہ
کا گھر اندھا تھا۔ وہ گھرانہ جو اپنے دامن میں ہدایت اور
نور کے بہت سے مستر حوالے لیے ہوئے
سفید عامہ، سفید لباس اور سیاہ ڈاڑھی سے سجا
سرخ و سفید چہرہ جس پہ اتنی حلاوت اور سکون تھا کہ
دیکھنے والوں کی نظر بندھ جاتی تھی۔ بات کرتے تو
ایک ایک لفظ اتنی نرمی اور تاثیر لیے ہوتا کہ سننے
والوں کے دل میں اتر جاتا۔

آج سے تیس برس پہلے جب وہ محض
بائیس سال کے تھے تب اپنے والد صاحب، پیرسید
اسماعیل حسین شاہ، کی وفات کے بعد انھیں اپنے
خاندان میں چلنے والی اس گدڑی کا سجادہ نشین مقرر کر
دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان سے بڑے ایک بھائی اور تایا
چچا کے بیٹے بھی موجود تھے۔

لیکن یہ ان کے گھرانے کی ایک اعلا روایت
رہی تھی کہ انھوں نے ولایت سے بڑے اس منصب
کو، جس کا تعلق درحقیقت صرف اور صرف "ہدایت
" اور "قرب الہی" سے ہوتا ہے، بادشاہ وقت کا تخت
نہیں بنے دیا تھا۔ اس گدڑی پہ ہمیشہ وہی بیٹھا تھا جو
صرف حسب و نسب کی حد تک قابل احترام نہیں
بلکہ علم و عمل میں بھی اپنی مثال آپ ہوا کرتا تھا۔ اور
جس میں اپنے نیک اور برگزیدہ باپ دادا کے
روحانی اوصاف کو، اپنی ذاتی ریاضت، عبادت اور
اللہ سے اپنی خلوصی کے بل پہ خود میں زندہ رکھنے کی
لگن ہوتی تھی۔

پیرسید اسماعیل حسین شاہ کے بعد ان کے
خاندان میں یہ ذہن، یہ لگن صرف سید نظر حسین شاہ

میں تھی۔ اسی لیے سب کی باہمی رضامندی سے
انھیں اس منصب پہ فائز کروایا گیا تھا۔ جس کے بعد تو
وہ گویا خود پہ دہری ذمہ داری محسوس کرنے لگے
تھے۔ کیونکہ ان کا ہر عمل اب ان کے چاہنے والوں
کے لیے تقلید کا باعث تھا۔

وہ گاؤں کے ہر فرد کو، خواہ وہ بوڑھا تھا یا جوان
اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔ یہی وجہ تھی کہ نور دلالاں
کے دل کو اس آگے اور دس کوں پیچھے ان کا نام نہایت
عقیدت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان
کے گاؤں میں مقیم چند غیر مسلم گھرانے بھی ان کی بے
حد عزت کیا کرتے تھے۔

یہ ان کی بے پناہ شفقت اور اچھائی کا ہی اعجاز
تھا جو کبیر سنگھ نامی سکھ نوجوان، ان کا کچھ ایسا
گرویدہ ہوا تھا کہ ان کی جانب کھینچا چلا آنے لگا
تھا۔ اس کی اس محبت کو شاہ صاحب نے بھی بہت
خلوص سے قبول کیا تھا۔ وہ ان کے پاس ہوتا تو ان
کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام اپنے ہاتھ سے
انجام دینے کی کوشش کرتا اور وہ اسے ہرگز نہ ٹوکتے۔

وہ ان کا جمع کا خطبہ سننے کے لیے مسجد میں آ
بیٹھتا اور وہ اسے کچھ نہ کہتے۔ یہاں تک کہ اس نے
دربار (حویلی سے متصل وہ جگہ جہاں شاہ صاحب
بیٹھا کرتے تھے) کی صفائی بھی خود ہی اپنے ذمے
لی لی تھی اور شاہ صاحب نے اس سے کوئی سوال
نہیں کیا تھا۔ ان کے اس رویے کو دیکھتے ہوئے کسی
میں بھی اتنی اہمیت نہ تھی کہ وہ کبیر سنگھ کو کچھ کہہ سکتا۔

آج کے اس خوشی کے موقع پہ بھی وہ ہر کام میں
پیش پیش تھا۔ آج شاہ صاحب کے سب سے بڑے
بیٹے، سید بختیار حسین شاہ، اور ان کے بیٹے، سید
حافظ رجب شاہ، کے انٹر میں کامیاب ہونے کی
خوشی میں سارے گاؤں کو نظر آنے پہ مدعو کیا گیا
تھا۔ اس تقریب میں ان کے خاندان والے اور
دوست احباب بھی شامل تھے۔ ہر طرف خوب

رونق تھی۔ ایسے میں کبیر سنگھ کا یوں دوبار کے
مصاحبین کے ساتھ ساتھ رہنا شاہ صاحب کے
دور دراز سے آئے کئی مہمانوں کے لیے حد حیرانی کا
باعث تھا۔ مگر انھیں کسی کی حیرت کی مطلق پرواہ نہ
تھی۔

"کبیر! باہر جا کے کھانے کا نیا سلسلہ شروع
کرواؤ۔" وہ کچھ دیر پیشتر آنے والے چند مہمانوں کو
مشروب دے کے پلٹا تو شاہ صاحب اپنے مخصوص
نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ان کے لہجے کی حلاوت
آنے والوں کو حیران کر گئی۔

کبیر سنگھ اثبات میں سر ہلاتا باہر کی جانب بڑھ
گیا تو شاہ صاحب کے شہر سے آنے والے ایک مرید
کے لیے مزید خود پہ قابو پانا نامکن نہ رہا۔

"اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں شاہ
صاحب؟" وہ مؤدب انداز میں بولا تو ان کے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لکھی بھان

رخسانہ نگار عثمان

مکمل ناول کتابی شکل
میں شائع ہو گیا ہے



قیمت - 500 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
فون نمبر: 32735021
37/3 بازار، کراچی

چہرے پہ شفیق ساناثر پھیل گیا۔

"پوچھو عثمان۔"

"یہ آدمی تو سکھ لگتا ہے شاہ صاحب۔ پھر یہ یہاں آپ کے پاس۔۔۔۔۔" وہ جھجک کے خاموش ہو گیا تو پیر سید نظر حسین شاہ کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سکھ ہے تو کیا ہوا۔ محبت اور عقیدت کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے عثمان۔ اور دلوں کے سودے بڑے ہی عجیب ہوا کرتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شاہ صاحب لیکن آپ اتنی پاک صاف ہستی اور یہ طہارت و پاکیزگی کی ہر شرط سے بے بہرہ ایک غیر مسلم۔ معذرت کے ساتھ لیکن آپ کو اس سے متن نہیں آتی؟"

"ممن؟ میں اس سے کیسے گھن کھا سکتا ہوں عثمان۔ ہم کیسے کیسے گناہوں میں تھکر کے اپنے بسا نہ بھرے وجود لیے اللہ عزوجل کی پاک و معتبر ہستی کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس نے ہم سے کبھی گھن کھائی ہے؟" انھوں نے مسکرا کے انتہائی نرمی سے استفسار کیا تو اس کا سر میکا کی انداز میں لٹی میں ہل گیا۔

"پھر بھلا میں اس کا ایک عاجزا درگاہ گار بندہ ہو کے یہ متکبرانہ حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟" وہ دھیرے سے بولے تو سوال کرنے والے کی نگاہ بے اختیار جھک گئی۔ "تم سب تو مجھ سے اپنی محبت کے اظہار میں مکمل طور پہ آزاد و خود مختار ہو۔ مگر یہ شخص جب

جب اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے یہاں آتا ہو گا اسے یقیناً بہت سی باتیں سنی پڑتی ہوں گی۔ اپنے لوگوں کی فحشی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہوگا۔ لیکن پھر بھی اس کے قدم پیچھے نہیں ہٹتے۔ کیوں؟ کیا ل جاتا ہے اسے یہاں سے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ پھر میں کیسے اس کے اس درجہ غلوں اور بے لوث محبت کی قدر نہ کروں؟ کیسے اس بات کو بنیاد بنا کے اسے جبراً

دوں، اس کا دل تو زردوں کہ وہ ایک غیر مسلم ہے۔ مجھ سے تو اپنی پاکیزگی کا ایسا زعم نہیں دکھایا جائے گا۔" دھیرے سے کہتے وہ خاموش ہوئے تو اس شخص کا ہاتھ ان کے گھٹنوں پہ آٹھرا۔

"آپ نے تو مجھے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا شاہ صاحب۔" وہ شرمندہ سا گویا ہوا تو پیر سید نظر حسین شاہ کا ہاتھ اس کے شانے پہ آٹھرا۔

"میری ایک بات یاد رکھنا عثمان، تمھارا اپنی زبان سے کروایا گیا تعارف تو لوگوں کو بھول سکتا ہے لیکن تمھارا وہ تعارف جو تمھارا کوئی نیک عمل کسی سے کرواتے گا، وہ مقابل کو کبھی نہیں بھولے گا۔ لہذا اپنے صاحب ایمان ہونے کو اپنے اپنے عمل سے ثابت کرو۔ کسی کو کمتر گردان کے نہیں۔" وہ شفقت سے گویا ہوئے تو سننے والے کا دل جیسے پانی بن کر بہنے لگا۔

"پھر بھی تمھاری تسلی کے لیے میں یہ ضرور بتانا چاہوں گا کہ کبیر ایک نہایت حساس انسان ہے۔ وہ یہاں کے آداب سے بہ خوبی واقف ہے۔ اس لیے وہ بنا غسل کے بھی یہاں قدم نہیں رکھتا۔" ان کی آخری بات پہ اس کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا تھا۔ جسے شاہ صاحب نے قصداً نظر انداز کر دیا تھا۔

"الواب اپنا منہ بیٹھا کرو۔" انھوں نے مسکرا کر اس کا دھیان بنایا تو وہ اپنے سامنے رکھے شربت کی طرف متوجہ ہو گیا جو کبیر سنگھ اسے پیش کر کے گیا تھا اور جسے پینے میں اسے اب کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

☆☆☆

ملک کے مابہ ناز سیاست دان کے نئی فارم یادس میں رنگ دھڑ کی بڑی خوبصورت سی محفل بھی تھی۔ جس میں ان کی پارٹی کے سب ہی اہم اراکین شامل تھے۔ اس دعوت کا اہتمام خاص طور پہ سید بختیار حسین شاہ کے اعزاز میں کیا گیا تھا، جنھوں نے

حکومت وقت کی پارٹی میں شامل ہونے کے بجائے ان کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے نہ صرف اپنے سیاسی کیریئر کا باقاعدہ آغاز کیا تھا بلکہ ان کی پارٹی کو بھی پنجاب کے ایک اہم حلقے کی طرف سے مستحکم بنا دیا تھا۔

"ان سے ملیں شاہ جی۔" پارٹی لیڈر خود بختیار شاہ اور ان کے چھوٹے بھائی سید صبور حسین شاہ کو لے کر اپنے اہم مہمانوں سے ملوارے تھے۔

"یہ ہیں ہمارے بہت بڑے کرم فرما جسٹس نصیر احمد۔" لفظ کرم فرمانے بختیار شاہ بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔ پھر پور مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے سید صاحب کا مصافحے کے لیے بڑھایا گیا ہاتھ تھام لیا تھا۔ جو دوسرے ہاتھ میں تھامے گلاس کے باعث اس وقت خاصی ترنگ میں تھے۔

"بڑے عرصے سے خبریں گرم تھیں آپ کے حوالے سے شاہ صاحب۔ اچھا ہوا جو آپ نے چندوں کا وہ ٹولا جو ان نہیں کیا۔" انھوں نے بے تکلفی سے آنکھ دبا لی تو بختیار شاہ تہقیر لگا کے ہنس پڑے۔

"ڈوبتے جہاز میں بھلا کون سوار ہونا چاہے گا نصیر۔" پارٹی لیڈر نے ہنستے ہوئے سید صاحب کا شانہ تھپتھپایا تو ان کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"جس تھوڑا سا انتظار اور، پھر ہمارا وقت شروع ہوگا۔ عیش ہی عیش۔ موجیں ہی موجیں۔" وہ بے ربطی ہنسی ہنستے تو صبور شاہ نے حفا اٹھاتی نظروں سے انھیں دیکھتے ہوئے اپنے گلاس سے چسکی لی۔ اور معذرت کرتا اپنے کزن کی طرف چلا آیا۔

"انسان کو اپنی عمر دیکھ کر چڑھانی چاہیے۔" تمسخرانہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جسٹس نصیر کی طرف اشارہ کیا تو سب ہی تہقیر لگا کر ہنس پڑے۔

"جس حساب سے تو پینے لگا ہے ناں، تیرا بھی اس عمر میں یہی حال ہونے والا ہے۔" اس کے ناموں زانو فر شاہ نے ہنستے ہوئے اس پہ چوٹ کی تو سب کا تہقیر ایک بار پھر گونج اٹھا۔

"بھابی سے سبق سیکھ۔ کبھی لگایا ہے انھوں نے کسی ایسی ویسی چیز کو منہ؟" اس نے صبور شاہ کا شانہ تھپتھپایا۔

"سب کے اپنے اپنے نشے ہیں لالے۔ مجھے اگر پینے کا شوق ہے تو انھیں طاقت کا نشہ ہے۔ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید طاقتور بنا چاہتے ہیں۔ دیکھ نہیں رہے، آج کیسا سرور بھرا ہے ان کی آنکھوں میں۔" اس نے مسکرا کر بھائی کی طرف دیکھا تو خاموش کھڑے ہاشم شاہ کی کینہ تو نظریں دور کھڑے بہنوئی پہ جا ٹھہریں۔

پیر سید نظر حسین شاہ کی اولاد کس قدر مطمئن اور خوش تھی۔ ان کی آرزوئیں اور خواہشیں وقت کس طرح ایک ایک کر کے پوری کر رہا تھا۔ اور ایک وہ تھا جس کے دل کی ناشادگی کا کسی کو احساس ہی نہیں تھا۔ سلگتے ہوئے اس نے ایک تلی گھونٹ اپنے اندر اتارا تھا۔

"ارے ہاں یاد آیا۔" فخر نے صبور شاہ کی طرف دیکھا۔ "ساہیوال والی اس زرگی زمین کا کیا بنا؟" "ہار دی ہے محترم نے۔" ہاشم نے نگاہوں کا زاویہ بدلتے ہوئے استہزاء سے انداز میں لقمہ دیا تو فخر کے ساتھ ساتھ باقی سب کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیا؟ یہ کب ہوا صبور؟" خود پہ سب کی نظریں پاکے صبور شاہ شرمندہ ہو گیا۔

"اوہ یار۔ بس بازی لگ گئی تھی۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگایا۔ اس کی سبکی ہاشم کے اندر خٹک سی اتار گئی۔

"کتنی عجیب بات ہے ناں، چاچا جی کو جو کیڑے کبھی مجھ میں نظر آیا کرتے تھے، آج وہ سب

مخالفت کی ہمت صرف ان کے بڑے بھائی سید رجب حسین شاہ میں تھی۔ جنھوں نے نہ صرف اپنی ناگواری کا گرج برس کے اظہار کیا تھا بلکہ اپنی اکلوتی بیٹی، معصومہ کو بھی اس سب کا حصہ بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"اوہو۔ یہ تو اچھی بات نہیں۔ میری بیٹی کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" انھوں نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

"بہت اچھی۔ پتا ہے کل مس نے ٹیٹ لیا تھا اور میرے ٹین میں سے ٹین آئے ہیں۔" اس نے فخریہ انداز میں بتایا تو شاہ صاحب نے اس کا گال چوم لیا۔

"شاباش۔ بس ایسا ہی اچھا اچھا پڑھنا ہے آپ نے۔" وہ اس کی مزید گٹ پٹ سننے میں مگن تھے جب برآمدے کا دروازہ کھول کے شاہ بی بی باہر آئی تھیں۔ زرناب کو باپ کی گود میں بیٹھا دیکھ کے وہ مسکراتی ہوئی ان دونوں کے پاس چلی آئی تھیں۔ بڑی بہن کو آدھ دیکھ کے شاہ صاحب ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم آپ۔" انھوں نے پیار سے اپنے بھائی کا شانہ تپتپایا تھا۔ "کتنی بار کہا ہے نظرا میرے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔ تمہارا مرتبہ بدل چکا ہے۔"

"میرا اصل مرتبہ اپنی ماں بہنوں کی عزت میں ہے۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئے تو شاہ بی بی کی آنکھوں

میں ان کے لیے محبت کا سمندر ٹھٹھیں مارنے لگا۔ ان کی بیبی بائیں تو انھیں اس خاندان کے دیگر مردوں کی مختلف بنائی تھیں۔ شاہ صاحب کی ذات اس گھرانے کے لیے سچ معنوں میں رب تعالیٰ کی خاص رحمت تھی۔

"سلامت رہو۔ اللہ کبھی کوئی غم نہ دکھائے

میرے ویر (بھائی) کو۔" وہ پاس رکھی کرسی پر بیٹھیں تو شاہ صاحب بھی دوبارہ پچھنے لگے۔ زرناب ان کی گود سے اتر کر اندر بھاگ گئی تھی۔

"پرسوں رجب آیا تھا میرے پاس۔ وہ چاہتا ہے کہ اب معصومہ اور بختیار کی شادی کر دی جائے۔" ان کی بات پر شاہ صاحب نے گہری سانس لی۔

"میرے خیال میں اگر دو سال ٹھہر جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اصل میں، میں چاہتا ہوں کہ بختیار کا کسی انجینیئرنگ کالج میں داخلہ ہو جائے۔ اس عرصے میں وہ اپنی ذمہ داریوں کو بھی سمجھنے کے قابل ہو جائے گا۔"

"سو توے لیکن تم جانتے ہو کہ اس کا پڑھائی کی طرف بالکل رجحان نہیں۔ رہی ذمہ داریاں تو وہ جب تک اس پہ ڈالی نہیں جائیں گی، اس کے مزاج کی لاپرواہی نہیں جانے والی۔ اس لیے بہتر ہوگا اگر تم اس کا گھر بسا دو اور اسے زمین داری کی طرف لے آؤ۔" وہ رساں سے گویا ہوئیں تو سید نظر حسین شاہ خاموش ہو گئے۔

شاہ بی بی کی بات اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ لیکن وہ اس ملال کا کیا کرتے جو ان کے اندر اپنے بیٹے کے مستقبل کو لے کر اٹھنے لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اسے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے انسان کے روپ میں دیکھنے سے خواہش مند تھے۔ مگر بختیار حسین نے نہ صرف انھیں تعلیمی میدان میں مایوس کیا تھا بلکہ مزاج و اطوار میں بھی وہ ان کے بالکل برعکس تھا۔

"میں ایک بار اس سے بات کر لوں۔ پھر آگے اس کا نصیب۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولے تو ان کے چہرے کی افسردگی شاہ بی بی کا دل دکھ سے بھر گئی۔ انھیں سمجھنے کے حوالے سے اپنے بھائی کی آرزوؤں کا بہ خوبی علم تھا۔ لیکن اسے چراغ تلے اندھیرا کہا جاتا یا پھر سید بختیار حسین کی بد

نقصی کہ وہ اتنے مثالی باپ کا فرزند ہو کے بھی ان کی خوبیوں سے فیض یاب ہونے سے محروم رہا تھا۔

"اللہ یہ بھروسہ رکھو نظر۔ اس نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انھوں نے تسلی آمیز انداز میں ان کا ہاتھ تپتپایا تو شاہ صاحب دھیرے سے مسکرا دیے۔

"کیوں نہیں آیا۔ وہی تو ہمارا والی وارث ہے۔"

"بے شک۔" شاہ بی بی کے منہ سے بے اختیار تانہ لنگی تھی۔

"آئیں چل کے ناشتہ کرتے ہیں۔" اپنے مخصوص پرسکون انداز میں کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو شاہ بی بی بھی دھیمی سی مسکراہٹ لیے ان کے ساتھ چل پڑیں۔

☆☆☆

آسان بھی اگر معصومہ شاہ کے سر پہ آگرتا تو شاید انھیں اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی کرکڑے والوں کے مثبت جواب سے ہوئی تھی۔ شوق کی سیلی کی ٹیلی کو نہ صرف زرناب بے حد پسند آئی تھی بلکہ انھوں نے دو دن بعد ہی ان سب کو اسلام آباد اپنے گھر بھی مدعو کیا تھا۔ ان کے پیغام نے جو بی بی میں خوشی کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ بی بی نور بانو کا تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہا تھا۔ انھیں یہ پڑھے لکھے اور نفیس طبع لوگ پہلی ملاقات میں ہی اپنی بیٹی کے لیے بہت اچھے لگے تھے۔

شاہ بی بی، صدف اور بی بی حوراء (شفیق اور

عجیب سی شہنشاہ لے ہوئے تھا۔ انھیں اس بات کا قلم زیادہ تھا کہ وہ خاندان سے باہر بیٹی دے کر سب کی باتوں کا نشانہ بننے والے تھے۔ اور اس احساس کو معصومہ کے کیلئے جملے مزید ہوا دے رہے تھے جو پچھلے دو دن سے جلے پیر کی ٹی بی ٹی گھوم رہی تھیں۔

زرناب حسین شاہ کو اپنے تمام تر غرور سمیت اپنے بھائی کے قدموں میں گرے دیکھنا ان کی خواہش سے بڑھ کر ان کی ضد تھی تب ہی تو وہ آج تک ہر ممکن طریقے سے اس کے لیے آنے والے رشتوں میں روڑے لگاتی رہی تھیں۔ مگر اس بار ان کا داؤ چلانا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ لوگ نہ تو ان کے خاندان کے تھے اور نہ اس علاقے کے اور نہ ہی ان کی جان پہچان کے جو وہ ماضی کی کسی بات کا تجسس پھیلا کے کوئی رخ نہ ڈال سکتیں۔ تب ہی تو اس رشتے کا انجام بخیر ہوا تھا۔

"میں سوچ رہی تھی خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگے گا۔ آخر کو وہ ہماری شوق کی سیلی بھی تو ہے۔" بی بی نور بانو نے اپنی تند اور دیوانی کی طرف دیکھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم شوق سے کہہ کر اسلام آباد سے اچھا سا کیک اور پھول لے لیں گے۔" صدف خوشی سے چمکی۔ شوق اپنے شوہر سنان کی جاب کی وجہ سے اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ "لے آئے ایک تے مچھل کی ہوئے (لو یہ کیک اور پھول کیا ہوئے)۔ بندہ اپنے بانگوں کے پھلوں کے ٹوکے لے کے جائے۔"

ان کی بات پر صدف نے پشیمانی پہ ہاتھ مارا۔

"نہیں تائی جی! پھلوں کا آج کل کوئی فیشن نہیں۔"

"لودسو۔ ہن بھلاں دے دی فیشن ہون لگے نے۔" (لو بتاؤ۔ اب پھلوں کے بھی فیشن ہونے لگے ہیں)۔ وہ ہنستے ہوئے شاہ بی بی اور بی بی حوراء کی طرف ہلکی سی تانہ بھی ہنس پڑیں۔

"اور یہ ہم کہاں سے آگیا بیٹا جی؟" شاہ بی بی بٹتے ہوئے صدف سے مخاطب ہوئیں۔ "صرف ہم تینوں اور شفق جائے گی۔"

"کوئی نہیں۔" وہ بدکی۔ "میرا جانا از حد ضروری ہے۔ زرناب کی پسند ناپسند صرف مجھے پتا ہے۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر اتر آئی۔

"اللہ نے چاہا تو بہترین جوڑ ہوگا۔" شاہ بی بی نے بے ساختہ دعا کی تو سیریاں اتر کر نیچے آئی معصومہ کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اور اگر بہترین تو کیا؟ بہتر بھی نہ نکلا۔۔۔ تو؟" ان کی آواز پہ سب ہی نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔ معصومہ نے شانوں کو خفیف سی جنبش دی۔ "اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ آخر کو وہ غیر ہیں۔ اب ہمیں کیا معلوم کتنا بچ بول رہے ہیں اور کتنا جھوٹ۔" وہ مسکرائی ہوئی صوفیہ پہ آ بیٹھیں تو شاہ بی بی نے ایک تلخ نظر جھنجھی کے چہرے پہ ڈالی۔

"تو بختیار اور صورت کس لیے ہیں۔ وہ پتا کروائیں گے ناں۔" شاہ بی بی نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

"ہونہ! اسے کہتے ہیں گھر کی نعمت چھوڑ کے غیروں کی جوتیاں سیدھی کرنا۔ خیر ہمیں کیا۔ آپ لوگوں کے نصیب میں ہی شاید خواری ہے۔۔۔ کون کون جا رہا ہے؟" انھوں نے بھڑاس نکال کے اچانک موضوع بدلا تو صدف کا دل چاہا کہ پاس پڑا گل دان اس عورت کے سر پہ دے مارے۔

"ہم تینوں اور شفق۔" شاہ بی بی نے قصداً صدف کا نام لینے سے گریز کیا۔

"کیوں؟ میری ماں آپ لوگوں کی کچھ نہیں لگتی؟" معصومہ نے ماتھے پہ بل ڈالے استفسار کیا۔ شاہ بی بی نے ایک نظری بی نور بانو کی طرف دیکھا۔ اور پھر گل سے گویا ہوئیں۔

"جب تک بات طے نہیں ہو جاتی، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ معاملہ گھر والوں تک محدود رہے تو بہتر ہوگا۔"

"یعنی مرحوم سید جب حسین شاہ کے بیوی بچے اب آپ لوگوں کے لیے باہر والے ہو گئے ہیں۔ واہ! کیا کہنے ہیں آپ کے شاہ بی بی۔" معصومہ جلیلا کے سیدی ہوئیں۔ ان کا انداز کوثر شاہ کا چہرہ سرخ کر گیا۔ وہ بہت دیر سے ان کی فضول گوئی برداشت کر رہی تھیں۔

"یہ دن تم لوگوں نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے خود دیکھا ہے۔ ہمیں الزام دینے کے بجائے بہتر ہوگا اگر تم سب اپنی نیتیں صاف کرلو۔"

"یعنی ہم بدنیت لوگ ہیں؟" معصومہ نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے دو بد سوال کیا۔

"بالکل ہو۔" شاہ بی بی، مطلق پرواہ کیے بنا پرسکون انداز میں گویا ہوئیں تو صدف کا دل اندر تک ٹھنڈا ہو گیا۔ لبوں پہ چھپتی مسکراہٹ دہاتے ہوئے اس نے معصومہ شاہ کی طرف دیکھا جو اس کرارے جواب پر غصے سے چھٹی کو دیکھنے لگی تھیں۔ جلیلا نے انھوں نے کچھ کہنے کے لیے لب داکے ہی تھے کہ شاہ بی بی کی تنبیہ نے ان کی زبان نالوسے لگا دی۔

"اس سے پہلے کہ میں آج اگلے پچھلے سارے حساب برابر کر دوں اپنے کمرے میں جاؤ! اور معصومہ اس کھلی بے عزتی پہ سرخ چہرہ لیے، وہم وہم کرتی اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی اور گھر کی تینوں خواتین، جمع بنی سنوڑی ہنستی مسکراتی صدف کے، ذرا نیور کے ہمراہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی تھیں۔

"یہ من مانی آپ لوگوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔" کھڑکی میں کھڑی معصومہ شاہ نے غصے سے گیٹ سے باہر نکلتی گاڑی کو دیکھا۔ اور پھر پلٹ کر چادر لپیٹتی ہوئی نیچے چلی آئی تھیں۔

"حق نواز گدڑی کڈ۔" (حق نواز گاڑی نکالو۔) ان کی ٹھیک پیکار پہ جہاں چوکیدار کے ساتھ مصروف ملازم بوکھلا کر ان کی طرف بھاگا تھا وہیں اپنے کمرے میں غم سمیٹتی زرناب بھی چونک اٹھی تھی۔

آج دوپہر میں جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ صدف کے ذریعے اس کے علم میں آچکا تھا۔ تیز قدموں سے کھڑکی کی طرف آتے ہوئے اس نے باہر دیکھا تھا جہاں معصومہ شاہ بے چینی سے ٹپٹتے ہوئے موبائل پہ کوئی نمبر ملتا رہی تھیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی میں سوار ہوئی تھیں اور حویلی کا بڑا سا گیٹ پار کر گئی تھی۔

ان کے منظر سے بیٹے ہی زرناب نے ایک بوجھل سانس لیتے ہوئے اپنا سر کھڑکی سے نکال دیا تھا۔ وہ بنا بتائے بھی ان کی منزل کا پتا خوب جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

دس سالہ اجیت سنگھ نے نوالہ چباتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اسکول سے لوٹا تھا۔

"بے بے۔"

"ہاں" بلونے ہاتھ میں دبے کرتے پہ سے نظریں ہٹائے بنا جواب دیا۔ وہ بے سہمی کے تہوار کے لیے اپنے لاڈلے کے کرتے پہ کڑھائی کا شوق پورا کر رہی تھی۔

"میں روٹی کھا کے حویلی کھینے چلا جاؤں؟"

"میں لٹاں توڑ دیڑیاں نہ!" (میں نے ٹانگیں توڑ دی ہیں) سر اٹھاتے ہوئے اس نے بیٹے کو گھورا تھا۔

"بے بے" اجیت ٹھنکا۔ "تو نے کل بھی مجھے نہیں جانے دیا۔ صبور شاہ دودن بعد واپس شہر جانے والا ہے۔"

"بوت (بہت) اچھی گل (بات) اے۔ جان جھپٹے گی ساڑی (ہماری)۔" بے زاری سے سر جھٹکتی وہ کرتے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ "تیرا پوکی کھٹ اے سوا پانخون۔" (تمہارا باپ کیا کم ہے ہمیں بے عزت کروانے کو۔) ماں کی ڈانٹ پہ اجیت نے منہ بسورتے ہوئے سامنے رگی ٹرے دھکیں دی۔

"جا۔ نہیں کھانا روٹی۔" مگر بلونے سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اپنی دھکی بے اثر جانی دیکھ کے اجیت نے سر پہ سے ٹھٹھکے لگا تھا۔

"بے بے! اچھے کیا ہو گیا ہے۔ تو اب کیوں مجھے حویلی نہیں جانے دیتی؟ صبور شاہ روز مجھے بلاتا ہے۔" باپ کے ساتھ حویلی جاتے رہنے کی وجہ سے اس کی اور شاہ صاحب کے چھوٹے بیٹے صبور کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ جس میں پھر رفتہ رفتہ اجیت کے بانی دوست بھی شامل ہو گئے تھے۔

اب سارے بچے مل کر کھلا کرتے تھے۔

"اجیت مجھے تنگ نہ کر۔" بلونے ٹانگا اٹھاتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

"بے بے میرے سارے دوست مجھے بلا رہے ہیں۔" وہ ماں کے قریب کھسک آیا۔ "اچھا آج جانے دے۔ فیر نہیں (پھر نہیں) جاؤں گا۔" وہ التجائیہ انداز میں بولا تو بلونے تھک کے نظریں اٹھائیں اور اس کے معصوم چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی اس کا دل پتچ گیا۔

"اچھا چلا جائیں۔ لیکن پہلے روٹی ختم کر۔"

"کر لی۔" وہ خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اجیت!" لیکن وہ ماں کی پکار ان سنی کیے باہر بھاگ گیا تھا۔

گھر سے نکل کے اس کا رخ حویلی کی طرف تھا جس کی باہر والی بجی سڑک پہ اس کے سارے دوست کرکٹ کا میدان سجائے اس کے منظر

☆ ☆ ☆

دس سالہ اجیت سنگھ نے نوالہ چباتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اسکول سے لوٹا تھا۔

"بے بے۔"

"ہاں" بلونے ہاتھ میں دبے کرتے پہ سے نظریں ہٹائے بنا جواب دیا۔ وہ بے سہمی کے تہوار کے لیے اپنے لاڈلے کے کرتے پہ کڑھائی کا شوق پورا کر رہی تھی۔

"میں روٹی کھا کے حویلی کھینے چلا جاؤں؟"

"میں لٹاں توڑ دیڑیاں نہ!" (میں نے ٹانگیں توڑ دی ہیں) سر اٹھاتے ہوئے اس نے بیٹے کو گھورا تھا۔

تھے۔ اس کے آتے ہی کھیل زور و شور سے شروع ہو گیا تھا۔ وہ اور صبور شاہ اپنی اپنی ٹیموں کے کپتان تھے۔

وہ بیٹ لیے دکنٹ کے آگے کھڑا تھا۔ جب صبور نے دوسری طرف سے بال کروائی تھی۔ اجیت کی شاٹ پہ بال تیزی سے اڑی تھی اور اگلے ہی لمحے حویلی کے گیٹ سے باہر آتے سید بختیار حسین کے سفید سوٹ پہ اپنا نشان چھوڑ گئی تھی۔

"اے!" اس کی دھاڑ پہ سارے بچوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ جبکہ اجیت کی تو سانس ہی رگ گئی تھی۔ وہ سب بختیار شاہ کے غصے سے بہ خوبی واقف تھے۔ بختیار نے کھا جانے والی نظروں سے سامنے دیکھا تھا۔ اور اجیت کے ہاتھ میں بیٹ دیکھ کے اس کا غصہ دو چند ہو گیا تھا۔

اجیت بیٹ چھوڑ کے بھاگنے کو پر تولنے لگا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ بختیار کی پہنچ سے دور ہوتا اس نے لپک کے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔

"کافر کی اولاد تیری اتنی جرات!" اس کا ہاتھ اس کے سر پہ پڑا تو جہاں اجیت کی چیخ نکل گئی تھی وہیں صبور شاہ دوڑتا ہوا اپنے دوست کی مدد کو آیا تھا۔

"بھائی، اجیت کو مت ماریں۔" اس نے بھائی کا بازو تھاما تو بختیار نے دانت پیستے ہوئے بے رحمی سے اجیت کو دور جھک دیا۔ وہ زمین پہ گرتے ہی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا۔ بختیار اسے کڑی نگاہوں سے گھورتا صبور شاہ کی طرف پلٹا تھا۔

"کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ اس نجس کے ساتھ مت کھیلا کرو۔ بات سمجھ میں نہیں آتی؟" سب کے سامنے بختیار کی ڈانٹ صبور کی آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔ وہ ناراضی سے بڑے بھائی کو دیکھتا اندر کی طرف بھاگ گیا تو بختیار کا رخ دوبارہ روتے ہوئے اجیت کی طرف ہو گیا۔ وہ غصے سے آگے

بڑھا اور ایک جھٹکے سے اسے بازو سے پکڑ کے سیدھا کیا۔ اتفاق سے اسی وقت سید نظر حسین شاہ اپنے ملازم کے ساتھ حویلی کے گیٹ سے باہر نکلے تھے۔

کرم دین سے بات کرتے ہوئے جوں ہی ان کی نظر سامنے کو اٹھی تھی ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ ان کا بڑھا کھٹا شہری بیٹا گاؤں کے معصوم بچے کو بازو سے دبوچے کھڑا تھا۔

"اور تو پلہ انسان اور بارہ اگر تو حویلی میں آیا تو میں نے تیری ٹانگیں۔۔۔۔۔" اس سے پہلے کہ بختیار اس کا کان مروڑتا ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"بختیار!" ان کی گرج دار دیکار پہ جہاں سب بچوں نے پلٹ کر شاہ صاحب کی طرف دیکھا تھا وہیں سید بختیار حسین کی روح فنا ہو گئی تھی۔ آن واحد میں اجیت کو چھوڑتا وہ ایک جھٹکے سے پلٹا تھا اور اپنے پیچھے سید نظر حسین شاہ کا انگارے کی طرح دکھتا چہرہ دیکھ کر اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

حویلی کے ہال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھر کے سب ہی یکن سہی نگاہوں سے پیر سید نظر حسین شاہ کو تنک رہے تھے جن کا غصہ اپنے عروج پہ تھا جو ہرگز کوئی عام بات نہ تھی کیونکہ شعل سے شاہ صاحب کو قطعہ شاد و نادر ہی آیا کرتا تھا۔ لیکن جب بھی آتا تھا جائز بات پہ اور بہت شدید آتا تھا۔ اسی لیے کسی میں بھی اس وقت مداخلت کی ہمت نہ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں شاہ صاحب اور بختیار حسین کے علاوہ تیسرا کوئی نہ تھا۔

"تمہاری جرات کیسے ہوئی اس معصوم پہ ہاتھ اٹھانے کی؟ اسے پلید کہہ کے پکارنے کی؟ تم خود کیا بہت پاک صاف بہت معتبر تھی ہو؟" ان کی غضب ناک نگاہیں بختیار شاہ کے چہرے پہ جمی تھیں جو کمرے کے وسط میں نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

"تمہارے انداز و اطوار تو پہلے ہی بہت مایوس کن تھے لیکن آج تو تم نے مجھ سے میری ہر امید ہی چھین لی ہے۔ بجائے میرا مان اور فخر بڑھانے کے تم نے تو مجھے میری ہی نظروں میں شرمندہ کر دیا ہے۔۔۔ میں کس منہ سے لوگوں کو نصیحت کروں گا انہیں اچھائی برائی میں فرق بتاؤں گا جب میری اپنی اولاد ہی اس فرق سے بے بہرہ ہوگی۔" وہ غصے سے بولے تو سدا کے اکھڑ مزاج بختیار کے لیے مزید خاموش رہنا ممکن نہ رہا۔

"میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی بابا صاحب! جس کی وجہ سے آپ کو شرمندگی اٹھانی پڑے۔" نظریں جھکائے وہ ڈھٹائی سے بولا تو سید نظر حسین شاہ اسے خشکیوں نگاہوں سے دیکھتے پیوی کی طرف پلٹے۔

"لو دیکھو نور بانو! اپنے بے جا لادپیا رکا نتیجہ۔ آج اسے کسی مظلوم پہ کیا غمیا ظلم، کوئی بڑی بات ہی نہیں لگ رہی۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولے تو سب گھر والوں کے سامنے شاہ صاحب کا یوں ٹوکنا بی بی نور بانو کی نگاہیں جھکا گیا۔ جبکہ ان کے طنز پہ بختیار نے جلالہ کے نظراٹھائی تھی۔

"میں نے کوئی ظلم نہیں کیا بابا صاحب۔ اس نے میرے کپڑے خراب کیے تھے۔ میں نے صرف اسے ڈرانے کے لیے ہاتھ اودھنچا کیا تھا۔"

"بھائی جھوٹ بول رہے ہیں بابا صاحب۔ انھوں نے اجیت کے سر پہ پھپر مارا تھا اور اسے زمین پہ دھکا دے کے گرایا بھی تھا۔ اور اسے کافر کی اولاد بھی کہا تھا۔" کم سن صبور کی اچانک مداخلت پہ بختیار کی سٹی کم ہو گئی۔

"بد بخت! تم میں خدا کا خوف ہے کہ نہیں؟" شاہ صاحب یک لخت بلند آواز میں دھاڑے تو بختیار سمیت سب ہی کانپ اٹھے۔

"خود کو سنہالو نظر۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" شاہ بی بی تیزی سے آگے بڑھیں۔

"کیسے سنہالو آپا۔۔۔ شرم آرہی ہے مجھے اسے اپنا بیٹا کہتے ہوئے۔" انھوں نے بختیار کی طرف غصے سے دیکھا۔ "ارے اس بچے پہ ہاتھ اٹھانے سے پہلے اتنا تو سوچ لیتے کہ اس کے کافر ماں باپ تمہاری تقدیم میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تم جہاں پاؤں رکھتے ہو وہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ اس عزت پہ بجائے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بننے کے تم تکبر پہ اتر آئے ہو! احساس برتری میں جتلا ہو گئے ہو! وہ چلتے ہوئے اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے تو اس تمام عرصے میں پہلی بار بختیار کے ماتھے پہ پسینہ پھوٹ نکلا۔ تھوک نکلتے ہوئے اس نے بھی ہوئی نظروں سے باپ کے تنے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کس بات کا زعم ہے تمہیں ہاں؟ اس خاندان، اس نام مقام کا؟ لیکن اس گھرانے میں پیدا ہونے میں تمہارا کیا کمال ہے؟ تمہاری اپنی کیا حیثیت ہے بختیار شاہ۔ کوئی ایک ذاتی کامیابی، ایک ذاتی خوبی بھی ہو تو بتاؤ؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انھوں نے سوال کیا تو وہ سر جھکانے پہ مجبور ہو گیا۔ اس کا جھکا سر ان کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"جن کا اپنا دامن اوپر والے کی خوشنودی سے خالی ہوتے ہے نا، وہ دوسروں کو تہی دامن کا طعنہ دیتے اچھے نہیں لگتے۔۔۔ صاحب ایمان ہونے کے بعد ایک کافر اور ایک مسلمان کے درمیان صرف ان کے اعمال کا فرق ہوا کرتا ہے۔ اور افسوس کہ تمہارے پاس عمل نام کی کوئی چیز نہیں۔

قبر میں تمہیں نہ باپ کا نام بچانے آئے گا نہ دادا کا مقام۔ سو ان حوالوں پہ بھروسہ کرنے اور

اگر نے کی نادانی کبھی مت کرتا۔ دوبارہ کسی کو اپنے خاندان کے زعم میں آکر طعنہ دینے سے پہلے اپنے اعمال نامے پر ضرور نظر ڈال لینا۔ اب دور ہو جاؤ میری نظروں سے!" وہ غصے سے بولے تو مختیار کسی کی طرف دیکھے بنالے لے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

اس کے سامنے سے بیٹے ہی عبید نظر حسین شاہ کو لگا جیسے ان پہ منوں بوجھ آ رہا ہو۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے صوفے پہ آکر گر سے گئے۔

"نظر!"

"مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔" شاہ بی بی کی پکار پہ وہ آہستگی سے بولے تو ناچار سب باہر کی طرف بڑھ گئے۔

ہال کے خالی ہوتے ہی شاہ صاحب نے تھکے تھکے سے انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ تو اپنے اللہ کے بڑے عاجز بندے رہے تھے پھر ان کی والدہ میں یہ غرور، یہ اکر کہاں سے آگئی تھی؟ دکھ سے لب بھیچے انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"اے میرے معبود برحق! میں تیرا بڑا گنہگار بندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دے میرے مولا یقیناً میں ہی اپنی اولاد کی صحیح راہ نمائی نہیں کر سکا۔ شک سب تعریفیں تیرے لیے ہیں۔ غرور صرف تیرا حق ہے۔ اور ہم تیرے عاجز بندے ہیں۔ پس تو میرے بچے کو بخش دے۔ اور اس کی ہدایت کا سامان فرما دے یا رب!" اپنے اللہ کے حضور گڑ گڑاتے ہوئے ان کا رواں رداں اپنے مختیار شاہ کی بھلائی کا خواہاں تھا۔

☆☆☆

حسب توقع شفق کی سہیلی، سحر کے گھران سب کا پُر تپاک استقبال ہوا تھا۔ وہ بڑے پیمانے پہ ذاتی برزس گرنے والی ایک معزز اور امیر سیدہ تھیں جن کا گھربار دیکھ کے ان سب خواتین کو کافی اطمینان ہوا

تھا۔ ان کے اس اطمینان پہ ولی خوشی کی مہر اس وقت لگی تھی جب ان کی ملاقات اونچے لے، زہیب شاہ سے ہوئی تھی۔ خوش شکل اور خوش گفتار سے، زہیب سے مل کر صرف کو حقیقتاً اپنی عزیز از جان دوست کی ہر تکلیف کا ازالہ ہوتا محسوس ہوا تھا۔ وہ خوش تھی، بے حد خوش۔

واپسی کا سارا راستہ آنے والے وقت کی خوش رنگ تار یوں پہ باتیں کرتے گزر رہا تھا۔

لیکن اپنے گھر کی دلیلیز پار کرتے ہی جب انھیں بڑی حویلی والوں کی اور خاندان کی دیگر گاڑیاں کھڑی نظر آئی تھیں تو ان چاروں کی ساری خوشگواریت ان بلند دبالا دیواروں کے اس پار ہی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جمعے کا دن تھا۔ گاؤں کی مسجد نمازیوں سے کچھا کچھا بھری تھی۔ منبر پہ بیٹھے شاہ صاحب کی اثر انگیز آواز سننے والوں پہ اپنا سحر طاری کر رہی تھی۔

"اللہ پاک سورہ آل عمران میں فرماتا ہے کہ۔۔۔" اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔۔۔" یعنی اس کے بندوں کے درمیان فرق اور جدائی پیدا کرنا اللہ کے نزدیک ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ پھر چاہے وہ فرق عقیدے بنا کے پیدا کیا جائے یا لوگوں کو ذات پات میں بانٹ کر، اس عمل کی ممانعت کی گئی ہے۔" انھوں نے جماعت پہ ایک نظر ڈالی۔ کبیر سنگھ ہر جمعے کی طرح آج بھی نمازیوں سے ہٹ کے پیچھے دروازے کے پاس بیٹھا غور سے شاہ صاحب کا خطبہ سن رہا تھا۔

"حسب دسب کا غرور مسلمانوں کا دھن نہیں بلکہ یہودیوں کا شیوہ رہا ہے۔ جو خود کو قوم سے اونچا اور بخشا ہوا تصور کرتے آئے ہیں۔ لیکن انفسوں کہ آج ہم مسلمانوں کا معاشرہ بھی ذات برداری اور عقیدوں کے تکبر میں بری طرح مبتلا ہو چکا ہے۔ نہیں

یہودیوں کی طرح صرف اپنا عقیدہ درست اور اپنی برادری اونچی نظر آتی ہے باقی سب غلط اور خود سے کم تر محسوس ہوتے ہیں۔ جبکہ ان قبیلوں کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ ہماری دنیاوی پہچان کی علامت ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اللہ کے نزدیک نہ میں اونچا ہوں اور نہ آپ کمتر، ہماری بخشش میں ان قبائل کا کوئی حصہ نہیں ہونے والا۔ ہماری بخشش صرف ہمارے اعمال کر دائیں گے۔ ہمارا رتبہ، صرف ہمارا تقویٰ اور پرہیزگاری بلند کرے گی۔ جس کا عمل جتنا قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوگا اور جس کی نیت جتنی خالص اور پاک ہوگی، وہ اتنا ہی اللہ کے قریب ہوگا۔

اس لیے اگر اس کے دوست بننا چاہتے ہو، اس کے قریب آنا چاہتے ہو تو اپنے عمل کو ہر ملاٹ سے پاک کر دو۔ دین کو اپنا ذات کو مکمل طور پہ اپنا، معاشرے میں ملتی غلط باتوں کو صرف اس لیے صحیح مت کہو کہ وہ نسل و نسل تمھارے درمیان چلتی آرہی ہیں۔ یاد رکھو غلط کو غلط کہنا گناہ نہیں بلکہ اس پہ خاموشی اختیار کیے رکھنا گناہ ہے۔۔۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور ہمارے دلوں کو ایک دوسرے کے حق میں نرم کرے تاکہ ہم سچ بات کو بنا کسی حجت کے قبول کر سکیں۔ د آخرو دعا ان الحمد للہ رب العالمین۔" چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے شاہ صاحب نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"آج میں نے کھانا بنوایا ہے آپ سب اپنا حصہ لے کر جائیے گا۔" گاؤں والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ کبیر سنگھ کی طرف پلٹے تھے۔

"کبیر! تم حویلی جاؤ اور دیگوں کو مسجد میں لانے کا انتظام کرواؤ۔" انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس کا مان بڑھایا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔

"جو حکم شاہ صاحب۔" وہ سرشار سا مسجد سے نکل کے حویلی کی طرف چلا آیا تھا۔

پھر دیکیں مسجد میں لانے سے لے کر نماز کے بعد تقسیم۔۔۔ تک وہ شاہ صاحب اور ان کے ملازمین کے ساتھ گن رہا تھا، اس شد و مد سے کہ اسے پتا بھی نہیں تھا اور مسجد کے کھلے گیٹ سے، نظر آتے جن میں اسے بھاگ دوڑ کرتا دیکھ کے، باہر سے گزرتے چند قدم اپنی جگہ پہ پل بھر کو ساکت رہ گئے تھے۔

"اچھے! یہ دیکھ میں کیا لایا ہوں۔" وہ اپنے وحیان میں اپنے لاڈلے کو پکارتا گھر میں داخل ہوا لیکن آگے بڑھتے ہی اس کی نظر صحن میں بیٹھے خاندان والوں پہ پڑی تو وہ ہنسم سا گیا۔

"جا پتر کھا لے۔ تیرا پو تیرے لیے مسجد سے خیرات لے کے آیا ہے۔" ماما جی نے ایک کاٹ دار نظر اس کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے اجیت کو پکارا تو آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھی بلو، غصے سے شوہر کو دیکھتی منہ موڑ گئی۔ اجیت نے بھی ہوئی نظروں سے باپ کو دیکھا۔ وہ شروع سے ہی بہت کچھ دار اور حساس بچہ تھا۔ اس وقت بھی وہ سب کی آمد اور اپنے باپ سے ناراضی کی وجہ سے بہ خوبی واقف تھا، ہی مان سنگھ کے کہنے کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

کبیر خود کو سنبھالتا آگے بڑھا تھا۔

"سر یا کال ماما جی۔"

"سر یا کال کیوں پتر۔۔۔ سلام آکھ۔" (سر یا کال کیوں کہتے ہو پتر۔۔۔ سلام کہو۔) ان کی چوٹ پہ کبیر نے گڑ بڑا کے نظریں چرائیں تو مان سنگھ کے لیوں پہ طنزیہ مسکراہٹ آکھری۔

"آج اک کل تے دس کبیرے۔۔۔" ان کی تمہید نے کبیر کو ان کی طرف دیکھنے پہ مجبور کر دیا۔ "یہ تو کس کو دھوکا دے رہا ہے۔ ہمیں یا خود کو؟ یا اسے جو اوپر بیٹھا ہے؟" وہ استہزائیہ انداز میں بولے تو سب کے درمیان ان کا اسے یوں کٹھن میں کھڑا کرنا، کبیر کے اندر ناگواری کی لہر دوڑا گیا، مگر اس نے

خود کو کوئی بھی سخت بات کرنے سے روکا، صرف اس لیے کہ وہ اس کے بزرگ تھے۔

"میں ایسا کج نہیں کیا ماما جی۔" (میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ماما جی۔) وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو اس کا جواب ماں سنگھ کا خون کھولا گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"او! آدھا تیر اور آدھا بیر بن کے رہ گیا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے کج نہیں کیا؟ اولعت ہے تیری شکل پہ! "تیریاں چڑھائے وہ غصے سے گرے تھے۔ ان کی بات کبیر کا چہرہ سرخ کر گئی تھی۔ "تو اگر میری مری بہن کا پتر (بیٹا) نہ ہوتا تو سوں (قسم) کر دیتی تھے ان ہی مسلوں (مسلمانوں) کے کھڑے پہ وہ (کاٹ) کے رکھ دیتا جسے تو چاشتا پھرنا ہے۔" ان کی غضب ناکی نے وہاں سناٹا طاری کر دیا تھا۔

"مگر اب ہم میں سے کوئی یہ تماشا مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں۔" انھوں نے قطعیت سے ہاتھ اٹھایا۔ "ہم تجھے اپنی قوم اور اپنے مذہب کو یوں ذلیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے! تو یا تو ہم میں سے رہے گا یا پھر نہیں۔ فیصلہ تیرا اپنا ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنے درمیان دھو بی کا کتا نہیں چاہیے۔ سمجھ گیا!"

کبیر کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ یہ باتیں اگر اس کے ماموں کے بجائے کسی اور نے کی ہوتیں تو وہ اب تک اس کا منہ توڑ چکا ہوتا۔

سب کے سامنے اپنے شوہر کی اس درجہ ذلت بلو کا دل چیر گئی تھی۔ وہ دوپٹے میں منہ دیے ہنسنے لگی۔

"بس یا کج ہو؟" وہ بولا تو لہجہ تڑپا ہوا تھا۔ ماں سنگھ نے ایک نظر اس کے سرخ چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اور دیر دیر سے چلتے ہوئے اس کے مقابل آکھڑے ہوئے۔

"تھوڑی کو بوتی (بہت) جان پتر! اپنے پو (باپ) کی اولاد ہے یاں تو دوبارہ ہمیں اپنی محل (بات) دہرانے کا موقع نہ دیں۔" انھوں نے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ایسا نہ ہو کہ دودو خداؤں کے پیچھے بھاگنے والے کو، مرنے کے بعد نہ اک (آگ) ملے نہ مٹی! "سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھ گئے تو کبیر سنگھ کا وجود اپنی جگہ پہ پتھر کا ہو گیا۔

یہ وہ کیا کہہ گئے تھے؟ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اس نے سب کو ایک ایک کر کے ماما جی کے پیچھے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ بلو کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

کبیر سنگھ کی ساکت چپلوں میں جنبش ہوئی۔ اس کی نظریں اپنے بیٹے پہ آٹھری تھیں جو سہا ہوا دیوار سے لگا کھڑا تھا۔

"وہ اپنی اولاد کے لیے اس کے باپ کی پچان کا آخریون سا حوالہ چھوڑ کر جلنے والا تھا؟ کھ؟ مسلمان؟ یا پھر لادھ؟؟"

☆☆☆

"کتنا منع کیا تھا میں نے کہ خاندان سے باہر رشتہ کرنے کی بات مت کریں۔ مگر آپ لوگوں نے میری ایک نہیں سنی۔ اب دیکھ لیا اپنی من مانی کا نتیجہ۔ سارا خاندان لخت طاعت کر کے گیا ہے۔۔۔ آپ لوگوں کی وجہ سے آج مجھے ان لوگوں کی بھی باتیں سنتا ہوں جنہیں عام حالات میں مجھ سے بات کرتے ہوئے دو بار سوچنا پڑتا ہے۔" ہال میں پکراتے بختیار شاہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھیں۔ رشتے داروں کی دگھنے کی طویل عدالت ان دونوں بھائیوں کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ اور معصومہ شاہ مزے سے تماشا دیکھنے میں مگن تھیں۔

بہن کی اس اطلاع پہ کہ زرناب کا رشتہ لے

ہونے لگا ہے، ہاشم غصے سے بھرا اٹھا تھا، مگر وہ سفید حویلی جا کے سب کے سامنے ہلکا نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے بہن سے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ بھی کر کے اس رشتے کو ختم کر دے۔

"ہاں تو میں نے بھی منہ توڑ جواب دیا ہے اعتراض کرنے والوں کو۔ خاندان سے باہر شادی کوئی گناہ نہیں بلکہ ایک بے جا پابندی ہے، جس کی نذر میں اپنی بچی کو نہیں کر سکتی۔" بی بی نور بانو نے بھی آج ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی بیٹی کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر آج وہ سب کے دباؤ میں آکر کمزور پڑ گئیں تو آنے والے وقت میں ان کی بیٹی کا ہر جائز حق، یہ لوگ یونی غصب کر جائیں گے۔

"ہونہ، اور میری پچان؟ ان کا کیا ہوگا؟" بختیار شاہ نے خبی سے ماں کو دیکھا۔ "کیا آپ نہیں جانتیں کہ اگر آج ہم خاندان والوں کے خلاف گئے تو کل کو وہ بھی ہم سے کوئی نیا رشتہ نہیں جوڑیں گے۔"

"تمہیں اپنی اولاد کے مستقبل کی تو فکر ہے، مگر بہن کا کیا بنے گا؟" بھی اس بارے میں بھی سوچا ہے؟ "بی بی نور بانو کی آنکھوں میں دکھ آٹھرا۔

"ہاں تو کیا برائی ہے ہاشم میں؟" بختیار شاہ جھنجھلا کر بولے۔ "کیوں آپ اس کا رشتہ زرناب کے لیے قبول نہیں کرتیں؟" یہ سننے ہی معصومہ کا دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ ان کی شانہ روزِ محنت ہی تو تھی جو بختیار شاہ کو آخر کار اپنے سالے میں ہر برائی نظر آنا بند ہو گئی تھی۔

"تمہیں ہاشم میں کوئی برائی نظر نہیں آتی؟" بی بی نور بانو نے استغباب سے بیٹے کا چہرہ دیکھا تو وہ گڑبڑا کے نگاہیں چرائیں۔

"ہاں ہیں اس کے چند ایک ایسے شوق جو۔۔۔"

"جو بد قسمتی سے اپنے باپ کی آنکھیں بند

ہونے کے بعد تم دونوں بھائی بھی کھلم کھلا اپنا چکے ہو۔" بی بی نور بانو نے بنا کسی کچکا ہٹ کے پہلی بار آئینہ بیٹوں کے سامنے رکھا تو بختیار شاہ کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"چلو جی آج سے آپ دونوں بھی بد معاش ہو گئے کیونکہ میرے بھائی کو تو اس گھر میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے،" معصومہ نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے شوہر اور دیور کو دیکھا تو بختیار شاہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بہت اچھے! اگر ایسا ہے ماں جان تو میرا اب زرناب کے رشتے سے کوئی لینا دینا نہیں۔ وہ لڑکا اچھا نکلے یا برا، کم از کم مجھ جیسا خراب کردار کا آدمی اب اس کے بارے میں کچھ پتا کروانے والا نہیں۔ آپ جانیں اور آپ کا کام۔ ہاں جس دن تاریخ رہیں گی مجھے بتا دیجیے گا۔ میں اپنی عزت کو آپ کی لاڈلی کو اس گھر سے رخصت ضرور کر دوں گا، مگر اس کے بعد میرا آپ کے داماد اور بیٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔" قطعی لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے تو جہاں بی بی نور بانو کی آنکھیں بھرا آئیں وہیں معصومہ شاہ شوہر کو میدانِ ساس کے حوالے کرتا دیکھ کر بوکھلا گئیں۔

"ارے بات تو نہیں، جا کہاں رہے ہیں؟" مگر بختیار شاہ کہاں رکے والے تھے۔ انھیں جاتا دیکھ کے معصومہ نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

ہال میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔ شاہ بی بی نے ایک نظر آنسو جیتی بی بی نور بانو پر ڈالتے ہوئے اب تک تماشا شانی بنے بیٹے صبور شاہ کی طرف دیکھا۔ "تمہیں بھی ماں کو کوئی الزام دینا ہے تو دے لو۔"

صبور شاہ نے خفگی بھری ایک نظر ان پہ ڈالی اور اٹھ کر زینہ طے کر گیا۔ بیٹوں کا یہ افسوس ناک رویہ بی بی نور بانو کا دل بری طرح دکھا گیا۔ وہ بے اختیار ہونکے رو پڑیں۔

"بس۔ بس نور بانو۔" شاہ بی بی نے انہیں خود سے لگالیا۔

میں سلمان سے کہوں گی وہ خود زویب کا پتا کر دے گا۔۔۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی! بھائی کی پشت سہلاتے ہوئے ان کی شعلے برساتی نظریں معصومہ پہ جاٹھریں اور انہوں نے وہاں سے کھٹک جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔

☆☆☆

شاہ صاحب دربار میں موجود اپنے حجرے سے تہجد کی نماز پڑھ کے حوٹلی جانے کے ارادے سے باہر نکلے تو صحن میں پھیلی چاندنی میں درخت کے نیچے کسی کو بیٹھا دیکھ کے چونک گئے۔

"کون ہے؟" ایک قدم آگے بڑھ کر انہوں نے بلند آواز سے پوچھا تو دوسری طرف بت بنے بیٹھے وجود میں جنبش ہی ہوئی۔

"میں ہوں شاہ صاحب، کبیر۔" دھیرے سے جواب دیتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو پیر نظر حسین شاہ اسے اس وقت یہاں پائے پریشان ہو گئے۔

"خیر تو ہے کبیر؟" برآمدے کی بتی جلا کے وہ اس کے پاس چلے آئے۔

"دو پہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی ہے سرکار، مگر مینوں کو کوئی جواب ہی نہیں مل رہا۔" وہ عجیب کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

تو پیر نظر حسین شاہ سمجھ گئے کہ وہ کسی ذہنی خفاشار کا شکار ہے۔

"اچھا، چلو آؤ، ادھر بیٹھو۔" وہ اس کا بازو تھامے بیڑھیوں پہ آ بیٹھے۔ "اب بتاؤ کس سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہو؟" ان کے نرم لہجے پہ وہ کلائی میں پہنا کڑا گھمانے لگا۔

"ابھی کہ میں کی چائیاں آں؟ کی کر رہا آں؟" (کبھی کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ کیا کر رہا ہوں؟) اس نے افسردگی سے سر اٹھایا۔ "تینوں پتا

اے سرکار، اولوگ میرے گھر میں آ کے مینوں دھو لی کا کتا کہہ گئے ہیں۔۔۔ کہہ لیں، مجھے پرواہ نہیں۔ لیکن کل کو میرا پتر مجھے بے دھرم کہہ کے میرے کولوں (بجھ سے) منہ موڑ لے، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔" اس کی آواز بے اختیار بھڑائی تھی۔

پیر نظر حسین شاہ نے اک گہری سانس لی۔ "مجھے معلوم تھا، ایک دن ضرور آئے گا۔ جب تم جانا جاؤ گے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" ان کی بات پہ کبیر نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ کیسے جانتے تھے سرکار؟" اس کے سوال پہ شاہ صاحب کلمہ بھڑکھڑا دیے۔

"اس لیے کہ ایسی ہر محبت کبیر جس کی کوئی منزل نہ ہو وہ انسان کو بھی نہ بھی خود سے یہ سوال پوچھنے پہ مجبور کر ہی دیتی ہے کہ وہ آخر کس سمت میں اور کیوں بھاگ رہا ہے؟ اور تمہاری مجھ سے عقیدت، اس جگہ سے لگاؤ، ایسی ہی ایک محبت ہے جس کی بظاہر کوئی تک نہیں۔"

"تے فیر میں کی کر اس؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔ "آپ کو چھوڑ دوں؟ اس جگہ کو چھوڑ دوں؟"

"چھوڑ سکتے ہو تو چھوڑ دو کبیر۔ شاید اسی میں تمہاری بہتری ہے، ورنہ تمہارے لوگ تمہاری زندگی مشکل بنا دیں گے۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے تو کبیر کو لگا جیسے اس کا دل ویران ہو چلا ہو۔

"نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں آپ کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا سرکار! ان کا ہاتھ تھا وہ کسی بچے کی طرح سسک اٹھا تھا۔ اس کی اس درجہ محبت شاہ صاحب کی ہلکیس نم کر گئی تھی۔ بے اختیار ان کا ہاتھ اس کے شانے پہ آٹھمرا تھا۔

"لیکن یہ سچ ہے کبیر کہ تم اس طرح دو کشتیوں کے سوار بن کے نہیں رہ سکتے۔ یہ زندگی گزارنے کا

ڈھنگ نہیں۔"

"اگر زندگی گزارنے کے لیے ایک ہی رستہ (راستہ) چاہیے تو میں آپ کا رستہ چنوں گا۔ میں اس راہ گلوں گا (اس راہ پہ چلوں گا) جو مجھے آپ جیسا اچھا انسان بنا دے۔" آنسوؤں کے درمیان وہ انہیں اتنے اونچے مقام پہ بٹھا گیا کہ پیر سید نظر حسین شاہ کے پاس الفاظ ختم ہو گئے۔

"کبیر! جذبات کے باعث ان کی آواز لرز اٹھی تھی۔

"آپ۔ آپ مجھے کلمہ پڑھا دیں۔" اس نے بے قراری سے ان کا چہرہ دیکھا۔ تو شاہ صاحب پریشان ہو گئے۔

"کبیر، یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔" انہوں نے اس کا بازو تھاما۔

"اور میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں نے اپنی کشتی چن لی ہے سرکار۔" آنسو صاف کرتے ہوئے وہ بنا کی ہچکچاہٹ کے داغ صاف لہجے میں بولا تو سید نظر حسین شاہ کو اس کے چہرے پہ چھائی چٹانوں کی سی مضبوطی نے اس کے اٹل ارادوں کا پتا دے ڈالا۔

درد آئے پہ کھٹکے کی آواز پر صحن میں سوئی بلو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"کہاں چلا گیا تھا تو؟" اسے سامنے پائے بلو پریشانی سے بولی۔ کبیر کے قدم اپنی جگہ پہ جم گئے تھے۔

"ہن بولدا کیوں نہیں؟" (اب بولتے کیوں نہیں؟) اس کا پارہ مزید جڑھا تھا۔ لیکن دوسری جانب کبیر کو مسلسل خاموش پائے کے وہ بے اختیار چونک اٹھی تھی۔

"کبیر! وہ ہر بات بھلائے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی تو کبیر سنگھ کی نظریں اس کے چہرے پہ آٹھمراں۔

"تو۔ تو ٹھیک تو ہے ناں کبیر؟" اس نے

پریشانی سے اس کا بازو چھوا تو کبیر نے اپنے خشک پڑتے لبوں پہ زبان پھیری۔

"کبیر۔ کبیر نہیں عبداللہ۔۔۔ میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے بلو نے۔" وہ اکتاتے ہوئے بولا تو بلونت گور یوں اچھلی جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"نہیں۔ اے نہیں ہوسکتا۔" (نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔) وہ اسے دشت سے دیکھتی اٹے قدموں پیچھے ہٹی تھی۔ اس کی زرد پڑتی رحمت عبداللہ کو پریشان کر گئی تھی۔

"بلو نے؟" وہ گھبرا کر اس کی طرف بڑھا تھا۔ مگر بلو ہونٹوں پہ ہاتھ رکھے بھاگتی ہوئی کمرے میں جا کے بند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کچے راستے پہ دھول اڑاتی وہ گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ اندر پھیلی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے ڈرائیور نے وند اسکرین سے نظریں ہٹائی تھیں اور ایک نظر اپنے ساتھ والی سیٹ پہ ڈالی تھی۔ جہاں اس کے صاحب کھڑکی سے بھاگتے منظر پہ نگاہیں جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ وہ پوچھتے بہانہ نہ رکھتا تھا۔

"آپ پہلے یہاں آئے ہیں کبھی؟" "نہیں۔" دھیرے سے کہتا وہ رخ پھیر گیا تو اس نے بھی اپنا دھیان ڈرائیور کے مرکوز کر دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان کی گاڑی تھانہ نور دالاں کی حدود میں داخل ہو کر ایک جھٹکے سے رکی تو یہاں وہاں کھمبے عملے نے اپنے اپنے مشغلے ترک کرتے ہوئے، چونک کر اس نئے ماڈل کی سفید کار کو دیکھا جو ان کے لیے انجان تھی۔ لیکن سبز رنگ کی سرکاری نمبر پلیٹ پہ نگاہ پڑتے ہی ان سب کے توتے اڑ گئے۔

"میں نے جو باتیں سمجھائی ہیں ان کا خیال رکھنا

رفاقت!" دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے وہ ڈرائیور کی طرف پلٹا۔

"آپ بے فکر ہیں سرجی۔" اس کے جواب پہ وہ دھیرے سے مسکراتا ہر لنگا تو اس کا بارعب اور دھبہ سرا پا دیکھ کے سب ہی ہنسنے لگے۔

"السلام علیکم جناب۔" ایک سپاہی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے دھوپ کا چشمہ اتارا۔ نیلی آنکھیں ارد گرد کا جائزہ لیتی مقابل پہ آنکھیں۔

"یہاں کا حوالدار اور ایس ایچ او کہاں ہیں؟" اس کے حکم پہ لہجے پہ سپاہی کی گھبراہٹ دوچند ہوئی۔

"اندر ہیں جناب۔"

"بلاؤ انہیں۔" اس نے اٹھائے صاف اور کیا تو اس کے تیور سپاہی کو پریشان کر گئے۔

"مگر آپ ہیں کون سرجی؟"

"سیف علی جنگ۔۔۔۔۔ اس علاقے کا نیا اے ایس پی۔" اور سامنے کھڑے سپاہی کی رنگت لمحے کے ہزاروں جیسے من میں ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کبیر سنگھ کے اسلام قبول کرنے کی خبر چاروں طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ سارے سکھ گھرانوں کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ لیکن چونکہ اس معاملے میں ان کا اپنا سکھ ہی کھوٹا تھا سو وہ کسی کو بھی الزام نہ دے سکے تھے۔ البتہ بلونت کو رکھ کر عبد اللہ کے گھر سے لے جانے کے لیے سب نے اڑی چوٹی کا زور لگایا تھا مگر وہ اپنی اگلی اولاد کو چھوڑ کر جانے کے لیے کسی طور آمادہ نہ ہوئی تھی۔

اجیت کو عبد اللہ نے، در در کی ٹھوکروں کی نذر کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا، جس کے بعد بلوکا اس دہلیز کو پار کرنا جیسے ناممکن ہو گیا تھا۔ سزا کے طور پہ ساری سکھ برادری نے عبد اللہ کے ساتھ ساتھ بلونت

کود سے بھی تعلق ختم کر لیا تھا۔

بلوکا جیسے چپ لگ گئی تھی۔ سارا سارا دن سر جھکائے وہ نجانے کن سوچوں اور کاموں میں مصروف رہتی تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اور رات ہونے پہ وہ اسی خاموشی کی چادر اوڑھے ساتھ والے کمرے میں جا کے بند ہو جاتی تھی۔ ملنا ملنا، ہنسنا بولنا اس نے ہر چیز ترک کر دی تھی۔ اس کی یہ حالت عبد اللہ کے لیے حد تکلیف کا باعث تھی۔

قبول اسلام کے بعد جس دن عبد اللہ نے اپنے بال کٹوائے تھے اور اپنی ڈاڑھی کو اسلامی خطہ دیا تھا اس دن بلونت کو پھوٹ پھوٹ کر روٹی تھی۔ اس روز اس نے اپنے شوہر، اپنے کبیر سے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ وہ اب اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھنے کی روداد نہ رہی تھی۔

اس تناؤ بھرے ماحول نے اجیت کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ اپنے باپ کے مذہب بدلنے کے طغیوں نے اس کے اندر سوالوں کا ایک انبار لگا دیا تھا جسے عبد اللہ وقتاً فوقتاً اس کی سمجھ کے مطابق کم کرنے کو کوشش کرتا رہتا تھا مگر دل کا بدلنا کسی اور سمت کھینچا اس کیفیت کو وہ بھلا ایک بچے تک کیسے پہنچا سکتا تھا؟ یہ تو بس وقت ہی تھا جو اس کا نکتہ نظر اس کی اولاد پہ واضح کر کے اسے اپنے بیٹے کی نظر میں صحیح یا غلط ثابت کر سکتا تھا۔

"ابا۔۔۔۔۔ تو روٹی کیوں نہیں کھا رہا؟" اجیت نے سوچوں میں ڈوبے عبد اللہ کا بازو ہلایا۔

"کھا رہا ہوں پتر۔" بلوکا سانس لیتے ہوئے اس نے خالی نظروں سے اپنے پہلو کو دیکھا جو ویران پڑا تھا۔ بلوکا ان دونوں باپ بیٹے کے آگے رات کا کھانا رکھ کے خود کمرے میں چلی گئی تھی۔ اجیت نے باپ کی آنکھوں میں پھیلی افسردگی کے رنگوں کو پہنچوئی محسوس کر لیا تھا۔

"ابا! عبد اللہ کی نظریں اپنے لاڈلے کے

کملائے ہوئے چہرے پہ آنکھیں۔" بے بے کب تک ہم سے ناراض رہے گی؟" اور اس کے دل میں جیسے اک ٹیس سی اٹھی تھی۔ اس کا مصوم بچہ دنوں میں ہی کتنا بڑا کتنا حساس ہو گیا تھا۔

"چل آ! چل کر تیری ماں کو مانتے ہیں۔" اچانک اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے بیٹے کا ہاتھ تھامنا تو وہ بے طرح خوش ہو گیا۔

باپ بیٹا چلتے ہوئے برآمدے میں بنے کمرے تک پہنچو تو اجیت نے رک کر باپ کی طرف دیکھا۔

"تو اور (ادھر) ہی رک ابا۔ پہلے میں جاتا ہوں۔" اور عبد اللہ بیٹے کی اس درجہ ہوشیاری پہ مسکرایا۔

"چنگا، چانیر۔" (ٹھیک ہے جاؤ پھر۔) اجیت دروازہ کھول کے اندر چلا گیا۔ عبد اللہ اک گھری سانس لیتا باہر ٹپٹنے لگا۔ دل میں اپنی بلوکا منانے کے ڈھیروں پھلتے تھیں وہ دیکھتا دیکھتا ہی تھا کہ روہا سنا سنا اجیت گھبرایا ہوا باہر آیا۔

"ابا! ابا! بے کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ اکھیاں دی نہیں کھول رہی۔" اور عبد اللہ اسے ہٹاتا سر پٹ کمرے کی جانب بھاگتا تھا۔

"بلونتے!" چار پائی پہ چت پڑے وجود پہ جھکتے ہوئے اس نے پریشانی سے اس کے گال تھپتھپاتے تھے۔ لیکن بے سود۔ "اجیت، پانزوی (پانی) لے کے آ۔" حواس باختہ سا کہتا وہ تیزی سے چار پائی پہ بیٹھا تھا۔ اور جب ہی اس کا ہاتھ بلوکا کے ہاتھ سے جا ٹکرایا تھا جو اٹھنے ہی لیسے بے جان سا چار پائی سے نیچے جھوٹ لگتا تھا۔

"بلوکا! وحشت سے اسے پکارتے ہوئے اس نے بلونت کو رک کے مساکت وجود کو دونوں شانوں سے تھام کر ہتھکھوڑا ڈالا تھا مگر۔۔۔

باپ کے رونے کی آواز پہ پانی کا گلاس اجیت

کے ننھے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پہ گیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا کمرے میں آیا تھا، جہاں اپنے ابا کو سینے سے لگائے، زور زور سے روتا دیکھ کے اس کا چھوٹا سادہ کانپ اٹھا تھا۔

گھر میں پیدا ہوئے نئے تناؤ نے زرناب کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ صدف اس کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے شاہ بی بی سے اجازت لے کر اسے حویلی سے باہر لے آئی تھی۔ کئی میٹر پر پھیلے باغات ان کی ملکیت تھے۔ یہاں وہ بغیر کسی جھجک کے آرام سے گھوم پھر سکتی تھیں۔ ملازمہ کو ساتھ لیے، چائے کا سامان، ہمراہ اٹھائے صدف نے اس چھوٹی سی آؤٹنگ کو باقاعدہ پلنگ کارنگ دے دیا تھا۔

کھلی ہوا، بہتے پانی اور اس کے نٹ کھٹ سے بھتیوں کی شرارتوں نے جلد ہی زرناب کا دھیان بٹا دیا تھا۔ اسے پھر سے مسکراتا دیکھ کے صدف نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ رات سے درو کر زرناب کی حالت غیر ہو چکی تھی۔

"میں ذرا چاچا نورانی کے گھر والوں سے حال احوال پوچھنے جا رہی ہوں، تم ساتھ چلو گی؟" باغات کے پرانے ملازم کا نام لیتے ہوئے زرناب نے صدف کی طرف دیکھا۔

"نہ بابا۔ میں ان شیطانوں کو اکیلے چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتی۔" عمر کو یہ مشکل تمام قابو کرتے ہوئے اس نے اس کی کیلی شرٹ اتاری۔

"ٹھیک ہے میں پھر ابھی آتی ہوں۔" کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اپنے کپڑے جھاڑے۔

"فضل، بی بی کے ساتھ جاؤ۔" صدف نے چائے پیتی فضیلت سے کہا تو زرناب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"تم چائے پیو، میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔"

"خیال سے جانا۔" صدف کی "امانتا" بھری پکار نے آگے بڑھتی زرناب کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

صد شکر تھا کہ اس کی زندگی میں ابھی حقیقی محبت کی چاشنی میں ڈوبے کچھ رشتے موجود تھے مگر نہ جو روپ اسے قسمت چند نام نہاد اپنوں کا دکھا چکی تھی اس کے بعد تو اگر وہ اپنی ذات پر سے بھی اعتبار کو ہٹاتی تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی۔ یا سیت سے سوچتی وہ اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی جب اچانک درختوں کے درمیان سے نکل کر کوئی اس کی راہ میں آیا تھا۔ زرناب کے منہ سے جھجکتے نکلتے پتی تھی۔

"آہ! کتنے دنوں بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں میں۔" ہاشم کی عامیانہ نظروں اور الفاظ نے زرناب کا چہرہ سرخ کر دیا۔ وہ سختی سے لب بھینچے تیزی سے پلٹی تھی کہ ہاشم نے ایک ہی جست میں اسے کلائی سے پکڑتے ہوئے قریب لگے درخت کی طرف دھکیل دیا تھا۔ زرناب کا کندھا بہت زور سے تنے سے ٹکرایا تھا۔ وہ بے اختیار کراہ اٹھی تھی۔

"تمہارے سامنے تمہارا باپ نہیں، ہاشم رجب حسین شاہ کھڑا ہے۔ یہ نخرے کسی اور کو دکھانا۔ سمجھیں!" غصے سے اسے دیکھتا وہ غرا کر بولا۔ زرناب نے سرعت سے خود کو سنبھالا۔

"اور تمہارے سامنے بھی کسی مزارعے کی بیٹی نہیں بلکہ پیر سید نظر حسین شاہ کی عزت کھڑی ہے اس لیے اپنی حد میں رہو!" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ غصے سے بولی تو ہاشم کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میری حد ابھی تم لوگوں نے دیکھی کہاں ہے۔" اس کی مسکراہٹ نفرت میں ڈوبنے لگی۔ "قسم خدا کی! جس دن کسی اور کی ڈولی میں بیٹھی ناں، میں تمہیں اور تمہارا ہاتھ تھامنے والے کو سفید حویلی کی دیہیز پہ ہی ختم کر دوں گا!" اس نے اس زور سے مٹھیاں بھینچیں کہ ہاتھوں کی رکیں ابھر آئیں۔

"تم مجھے خوف زدہ کرنے آئے ہو؟" زرناب

کی پیشانی پہ موجود بلی گہرے ہو گئے۔

"نہیں۔ یہ باور کروانے آیا ہوں کہ تم صرف ہاشم شاہ کی ہو۔"

"ہونہ! میں اور تمہاری؟" زرناب طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ "جو شخص سالوں پہلے میرے قابل نہیں تھا، میں آج اس کی دوسری بیوی بنوں گی؟ جاؤ ہاشم شاہ! جا کے اپنا منہ دھو!" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس شخص کی ہر خوش فہمی کے پرچے اڑا دے۔ ہاشم کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پھوست ہو گئے۔

"بہت۔ بہت۔ بہت بڑی بات کر دی ہے تم نے زرناب نظر حسین!" لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "اب تو اگر تمہیں اٹھا کر بھی اپنے قدموں میں گراتا پڑا تو گراؤں گا۔"

اس کی بات پہ زرناب نے دانت پہ دانت جمائے اسے گھورا۔ اگلے ہی بل وہ اپنا سارا خوف پس پشت ڈالتی اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔

"اور مجھے اگر خود کو ختم کر کے بھی تمہاری جیت کو ہار میں بدلنا پڑا تو بدلوں کی!"

"ٹھیک ہے پھر۔ دیکھتے ہیں کون کس کو دھول چٹاتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ اچانک اس کی طرف جھکا تو زرناب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹی۔ ہاشم خباثت سے ہنس پڑا۔

"کب تک؟ کب تک میری جان؟" اسے دیکھتا وہ کمینگی سے ٹنگنا۔ زرناب کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتی واپسی کے لیے پلٹی۔ ہاشم نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

"آج کے آج جا کر اس رشتے کو ختم کر داؤ۔ ورنہ وہ حال کروں گا اس شہزادے کا کہ گھر والے صورت تک پہچان نہیں پائیں گے۔" یہ آواز بلند بولتا وہ زرناب کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گیا تھا۔ مگر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی کھٹکی نہیں کی تھی۔

زرناب کو بنا کوئی رد عمل دکھائے آگے بڑھتا دیکھ کے ہاشم شاہ کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے تھے۔

"تمہاری یہ بے نیازی نہ تم سے چھین لی زرناب نظر حسین شاہ تو ہاشم نام نہیں میرا!" اس کی پشت پہ نظریں جمائے وہ جیسے ایک ان دیکھی آگم میں چلنے لگا تھا۔

☆☆☆

"تاریخ گواہ ہے، دین اسلام قبول کرنے والوں کو اللہ پاک نے ہر دور میں آزمایا ہے۔۔۔ تمہاری پہلی آزمائش تمہارے اپنوں کا تمہیں چھوڑنا تھا۔ تمہاری دوسری آزمائش تمہاری محبت کرنے والی بیوی کی جدائی ہے۔ یہ سوچنا کہ بلونت کور کی موت کے ذمہ دار تم ہو بالکل غلط ہے۔ سب کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ تمہاری بیوی نے اسی دن اور اسی گھڑی اس دنیا سے جانا تھا، پھر چاہے تم کبیر سنگھ رہتے یا عبداللہ بن جاتے۔ تمہارا اور اس کا اتنا ہی ساتھ لکھا تھا۔" شاہ صاحب نے اپنے برابر سر جھکائے بیٹھے عبداللہ کا شانہ پتھرایا۔

بلو کی موت کو آج چوتھا دن تھا۔ اور عبداللہ کا غم کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بلو کی اس اچانک موت اور اپنے گھر کی بربادی کا ذمہ دار خود کو ٹھہرا رہا تھا۔ اور کیوں نہ ٹھہراتا؟ بلونت کور کے رشتے داروں اور ساری سگھ برادری میں ایسا کون تھا جس نے اسے لعن طعن نہ کی تھی۔ اس کے نقصان کو داہے گرد کی مار نہ گردانا تھا۔ وہ سب سچے ہوئے تھے اور اس کا منہ کالا ہوا تھا۔ وہ خود کو مجرم نہ گردانتا تو اور کیا کرتا؟

گاؤں کے ہر فرد نے یہ تماشا دیکھا تھا۔ شاہ صاحب بھی انجان نہ تھے۔ وہ بس اس گھڑی کے منتظر تھے، جب عبداللہ ذہنی اور جذباتی طور پہ اس

قابل ہو جاتا کہ ان کے الفاظ کو سمجھ سکے۔ اور آج ان کے نزدیک وہ وقت آ گیا تھا جب ہی تو وہ خود چل کر اس کے گھر تک آئے تھے۔

ادرا ب بہت محبت سے اسے ساتھ لیے بیٹھے تھے۔

"تمہارے دل میں شاید یہ خیال بھی آتا ہو کہ تم غلط فہمی میں سوار ہو گئے ہو۔ اور یہ کہ شاید تم پہلے صحیح تھے۔ لیکن جب تم قرآن پاک کا ترجمہ پڑھو گے تو یہ جانو گے عبداللہ کہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں سارے مومنوں کو بتا دیا ہے کہ وہ ان کا امتحان لے گا، اور یہ تمہارا امتحان ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا عبداللہ، جو اس سے محبت کا دعویدار ہے وہ اس نقصان سے پریشان ہو کر، دنیا کی کڑوی باتوں سے گھبرا کر کہیں اسے چھوڑ تو نہیں دے گا؟" وہ نرم لہجے میں بولے تو عبداللہ نے سراٹھا کر ان کا مشفق چہرہ دیکھا۔

"میں اسے نہیں چھوڑنا چاہتا سرکار۔ لیکن یہ وی (بھی) سچ ہے کہ میں سوچی بے گیا آں۔" (سوچ میں پڑ گیا ہوں) وہ بولا تو اس کی آواز اندیشوں کے بارے بھر آئی۔ "میں۔ میں کیا کروں جی؟" اس نے گھبرا کر ان کا ہاتھ تھاما۔

"صبر کرو۔ اور یہ یاد رکھو کہ تم صرف اپنے اللہ کے بندے ہو، یعنی تمہاری جان، مال، اولاد سب تمہارے رب کی عطا کردہ ہیں، وہی تمہارا مالک ہے۔ اور مالکوں کو تو کبھی بھی اپنی چیز واپس لینے کا اختیار ہوتا ہے ناں عبداللہ۔" وہ دھیرے سے مسکرائے تو بغور ان کی بات سنتے عبداللہ کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"شاباش۔ تم ایک سچے مسلمان ہو، اس لیے اب تم اپنے اس نقصان کا اور غم نہیں کرو گے۔۔۔ کل سے میں تمہیں ان شاء اللہ قرآن پاک کی تعلیم دوں گا۔ پھر تمہیں پتا چلے گا کہ تم کتنے سچے راستے پہ

ہو۔ "اور عبد اللہ کے چہرے پہ پھیلے اضطراب میں کچھ کمی ہوئی۔

اور پھر پورے نورے والاں نے دیکھا تھا کہ کس طرح ایک غیر تعلیم یافتہ نو مسلم کو پیر سید نظر حسین شاہ نے اپنی تربیت سے ایمان کامل رکھنے والا مسلمان بنا دیا تھا۔ اس کار خیر میں سفید حویلی کی تینوں خواتین نے، نئے اجیت کی ذمہ داری اٹھا کر شاہ صاحب کی بھرپور مدد کی تھی۔

شاہ صاحب کے کہنے پہ عبد اللہ اپنے بیٹے کو لے کر حویلی آ گیا تھا، جہاں ان کی رہائش کا بندوبست دیگر ملازمین کے ساتھ کروایا گیا تھا۔

دربار اور مسجد کا سارا انتظام شاہ صاحب نے عبد اللہ کو سونپ دیا تھا۔ پورے گاؤں میں اس کی عزت و مرتبے میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا حویلی کے اپنے بچوں کی طرح گھر کے اندر باہر بھاگتا پھرتا تھا۔ بختیار شاہ سمیت کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اجیت کو سخت نظر سے دیکھ بھی سکتا۔ اس کی تعلیم و تربیت پہ شاہ صاحب خصوصی توجہ دیتے تھے۔ گاؤں کے اسکول کے علاوہ انھوں نے گھر پہ اس کے لیے انگریزی تعلیم کا علیحدہ سے بندوبست کروایا تھا۔ وہ اسے آنے والے وقت میں اپنا دوست راست بنانے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کی یہ محبت عبد اللہ کو ہر آن ان کا احسان مند کیے دیتی تھی۔

دیر سے دیر شاہ صاحب کی میٹھی شخصیت اجیت پہ بھی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ وہ باپ کو ان کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھتا، دینی باتیں کرتے سنتا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل ان باتوں کی طرف مائل ہونے لگتا۔

پلک جھپکتے میں دو سال کا عرصہ گزرا تھا۔ شاہ بی بی کے مشورے کے مطابق سید نظر حسین شاہ، بختیار شاہ کو زمین داری کی طرف لے آئے تھے، اور اس بار انھیں بختیار شاہ نے مایوس نہیں کیا تھا۔ بیٹے کو احسن

طریقے سے اپنی ذمہ داریاں نبھاتا دیکھ کر شاہ صاحب نے اس کا گھر بسانے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ یوں جب زرباب محض دس برس کی تھی تو اٹھارہ سالہ محصومہ بیاءہ کر سفید حویلی چلی آئی تھی۔ اس دوران عبد اللہ کی خواہش یہ بارہ سالہ اجیت کو شاہ صاحب نے، اس کی ایماء پر بھگہ بڑھا دیا تھا۔ وہ دن عبد اللہ کی زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔ اس روز اللہ نے اس کے بیٹے کو بھی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نئی پہچان عطا کر کے دین و دنیا کی بھلائی عطا کر دی تھی۔

☆☆☆

"نیا اے ایس پی؟" صوفے پہ براجمان بختیار شاہ ایک جھٹکے سے سیدھے ہوئے تھے۔ "وہ کب آیا؟" انھوں نے مقابل بیٹھے ایس ایچ او کو دیکھا۔ ان کی لاعلمی ایس ایچ او کے جھٹکے چھڑا گئی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ شاہ جی ہر بات کی طرح اس ضروری خبر سے بھی آگاہ ہوں گے لیکن انھیں انجان پاکے اسے اپنی متوقع شامت صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

"آج صبح سرکار۔" انھیں دیکھتے ہوئے اس نے تھوک ٹھکا۔

"اور تو مجھے اب بتا رہا ہے جب وہ مر پہ مسلط ہو چکا ہے۔" تیوریاں چڑھائے وہ بہ آواز بلند دھاڑے تو ایس ایچ او نظریں جھکا گیا۔ اس خبر نے صبور شاہ کو اس روز پارٹی میں ہونے والی گفتگو یاد دلادی۔

"ادھو۔۔۔" اس نے بے اختیار اپنی پیشانی مسلی تو بختیار شاہ نے پلٹ کر بھائی کی طرف دیکھا۔ "اصل میں بھائی مجھے اس بارے میں تھوڑی بہت سن گمن پارٹی والے دن ہی ہاشم سے پتا چل گئی تھی۔ اور میں آپ سے اسے وٹکس بھی کرنے والا تھا لیکن پھر وہ رشتے والی بات کو لے کر ایسی الجھن پڑی کہ یہ بات میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔" وہ ان کی استغماہ نظر سے جواب میں بولا۔

"تمہارا نہیں، ان حرام خوروں کا کام تھا جنہیں میں بٹھا کر کھلا رہا ہوں۔" اس کی بات پہ انھوں نے غصے سے ایس ایچ او کو گھورا۔

"قسم لے لیں سرکار، ہمیں تو خود کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بالکل ہی اچانک نازل ہوا ہے۔" وہ اپنی پوزیشن واضح کرنے کو جلدی سے بولا۔

"او ہوتا تک نہ!" (او زیادہ بکواس نہ کرو) انھوں نے بدزبانی سے سر جھٹکا۔ "یہ جو اتنے مہینوں سے خبریں گرم تھیں، کسی افسر کے آنے کی، تب کیوں نہ کان دھرے تو نے؟" سو رہا تھا کیا؟

"ایک عرصہ ہو گیا سرکار! یہاں کوئی ڈاڈا افسر آیا ہی نہیں۔ اب مجھے کیا پتا کہ اس بار۔۔۔" وہ منہ لکے چپ ہو گیا تو بختیار شاہ نے اک گہری سانس لی۔

سچ ہی تو کہہ رہا تھا، خود انھوں نے بھی تو ان خبروں کو غیر اہم جان کے اپنی ساری توجہ سیاسی منظر نامے اور جوڑ توڑ پہ مرکوز کر دی تھی۔ غفلت تو ان سے بھی ہوتی تھی۔

"کون ہے اور کس قماش کا ہے؟" وہ بولے تو آواز میں پہلا سا غصہ نہ تھا۔ ایس ایچ او نے دل میں شکر ادا کیا۔

"لہور (لاہور) شہر کا ہے جی۔ کسی پرو فیسر کا بیٹا ہے۔ دو سال پہلے مقابلے کا امتحان پاس کیا ہے۔ سنا ہے بڑی سچی موت (الٹے دماغ) والا بندہ ہے۔" اس نے آج کے آج حاصل کی گئی تفصیل بڑے شاہ جی کے گوش گزار کی۔

"ہوں۔۔۔" مونچھوں کو تاؤ دیتے انھوں نے پرسوج انداز میں ہکا را بھرا۔ "نام کیا ہے؟" "سیف علی جنگ۔" ایس ایچ او نے جواب دیا۔

"بال بچے وار ہے؟" "نہ جی۔" بختیار شاہ نے سر ہلاتے ہوئے صوفے کی پشت سے کمر نکالی۔

"صہورا" چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد انھوں نے بھائی کی طرف دیکھا۔

"جی بھائی۔" "کل جا کے ذرا ملاقات تو کرو ناں اس بچی مت والے سے۔" ان کے استہزاءیہ انداز پہ صبور شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور ہاتھ ذرا ہولا رکھنا۔ سی ایس پی آفسر ہے۔ اس کے اختیارات کی حد ایس کی کے اختیارات کو چھوٹی ہے۔" انھوں نے اسے متنبہ کیا۔

"آپ بے فکر ہیں۔" صبور شاہ نے ٹانگ پہ ٹانگ جرائی۔ "کل و جیتا ہوں میں، کتنے پانی میں ہیں موصوف۔" اور ایس ایچ او جیل کو اپنی پریشانی آدھی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اب شاہ جی جانتے اور ان کا کام، وہ تو "سکھا" (مطمئن) ہو گیا تھا۔

اگلے دن جس وقت صبور شاہ نے تھانہ نور والاں کی حدود میں قدم رکھا، وہ بے اختیار ٹھٹھک گیا۔ ایس ایچ او سے لے کر سپاہی تک مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی اپنی ڈیوٹی پہ حاضر تھے۔

وہ سیدھا اس افسر شاہی کے کمرے میں چلا آیا جو کسی فائل پہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

دستک کی آواز پہ اپنے دھیان میں بیٹھے سیف علی جنگ نے نظریں اٹھائی تھیں اور دروازے میں کھڑی ہستی کو دیکھ کے اس کی نگاہیں آنے والے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔ صبور شاہ کروڑوں سے چلتا میز کے دوسری جانب اکھڑا ہوا تھا۔

"مجھے سید صبور نظر حسین شاہ کہتے ہیں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سیف علی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور میں سیف علی جنگ۔" ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے بھاری لہجے میں اپنا تعارف کروایا تو غیر ارادی طور پہ صبور شاہ کی نظریں اس کا جائزہ لینے پہ مجبور ہو گئیں۔

اونچا لباقہ، مضبوط جسامت اور سرخ و سفید رنگت۔ جس پہ سیاہ مونچھیں اور بھری بھری سی فیشی ڈاڑھی بے حد بچ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک بھرپور اور چھا جانے والی شخصیت کا مالک تھا۔

"تقریف رکھیں۔" کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنی نشست سنبھالی۔ صبور شاہ قسداً پھیل کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"تو آپ یہاں اے ایس پی تعینات ہوئے ہیں۔" اس کے چہرے پہ نظریں جمائے صبور شاہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی۔" وہ ہنسنا کی تاثر کے بولا۔

"کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟"

"جب آپ جانتے ہیں صبور صاحب تو کیوں یہ فارمیٹی ہمارا ہے ہیں۔" کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سیف استہزائیہ انداز میں مسکرایا تو صبور شاہ بے اختیار لب بھیج بیٹھ گیا۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے بندھ سی گئیں اور تب ہی بالکل اچانک صبور کو لگا جیسے اس نے آنکھوں کے اس تاثر کو نہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں؟ اس نے یادداشت پہ زور دیا، مگر نیلی آنکھوں والا کوئی بھی شخص اسے یاد آ کے نہیں دیا۔ اپنے اندر سر اٹھاتے اس عجیب سے احساس کو جھٹکتے ہوئے وہ آگے کو جھک آیا۔

"پھر تو تمہیں بھی پتا ہوگا سیف علی جنگ کہ یہ علاقہ کس کا ہے؟" اس کے انداز پر تو سیف کی نیلی آنکھوں میں سر بھری سی پھیل گئی۔

"جانتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" صبور پرسکون سا مسکرایا۔ "اب مزید جان لو کہ اس علاقے اور یہاں کے لوگوں کے مالک ہیں ہم۔ تم نے یہاں رہنا ہے تو ضرور رہو۔ لیکن یہاں راج کرنے کے خواب کبھی مت دیکھنا۔"

"میں خوابوں پہ نہیں عمل پہ یقین رکھتا ہوں سید صبور شاہ!" اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے وہ اس کے نام پہ زور دیتے ہوئے بولا تو مقابل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"یعنی دوسرے لفظوں میں تم باغی ہو۔"

"نہیں سید! لفظوں میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ کسی سے حکم لینا میری سرشت میں شامل نہیں۔" مضبوط لہجے میں کہتا ہوا وہ دونوں بازو میز پہ ٹکائے آگے کو جھک آیا تو صبور شاہ چند ثانیے اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے پھر ہم اپنی مرضی چلاؤ۔۔۔۔۔ ہم اپنی طاقت آزمائیں گے۔ لیکن اگر تمہارا دل کر چلنے کا ارادہ ہے تو ہماری طرف سے دوستی کا دروازہ کھلا ہے، چلے آنا۔"

"آخر کا شکر ہے۔" بے نیازی سے جواب دیتا وہ سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا تو اس کا انداز صبور شاہ کو سرتاپا سا لگا گیا۔ شعلے برسانی نظروں سے اس کے جھکے سر کو دیکھتا وہ لب بھیجے ایک جھٹکے سے پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی سیف علی جنگ نے ہاتھ مار کر سامنے کھلی فائل بند کر دی۔

"تم لوگوں کے راج کے دن ختم ہوئے صبور شاہ۔ اب دیکھنا میں کون کون سے کھاتے کھاتا ہوں!" غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں جمائے اس نے اس زور سے ہاتھ میں پکڑا قلم دبایا کہ وہ اس کی انگلیوں کے درمیان چب گیا۔

☆☆☆

"مصطفیٰ!"

اپنے نام کی پکار پہ حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے نوجوان نے لان کی طرف دیکھا تھا اور شاہ بی بی کو وہاں کرسی پہ براہِ تمان دیکھ کے وہ ان کی جانب چلا آیا۔

"السلام علیکم شاہ بی بی۔" وہ مودب سا ان کے پاس آکھڑا ہوا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔۔۔ کیسی طبیعت ہے اب عبداللہ کی؟" انھوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو اپنے کھڑے کھڑے نقوش اور چلتی ہوئی رنگت کے ساتھ دل موہ لینے والی کشش رکھتا تھا۔ اس کا یہ رنگ و روپ بلو کی مریحونی منت تھا۔ وہ گھٹنے بالوں والی ایک خوبصورت مسکھنی تھی، جس کا رنگ چاندی کی طرح چمکتا تھا۔ مصطفیٰ کے بال بھی ماں کی طرح گھنے اور آنکھیں سیاہ کالی تھیں۔

بچپن اور جوانی کی سرحد پہ کھڑا وہ اب اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔ اس کی میٹھی مسکس، کچھ کچھ گہری ہونے لگی تھیں۔ قد میں بھی ٹھیک ٹھاک اضافہ ہوا تھا لیکن جسم فی الحال صرف لمبائی پہ ہی اتکا کیے ہوئے تھا، چوڑائی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

"بہتر ہیں۔" اس کی نشست و برخاست اور گفتگو میں حویلی کی تربیت کے باعث زمین و آسمان کا فرق آچکا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" شاہ بی بی مطمئن ہوئی تھیں۔ ان گزرے سالوں میں عبداللہ کو دسے کا مرض ہو گیا تھا جس کے باعث اس کی طبیعت اکثر نرم گرم رہتی تھی۔

"ایسا ہے کہ آج مجھے اور بچیوں کو شہر لے جانا، انھوں نے شادی کے لیے کچھ خریداری کرنی ہے۔" انھوں نے خاندان میں ہونے والی ایک شادی کا حوالہ دیا تو مصطفیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جی بہتر۔" اس نے جب سے ڈرائیونگ سیکھی تھی یہ ذمہ داری بھی اس پہ آگئی تھی، کیونکہ شاہ صاحب اور گھر کی خواتین کے لیے اس میں اور صبور شاہ میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہ ایک بات تھی کہ اس میں اور شہری رنگ ڈھنگ میں جوان ہوتے صبور شاہ میں

وقت گزرنے کے ساتھ مالک و ملازم والا ایک فاصلہ خود بہ خود آگیا تھا۔ جس میں بہت بڑا ہاتھ بختیار شاہ کا بھی تھا، جوان گزرے ماہ و سال میں غرور اور طاقت کی چلتی پھرتی تصویر بن چکے تھے۔

مصومہ سے شادی کے بعد بڑی حویلی کے سید رجب حسین شاہ اور ان کے بیٹوں بیٹیوں کے رنگ ڈھنگ نے تند خو اور اکھڑ مزاج بختیار شاہ پہ خوب اثر دکھایا تھا۔ وہ دونوں میں ہی جاہ و حشمت کے غرور میں ڈوبے ایک روایتی جاگیر دار بننے چلے گئے تھے جس کا اثر صبور شاہ کے کچے ذہن پہ بھی خوب ہوا تھا۔ اس کے لیے بھابی کا سننے اور شکار کا شوق، ان کا لوگوں پہ رعب و دبدبہ، گاڑیاں، باؤی گاڑی یہ سب اسے بابا صاحب کی ساوہ طرز زندگی کے برعکس بے حد کشش کا باعث تھا۔ جن سے مرعوب ہوتے ہوتے وہ خود بھی اسی انداز و اطوار میں رنگا چلا گیا تھا۔ اس کی سوچ کیا بدلی کہ بچپن کا دوست مصطفیٰ، ابھی بہت خاموشی سے اس کے ملازمین کی صف میں شامل ہو گیا۔

"کتنے بچے تنگ نکلیں گی؟" اس نے شاہ بی بی کی طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتیں برآمدے کا دروازہ کھول کر سولہ سالہ زرتاب دھپ دھپ کر نیچے کی طرف چلی آئی تھی۔

سرخ اور نارنجی رنگ کے چڑی کے سوٹ میں اس کی گوری رنگت دک رہی تھی۔ شانے پہ بڑی بے ترتیب سی چٹیا اس کی کھنڈری طبیعت کی غماز تھی۔ جبکہ ماتھے کے تل اس کا موڈ خراب ہونے کا پتہ دے رہے تھے۔ نظریں چراتے چراتے نبھی مصطفیٰ کا دل بری طرح ڈول گیا تھا۔ زرتاب شاہ کے آس پاس رہتے ہوئے وہ کب اسے چاہنے لگا تھا اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"شاہ بی بی!" اس کی خفگی بھری پکار پہ کوثر شاہ نے بھیجی کی طرف دیکھا تھا۔ "اماں جان مجھے نیا سوٹ نہیں لینے دے رہیں۔ کہہ رہی ہیں الماری

بھری ہوئی ہے ان ہی میں سے کوئی پہنو۔" منہ بسورتے ہوئے اس نے ماں کی شکایت کی۔ اس کا منہ لٹکا ان کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"میٹرک کے پرچے دینے والی ہو، مگر اب بھی بچوں کی طرح بات بات پہ منہ لٹکا لیتی ہو۔" ان کی نظروں میں اس کے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"تو کیا میٹرک کے پرچے دینے والوں کا دل نہیں دکھتا؟" پچھسی کی اس زبانی منطق پہ اس نے ناراضی سے انھیں دیکھا تو بے اختیار شاہ بی بی ہنس پڑیں جبکہ مصطفیٰ نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ جھکا لیا۔ زرناب نے غصے سے دونوں کو دیکھا۔

"آپ دونوں ہنس کیوں رہے ہیں؟"

"تیری عقلمندی پہ ہنس رہے ہیں میری جان۔" شاہ بی بی ہنستے ہوئے بولیں تو زرناب کی چھوٹی سی ناک پہ دھرا غصہ دوچند ہو گیا۔

"میں بس شادی پہ ہی نہیں جارہی۔" وہ خفا خفا سی ہوئی۔

"تمھاری مرضی۔ ویسے میں ایک گھنٹے تک مصطفیٰ کے ساتھ شہر کے لیے نکلنے والی ہوں۔" مصطفیٰ کو دیکھتے ہوئے شاہ بی بی شرارت سے مسکرائیں تو وہ بھی کھل کر مسکرا دیا۔ ان کی بات نے زرناب کو مصطفیٰ کے ساتھ صاب برابر کرنے کا اچھا موقع دیا۔

"اس چلغوزے کے ساتھ؟" مصحفیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اس نے مصطفیٰ کی طرف اشارہ کیا تو اس اچانک حملے پہ چلغوزے کی مسکراہٹ اڑ چھو ہوئی۔

"زرناب۔" شاہ بی بی کے آنکھیں ٹکانے پہ وہ ہلکھلا کے ہنسی پڑی۔

"آپ خود دیکھیں بی بی، کسے چلغوزے کی طرح بالکل سفید اور لمبا سا ہے۔" وہ ہلن کل کرتی ہنسی کے درمیان مصطفیٰ کو خوشی سے دیکھتے ہوئے بولی تو نہ

چاہتے ہوئے بھی شاہ بی بی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی جھینپا جھینپا سا ہنس پڑا تھا۔

لان سے آتی ہنسی کی آواز پہ، اپنے کمرے میں ٹہل ٹہل کر بچی کو سلاتی، مصحفہ شاہ نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور وہاں کا منظر دیکھ کر ان کا منہ کڑوا ہوا گیا تھا۔

"میرے خیال میں اب اس لڑکے، مصطفیٰ کا حویلی میں یوں منہ اٹھائے گھومنا بند ہو جانا چاہیے۔" وہ پلٹ کر شوہر کی طرف آتے ہوئے بولیں جو بیڈ پہ نیم دراز سگریٹ پینے میں مشغول تھے۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟"

"کیا مطلب کیا ہوا ہے؟ گھر میں تین تین جوان لڑکیاں نظر نہیں آتیں آپ کو؟" وہ بیڈ کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔

"کیا کریں، بابا صاحب کا پھیلا یا ہوا کھڑاگ ہے۔" انھوں نے تانسندیدگی سے سر جھٹکا۔

"نہ تو آپ کی کوئی حیثیت نہیں؟" ماتھے پہ ہل ڈالے انھوں نے بختیار شاہ کی طرف دیکھا۔ "بند کریں اس کا یہ اندر باہر پھرنا۔" غصے سے بولتے ہوئے انھوں نے باس پڑے کاٹ میں گڑیا کو ڈالا۔ گڑیا ان کی چھیلی اولاد تھی جو بہت دعاؤں کے بعد اب کہیں جا کے شادی کے چھٹے سال میں ہوئی تھی۔ اس دوران انھوں نے بختیار شاہ کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے ماں باپ کے کان میں اپنے چھوٹے بھائی، ہاشم اور زرناب کے رشتے کی بات ڈال دی تھی تاکہ اکلوتی بیٹی کو وٹے سے میں دینے کے بعد سفید حویلی والے ان پہ کبھی سوکن لانے کا سوچ بھی نہ سکیں۔ کیونکہ خاندانی بچی کو چھوڑنے کا رواج تو ان میں تھا نہیں البتہ دوسری تیسری شادی عام تھی۔

ہاشم شاہ بھی بہن کے اس فیصلے سے خاصا خوش اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ زرناب سے رشتہ جوڑنے میں اس کے لیے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ ایک تو وہ خوبصورت بہت بھی، دوسرا اس سے شادی کے بعد وہ پیرسید نظر میں شاہ کا اکلوتا داماد بن جاتا جس کی شان اور مرتبے کے سامنے ایک زمانہ سر جھکانا تھا، اور تیسرا زرناب سے بڑی وہ ساری زمین و جائیداد بھی جو شادی کے بعد اس کی ہو جاتی۔ پھر بھلا اسے اس رشتے پر کیونکر اعتراض ہو سکتا تھا؟

"بلکہ میری مائیں تو زرناب اور ہاشم کا رشتہ طے کرنے والی بات کریں۔ ہاشم کی پڑھائی بھی ختم ہو چکی ہے۔ اباجی نے اپنی زندگی میں چاچا جی سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اور آج انھیں اس دنیا سے رخصت ہوئے بھی سال ہونے والا ہے۔ مگر چاچا جی نے اس موضوع پہ دوبارہ کوئی بات نہیں کی۔ اب بے بی چاہ رہی ہیں کہ ان سے آکر ایک بار پھر یہ بات کریں۔" ان کے قریب بیٹھتے ہوئے انھوں نے اپنی ماں کا حوالہ دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔

"مجھے نہیں لگتا کہ بابا صاحب اس رشتے کے لیے مائیں گے۔"

"کیوں؟ کیا کی ہے میرے بھائی میں؟" انھوں نے تنک کر شوہر کو دیکھا۔ "یا پھر زرناب میں کوئی سرخاب کے پرگے ہیں؟"

"ارے بابا میرے کہنے کا مطلب تھا کہ وہ ابھی چھوٹی ہے۔"

"اب ایسی بھی کوئی چوچی نہیں۔" وہ جل کر گویا ہوئیں۔ "لیکن پھر بھی اگر یہ وجہ ہے تو فی الحال صرف نکاح کر دیں۔" بختیار شاہ بے اختیار اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

"تائی جان سے کہو کہ ابھی کچھ عرصہ رک جائیں۔ زرناب اپنے میٹرک کے پرچوں سے فارغ ہو جائے، پھر اس موضوع پہ بات کریں

گے۔" انھوں نے سگریٹ ایش ٹرے میں سلی۔

"کوئی ضرورت نہیں اس کی پڑھائی کو زیادہ اہمیت دینے کی، چاچا جی نے کیا کم سر چڑھا رکھا ہے جواب آپ بھی ان کے نقش قدم پہ چلنے لگے؟"

مصحفہ نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے انھیں دیکھا تو وہ لب بھینچے ایک بار پھر خاموشی اختیار کرنے پہ مجبور ہو گئے۔

☆☆☆

"صدف مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" زرناب نے مقابل کھڑی صدف کو دیکھا جو جلدی جلدی اس کا دو پانچ ٹھیک کر رہی تھی۔ آج حسب روایت زودہیب شاہ اپنی سہیلی کے ساتھ دعوت پر سفید حویلی آیا ہوا تھا۔ اور اس وقت نیچے زرناب کا انتظار ہو رہا تھا۔

مہمانوں کی آمد سے پہلے صدف کی امی، بی بی حوراں نے شاہ صاحب کی عزت کا واسطہ دے کر بختیار اور صبور شاہ کو مہمانوں سے ملنے کے لیے بڑی مشکل سے راضی کیا تھا۔ جس پہ مصحفہ بیگم دل ہی دل میں خاصی چینیں بہ جیبن ہوئی تھیں۔ لیکن شوہر کے خاموشی اختیار کرنے پہ انھوں نے بھی کچھ کہنے سے احتراز ہی کیا تھا۔

"جب اپنے زودہیب صاحب سے ملو گی ناں تو ساری گھبراہٹ اڑ چھو ہو جائے گی تمھاری۔" اس کی طرف دیکھتی وہ شرارت سے مسکرائی تو زرناب بدک کر پیچھے ہٹی۔

"میں نہیں ملنے والی اس سے۔" اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں تو صدف قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"ارے بابا مذاق کر رہی ہوں۔ بھلا بھاجی اور صبور کی موجودگی میں، تم تمھاری زودہیب کے ساتھ ملاقات کروا سکتے ہیں؟" اس نے آگے بڑھ کے اس کے دوپٹے پہ پن لگائی تو زرناب نے سکھ کا سانس

لیا۔

"بھرجائی کہاں ہیں؟" اس نے معصومہ کی بابت دریافت کیا۔

"جانا کہاں ہے، نیچے جگ کے بیٹھی ہیں مہمانوں کے ساتھ۔ آخر رپورٹ نہیں دینی اپنے کینے گھر والوں کو۔" صدف نے بد مزگی سے کہتے ہوئے زرناب کو دیکھا۔ "قسم سے تم نے گھر والوں کو، ہاشم کی راستہ رد کئے دالی حرکت نہ بتا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔"

"وہ ایسی گری ہوئی حرکتیں بہت بار کر چکا ہے۔" زرناب غی سے مسکرائی۔

"تھماری یہی خاموشی اسے مزید شہہ دیتی ہے۔" صدف کی نگاہوں میں غلطی درآئی۔

"اور بتا کر کیا ملے گا؟" زرناب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تو لہجے میں ٹوٹے کاچ سی جھین تھی۔ "میرے سر پہ میرے والد کا سایہ نہیں رہا صدف، اور میرے بھائیوں کی نظروں میں میرا کردار بہت پہلے مشکوک ٹھہرایا جا چکا ہے۔ میں اگر سچ بھی بولوں گی ناں تو اس شخص کو اسے جھوٹ بنانے میں لمحہ نہیں لگے گا اور وہ خود مجھ پہ کوئی تہمت بھی دھردے گا ناں تو ان لوگوں کو اسے سچ ماننے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوگی، صرف اس لیے کہ میرے محرم میرا سائبان نہیں بن سکے اور یہی میرا المیہ ہے!" اس کی محرومی آنسو بن کر اس کی آواز میں اتر آئی تو صدف کو اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہوا۔ اس نے بے اختیار زرناب کو خود سے لگایا۔

"مجھے معاف کر دو۔۔۔ پتا نہیں کیوں میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ بات بھول جاتی ہوں کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت سمجھدار مردوں کی ساری روشن خیالی اور ساری سمجھداری صرف اپنی ذات تک محدود ہے۔" اس کا بوجھل لہجہ آخر میں رخ

ہو گیا تو زرناب نے اک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

"ایسے مت کہو، تمہاری محبت اور خلوص پہ مجھے کبھی بھی شک نہیں رہا۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے اپنے آنسو صاف کیے تو صدف نے محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"تو بس پھر فوراً سے ہاں کر دو۔ سچ میں بہت پیئڈسم اور ڈیپینٹ بندہ چتا ہے میں نے تمہارے لیے۔" اسے واپس اپنی جون میں لوٹا دیکھ کر زرناب دھیرے سے مسکرائی۔

"تم بھی ہار نہیں مانو گی ناں؟"

"ہاں مائیں ہمارے دشمن جو نیچے بیٹھے جل رہے ہیں۔" وہ بیٹتے ہوئے اسے لیے دردناک کی طرف بڑھی تو زرناب بے بسی سے سر ہلاتی اس کے ساتھ چل پڑی۔

صدف کے ہمراہ نیچے آنے پہ زوہیب کی فیملی اس سے بہت محبت اور اپنائیت ملتی۔ زوہیب چونکہ مردان خانے میں تھا اس لیے چاہ کر بھی زرناب کو دیکھ نہ سکا تھا۔ البتہ چلتے چلتے اس کی بہن اور بھائی نے صدف اور شفق کے ساتھ مل کر زرناب کی ایک جھلک اسے دکھا دی تھی۔ ان کا یہ چاہت بھرا رویہ، ہنسی مذاق معصومہ کے دل پہ چھریاں سی چلا رہا تھا اس پہ مستزاد ان کا پڑھا لکھا اور شہری رکھ رکھاؤ والا انداز معصومہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان سب کو اٹھا کر کہیں غائب کر دیں۔

صوبور کو بھی مہذب ساز دہیب خاصا پسند آیا تھا۔ بختیار شاہ البتہ مہمانوں کے جاتے ہی بنا کچھ کہے سنے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ ان کی اجنبیت نے ماں کے دل کو ٹھیس سی لگائی تھی جسے محسوس کرتے ہوئے صوبور نے انھیں تسلی دی تھی کہ وہ خود زوہیب کے معاملے میں ضروری معلومات کروائے گا۔ اس کے انداز میں در آنے والی یہ لچک کس کی مرہون

منت تھی، سب جانتے تھے۔ جب ہی اس کے جاتے ہی اماں جان نے صدف کو خود سے لپٹا لیا تھا۔

"نجانے تو میری کس نیکی کا صلہ ہے صدف! اللہ پاک تجھے اپنے بچوں کی ڈھیروں خوشیاں دکھائے۔۔۔ تیرا سہاگ سدا سلامت رہے میری جان۔" اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھا اسے انھوں نے بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی تھی اور معصومہ شاہ کے اندر باہر جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح شاہ صاحب کو عبداللہ اور اپنے خاص ملازم کرم دین کے ساتھ شہر کے لیے نکلنا دیکھ کر بختیار شاہ اور معصومہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔

"خیر تو ہے بابا صاحب! یہ اچانک آپ کا پروگرام کیسے بن گیا؟" بختیار شاہ نے ان کی طرف دیکھا۔ روانگی سے قبل وہ سب ہی ان کی لینڈ کرور کے پاس کھڑے تھے۔ شاہ بی بی کا چہرہ بے حد اترا ہوا تھا۔ معصومہ نے بغور پچھی کا جائزہ لیا۔

"اچانک تو نہیں، کافی دن سے ایک کام چننا کا سوچ رہا تھا۔" وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے تو بختیار شاہ چونکے۔

"ایسا کون سا کام تھا جو بابا صاحب ان سے کہنے کے بجائے خود کرنے کھڑے ہوئے تھے؟" دل ہی دل میں سوچتے ہوئے انھوں نے بظاہر عام سے لہجے میں دریافت کیا۔

"کیسا کام؟"

"بتاؤں گا۔" وہ نرمی سے ان کا شانہ چھتھتاتے ہوئے گاڑی میں سوار ہو گئے تو بختیار شاہ کی آنکھیں بھری نظریں تب تک گاڑی پہ جمی رہیں جب تک وہ گیٹ سے باہر نہ نکل گئی۔

"یہ چاچا جی اکیلے اکیلے کس کام کو چننا چاہتے ہیں؟" معصومہ شوہر کے قریب آتے ہوئے آہستہ سے بولیں تو وہ بے زاری سے "پتا نہیں" کہتے

ہوئے مردان خانے کی طرف بڑھ گئے۔

گاڑی حوالی کا چانک نما گیٹ پار کر کے جوں ہی روڈ پہ آئی پیرسید نظر حسین شاہ نے اک بوجھل سانس لیتے ہوئے اپنی پشت میٹ سے نکا دی۔

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج میری اولاد ہی میرے لیے قابل بھروسہ نہیں رہی۔" ان کے لہجے کا دکھ ساتھ بیٹھے عبداللہ کو بھی افسردہ کر گیا۔ "میں نے اپنے بختیار کے لیے ہدایت کی بڑی دعائیں کی تھیں عبداللہ، مگر شاید رب کو میرے بیٹوں کے ذریعے میری آزمائش مقصود ہے جب ہی تو صوبور بھی اسی کے رنگ میں رنگنے لگا ہے۔" وہ مایوسی سے بولے تو عبداللہ نے احترام سے ان کے کھنکے کو چھوا۔

"تسی پریشان نہ ہو سرکار۔ اللہ تاؤ ہیاں وعاداں ضرور قبول کرے گا۔" اس کا دلا سہ ان کی آنکھوں میں ادا سی نکھر گیا۔

"نہیں عبداللہ۔ اللہ ہدایت بھی صرف انھیں دیتا ہے جو خود ہدایت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اور بد قسمتی سے میرے دونوں بیٹے دنیا کے طلب گار نکلے ہیں۔ سو انھیں دنیا ہی ملے گی۔۔۔ بے تاج راج تلے اندھیرے دالی بات؟" وہ پھیکا سا مسکرائے تو عبداللہ طول سا خاموش ہو گیا۔

"کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مصطفیٰ جیسا ایک سلجھا ہوا اور فرمانبردار بچہ میرا بھی ہوتا تو مجھے اس گدی کا مستقبل اتنی مشکل میں نظر نہیں آتا۔۔۔ تم سچ میں اللہ کو بہت پیارے ہو عبداللہ، اس نے نہ صرف تمہیں آج کے اس برائیوں بھرے دور میں اپنی اور اپنے دین کی پہچان کروائی بلکہ تمہیں مصطفیٰ جیسی نیک اولاد بھی عطا کی۔ تم ایک خوش نصیب انسان ہو۔" ان کی بات پہ عبداللہ مسکرا دیا۔

"میرے مقدور اچ اے خوش نصیبی تھا ڈی وجہ

توں لکھی گئی اے سرکار۔ فیروج کو کہ تھاڈا کی مقام اے۔" اس نے پناہ عجت سے ان کا ہاتھ چھوا تو پیر نظر حسین شاہ کو اس کی عجت مزید دل گرفتہ کر گئی۔ "تم سب کی یہی عجتیں تو مجھے تمہارا مقروض کیے دیتی ہیں۔" "میں کج بھیا نہیں سرکار۔" عبداللہ نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"میرے پاس موجود یہ گدی دراصل تم سب کا بھروسہ ہے جو تم لوگوں کو میری ذات پر ہے۔ یہ میرے آباؤ اجداد کی امانت ہے جو مجھے اپنے سے بھی بڑھ کر نیک اور پرہیزگار بندے کو سونپتی ہے۔ مگر انہوں نے میرے پاس میری اگلی نسل میں سے ایسا ایک بھی معتبر نام نہیں جس کے حوالے میں اس مقام کو کر کے اپنے رب کے حضور سرخرو ہو سکوں۔" "بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے وہ لفظ بھر کو خاموش ہوئے تو عبداللہ کو لگا جیسے وہ کوئی بہت انہونی بات سننے والا ہے۔

وہ سانس روکے شاہ صاحب کو دیکھ گیا جو بیل بھر کو کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے شاید خود بھی اپنا حوصلہ جمع کر رہے تھے۔

"میں نے اس پیری مریدی کے سلسلے کو یہیں ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" یہ سن کر عبداللہ کے ساتھ ساتھ گاڑی چلاتے کرم دین کو بھی شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔

"اے کی کہہ رہے اور کار؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ دنیا داروں کے ہاتھوں میں، وینداری کا یہ منصب انہیں مزید مغرور اور سرکش بنا دے گا۔ اور میں اپنے رب کی عطا کی گئی اس عزت کا غلط استعمال ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ میں آج اسی لیے شہر جا رہا ہوں کہ وکیل سے مل کے اپنے اس فیصلے کو قاتوئی وصیت کی شکل دے سکوں تاکہ اگر کل کو مجھے کچھ ہو جائے تو

میری اپنی اولاد بھی اس گدی کے معاملے میں من مانی نہ کر سکے۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے گویا ہوئے تو عبداللہ جیسے تڑپ اٹھا۔

"اللہ نہ کرے سرکار۔ رب آپ کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔" اور پیر سید نظر حسین شاہ اک بھاری سانس لے کر رہ گئے۔

تن تنہا اتنا بڑا فیصلہ کرنا ان کے لیے کتنا مشکل امر تھا، یہ وہی جانتے تھے۔ نسل ورسل چلنے والے اس بے حد شان اور مرتبے والے منصب سے نہ صرف ان کے گھرانے کی بلکہ خود ان کی عزت بھی بڑی تھی، اس کا ختم ہونا خود ان کے لیے بھی باعث شرمندگی تھا، مگر وہ بے حد مجبور تھے۔

گھر بھر میں انہوں نے صرف شاہ بی بی کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تھا اور نتائج کی پرواہ کیے بنا شہر چلے آئے تھے۔

تقریباً دو گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ اپنے بنگلے پہ پہنچے تو وکیل پہلے سے ان کا منتظر تھا۔ ان کے فیصلے کو وصیت کی صورت تیار کر داکے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ بند کمرے میں اس سے ایک تفصیلی ملاقات کے بعد شاہ صاحب نے کاغذات پر دستخط کیے تھے اور اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر کے وکیل کو سونپ دیا تھا۔

"عبداللہ۔" وکیل کے جانے کے بعد انہوں نے عبداللہ کو آواز دی۔

"جی سرکار۔"

"گاڑی نکلواؤ۔" اور وہ اثبات میں سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد شاہ صاحب آکر گاڑی میں بیٹھے تو کرم دین ان کے حکم کا منتظر تھا۔

"گاڑی چلاتے رہو کرم دین، میرا دل بہت بے چین ہے۔" انہوں نے سریٹ پہ ڈال دیا۔ بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے انہیں کافی دیر ہو چکی تھی۔

ایسے میں ان کی گاڑی ایک سنگل پہ آکر رکی تو فضا میں زور و شور سے بجتے اونچے اونچے میوزک پہ پیر سید نظر حسین شاہ کی نگاہیں بے اختیار ڈرا فاصلے پہ کھڑی کار سے جا ٹکرائیں۔ جس میں سوار نو جوان لڑکے اور لڑکیاں ارد گرد سے بے نیاز میوزک پہ سر دھتتے ہوئے ایک دوسرے میں مگن تھے۔ ان کی نگاہوں میں ناگواری اتر آئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ رخ پھیرتے انہیں پچھلی سیٹ پہ بیٹھے دو لڑکوں میں سے ایک پہ اپنے پیچھے ہاشم شاہ کا گمان ہوا۔

"کرم دین گاڑی آگے کر دو ر۔" ان کے حکم پہ کرم دین نے گاڑی تھوڑا آگے بڑھانی تو شاہ صاحب کا گمان یقین میں بدل گیا۔ لیکن ہاشم شاہ اپنی بغل میں بیٹھی لڑکی کے ساتھ مصروف تھا کہ اسے چچا کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا۔

سید نظر حسین شاہ کی آنکھوں سے غصے میں چنگاریاں سی لگنے لگیں۔ محض بائیس سال کی عمر میں یہ لڑکا شہر میں جوں کھلا چکا تھا اس کا انہیں یہ خوبی علم تھا اسی لیے ایک سال قبل جب ان کے بھائی نے ہاشم کے لیے ان کی زرتاب کا ہاتھ مانگا تھا تو وہ خاموشی اختیار کر گئے تھے۔ مگر آج اس کے یہ رنگ ڈھنگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد تو ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کی شکل بھی دیکھیں۔

"کرم دین، اس شور سے گاڑی آگے نکالو۔" ان کے تنے ہوئے لہجے پہ کرم دین گھبرا گیا۔ تب ہی خوش قسمتی سے سنگل ٹھپ گیا تھا۔ کرم دین نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے اس کیلنڈر پہ دباؤ بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

سیف علی جنگ کو نوروالاں آئے آج چوتھا دن تھا۔ صبور شاہ سے تھانے میں ہونے والی ملاقات کے بعد سفید حلی والوں نے دوبارہ اس سے رابطہ نہیں کیا تھا جو اس کے لیے زیادہ چوکس رہنے کا سنگل

تھا۔ کیونکہ جتنی معلومات وہ ان کے بارے میں رکھتا تھا اس کے مطابق وہ اسے اتنی آسانی سے اپنی راجدھانی میں داخلہ کی اجازت نہیں دینے والے تھے۔ البتہ بڑی حوصلی والے حاذق شاہ اپنے چند بندوں کے ساتھ اس سے ملنے آئے تھے۔ بظاہر تو انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن سیف جانتا تھا کہ طاقت کے معاملے وہ سب ہی ایک تھے اسی لیے وہ ان میں سے کسی پر بھی بھروسہ کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

"السلام علیکم بابا!" وہ اپنے معمول کے مطابق صبح تیار ہو رہا تھا تو کمرے میں اس کا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پہ "بابا" جگمگاتا دیکھ کر اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

"علیکم السلام۔ کیسے ہو میرے شیر؟" دوسری طرف سے عثمان علی جنگ کی بٹاش آواز آئی تو وہ بے اختیار مسکرایا۔

"بالکل ٹھیک۔ آپ سنائیں؟" "میں تو ٹھیک ہوں لیکن تمہاری ماں اداں ہے۔"

"جانتا ہوں۔" اس کی مسکراہٹ بھینکی پڑ گئی۔ "آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں۔" "جس ماں کا دل اپنی اولاد کا گم سہہ چکا ہو

اسے سمجھانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔" وہ دھیرے سے بولے تو سیف ملول سا خاموش ہو گیا۔

"ان لوگوں نے دوبارہ رابطہ تو نہیں کیا؟" لمبے کے توقف کے بعد عثمان صاحب نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ قدم اٹھاتا کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ نوروالاں کی حد دوسرے ذرا باہر یہ خوبصورت بنگلہ اور مقامی ملازمین اسے گورنمنٹ کی جانب سے دیے گئے تھے۔

"اس کی کوئی خبر؟" انہوں نے مبہم سا سوال کیا تو سیف کے اندر جیسے اک ہوک ی اٹھی۔

"نہیں۔"

"اللہ تمہاری مدد کرے۔ اپنا بہت خیال رکھنا بیٹا۔" محبت سے کہتے ہوئے انھوں نے فون بند کر دیا تو سیف علی ان کی دعاؤں کے حصار کو محسوس کرتا اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

تیار ہو کر وہ ناشتے کی میز پر آیا تو معمول کے برعکس یونیفارم کے بجائے سفید شلوار قمیص میں تھا۔ اسے کرسی سنبھال کر دیکھ کر ملازمہ مستعدی سے اس کے آگے ناشتہ لگانے لگی۔

سیف نے ایک توصیفی نگاہ اپنے سامنے سلیقے سے لگائی مگر میز پر ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر آلیٹ کی پلیٹ اٹھالی۔

"شیم!"

"جی صاحب جی۔" ملازمہ نے چائے اٹھ لیتے ہوئے سر اٹھایا۔

"تم نے یہاں سے پہلے کہیں اور بھی کام کیا ہے کیا؟" سیف نے آلیٹ کا ٹکڑا کاٹا۔ مزیدار مہک نے اس کی بھوک بڑھادی تھی۔

"جی سفید حویلی میں ہوتی تھی میں۔" اور سیف کا ہاتھ اپنی جگہ پہ بل بھر کر مساکت ہو گیا۔

"اچھا۔" شیم نے چائے کا کپ بنا کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا جو اچانک ہی خاموش ہو گیا تھا۔

"ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے صاحب جی۔" اسے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا دیکھ کر وہ دھیرے سے بولی تو سیف نے اک گہری سانس لیتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"کتنا عرصہ کام کیا ہے تم نے وہاں؟" اس نے ملازمہ کی طرف دیکھا۔

"ہماری تو ساری عمری حویلی میں آتے جاتے گزری ہے جی۔ یہ تو ابجد کی سرکاری ملازمت کی وجہ سے مجھے اس کے ساتھ یہاں آنا پڑا ہے۔" اس

نے اپنے شوہر کا نام لیا تو سیف نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کپ پیچ کر رکھ دیا۔

"کون کون ہوتا ہے حویلی میں؟"

"وڈے شاہ صاحب کا تو کافی سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اب ان کے بیٹے، پوتے پوتیاں (پوتے پوتیاں) اور بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔" وہ روانی سے بولی۔ سیف شخص ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ کمرے میں ایک بل کو خاموشی چھا گئی۔

"شاہ صاحب کے سارے بیٹے شادی شدہ ہیں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے اگلا سوال کیا تو شیم نے قدرے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا انداز سیف کو مسکرانے پہ مجبور کر گیا۔

"فکر مت کر دیوں ہی پوچھ رہا ہوں۔" اور شیم بے چاری اپنی چوری پکڑی جانے پہ شرمندہ ہو گئی۔

"جی جی دونوں بیٹے شادی شدہ ہیں بس ایک بیٹی رہ گئی ہیں۔" وہ خفت زدہ سی جلدی سے بولی تو سیف لب و بائے نظریں جھکا گیا۔

"یہ سب چیزیں اٹھالو۔ میں صرف جائے لوں گا۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے کپ اٹھا لیا تو شیم خاموشی سے میز سمیٹنے لگی حالانکہ تھوڑی دیر پہلے اس نے صاحب جی کو آلیٹ کی پلیٹ اٹھاتے دیکھا تھا مگر وہ کیا کہہ سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنا ڈالٹ، موبائل اور سن گلاسز لیے باہر پورچ میں آیا تو ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔

"میں آج خود ڈرائیور کروں گا رفاقت۔" اس کی بات پہ ڈرائیور نے چابی اس کے حوالے کر دی تھی۔ سیف نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور اگلے ہی لمحے کھلے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس نے نیند میں بے چینی سے پہلو بدلاتھا۔ مگر اندر پھیلتا عجیب سا احساس بڑھنے لگا تھا، یہاں تک

کہ وہ سینے پہ ہاتھ رکھے ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ اس گھبراہٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے بستر سے باہر نکل آئی تھی۔ کھڑکی سے پردے ہٹاتے ہوئے اس نے گہرے گہرے سانس لیے تھے۔ چند لمحوں بعد گھبراہٹ میں کچھ کی ہوئی تو وہ وہیں کھڑی ہو کے خود کو پرسکون کرنے لگی۔ اس کی بے چین نگاہیں ارد گرد سے ہونی بیچے لان کے وسط میں رکھی کرسیوں پہ پڑیں تو جیسے ٹھہری گئیں۔ اس کے پیارے بابا صاحب کا پر نور چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آن ٹھہرا، جو روزِ زوج یہاں بیٹھ کے اخبار پڑھا کرتے تھے۔

وہ بڑی سی چادر میں اپنا وجود چھپائے نیچے چلی آئی جہاں ہال میں شاہ بی بی کے ساتھ اماں جان بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" دونوں خواتین نے بیک وقت زرباب کی طرف دیکھا اور اسے چادر میں لپٹا دیکھ کے دونوں ہی چونک گئیں۔

"خیر تو ہے بیٹا؟" چادر کیوں اوڑھ رکھی ہے؟" بی بی نور بانو کی آنکھوں میں پریشانی درآئی۔

"اماں جان! میں قبرستان جانا چاہتی ہوں۔" وہ دھیرے سے بولتی ان کے قریب آ بیٹھی تو شاہ بی بی نے متشکر انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا ہوا میری جان! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ان کے پیارے پوچھنے پہ اس کا دل بھرا آیا۔

"پتا نہیں کیوں لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" وہ بھرتی ہوئی آواز میں بولی تو اس کا رونا دونوں کو پریشان کر گیا۔ شاہ بی بی نے بے اختیار اس کی پشت سہلاتے ہوئے بھادج کی طرف دیکھا جن کا اپنا چہرہ یک لخت اتر گیا تھا۔

"اچھا" میں ابھی کرم دین سے کہتی ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔" ان کے اٹھنے پہ زرباب نے

اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"آپ چلیں گی؟" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ تم تنہائی میں جی بھر کے اپنے بابا صاحب سے باتیں کر لینا۔" انھوں نے پیار سے اس کا چہرہ چھوا۔

وہ جانتی تھیں کہ زرباب آج کل کتنی الجھی ہوئی تھی۔ ان کی بات پہ وہ اک گہری سانس لیتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر فصاحت کو آواز دیتی باہر نکل آئی تھی جہاں شاہ بی بی کے حکم پہ کرم دین چاچا اس کے لیے گاڑی نکلا رہے تھے۔ وہ بے تابی سے چلتی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

☆☆☆

سرمئی بادلوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ ٹھنڈے زور و شور سے نور والاں پہ برسنے کو تیار تھیں۔

"رب خیر کرے۔ شاہ جی سفر پہ گئے ہوئے ہیں۔" موسم کے بدلتے تیور بی بی نور بانو کو پریشان کر گئے تھے۔

وقت زرباب اور صدف داغلی دروازہ کھول کے تیزی سے باہر آئی تھیں۔

"اماں جان، مصطفیٰ سے کہہ کے ہمیں پھیلے باغ میں جھولا ڈلوادیں۔" زرباب کی فرمائش پہ بی بی نور بانو نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ پھل گیا ہو۔

"مت تو نہیں ماری گی؟ میں اس موسم میں اس غریب کو کہاں باندھ (بندر) بنا کے درخت پہ چڑھا دوں۔" انھوں بیٹی کو گھر کا تو زرباب کی چنگل ہنسی بے اختیار کھٹک اٹھی۔

"وہ بنا بنایا "باندھ" ہے اماں جان، چاہے درخت پہ چڑھے یا نہ چڑھے۔" اس نے ہنستے ہوئے صدف کو دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بی بی نور بانو نے برہنہ شکل تمام اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹتے ہوئے آنکھیں نکالیں۔
 "کس طرح زبان چلنے لگی ہے۔" مگر وہ ان کے گھورنے کی پرواہ کیے بنا برآمدے کی سیڑھیاں پھلانگ گئی۔
 "میں خود اس سے کہتی ہوں۔"

"خبردار زرناب! انھوں نے بے اختیار اسے روکا مگر وہ ہنستی ہوئی یہ جاہد جا۔ اور پھر اگلے پندرہ منٹ میں مصطفیٰ موٹا سا رستہ ہاتھ میں لیے زرناب بی بی کے حکم پہ، ہوا کے دوش پر جموٹے آسمان کے درخت پہ چڑھا اپنی ہڈیوں کی خیر کی دعا مانگ رہا تھا۔
 "اُس والی شاخ پہ ڈالو رہی۔ وہ زیادہ اونچی ہے۔" اسے ایک قریبی شاخ پہ رسی اچھالتے دیکھ کر زرناب نے ناقدانہ نظروں سے درخت کا جائزہ لیا تو مصطفیٰ نے رک کر اسے گھورا۔

"میں نہیں اتنی اوپر چڑھنے والا۔ اتنی تیز ہوا ہے یہاں۔"

"جان کتنی پیاری ہے تمہیں چلوغزے۔" زرناب کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی۔
 "کیوں آپ کو نہیں ہے کیا؟" وہ تپ کر بولا تو اس کے جلتے بھنے انداز پہ زرناب ہنسی چلی گئی۔

ڈولتے پھولوں کے پس منظر میں اس کی ہنسی کا جلتے رنگ مصطفیٰ عبداللہ کو ایک لمحے کے لیے بہوت کر گیا۔ وہ ایک تک اسے دیکھے چلا گیا۔ اس کا آجکل اور زلفیں ہوا کے دوش پر اڑتی اسے کسی اپسرا کا روپ دے رہی تھیں۔ اسی لمحے بادل زور سے گرجے تھے اور کن کن برقی بوندیں تیز ہو گئی تھیں۔ زرناب نے گھبرا کے اسے پکارا تھا۔
 "مصطفیٰ! نیچے آ جاؤ۔"

"اور آپ کا جھولا؟" اس نے پلٹ کر نیچے دیکھا تھا۔

"جھوڑا ہے۔" اس کی بات پہ مصطفیٰ نے

ہاتھ میں پکڑی رسی نیچے چھوڑ دی تھی اور احتیاط سے واپس اترنے لگا تھا۔ مگر بارش اتنی تیز ہو گئی تھی کہ اس کے لیے اپنے قدم جمانا حقیقتاً مشکل ہو گیا تھا۔ زرناب بھینکنے کی پرواہ کیے بنا پریشانی سے منہ اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اپنی غلطی کا احساس اسے بہت شدت سے ہوا تھا۔

"آرام سے۔" اسے چند فٹ کے فاصلے پہ آتا دیکھ کے زرناب نے سکون کا سانس لیا تھا۔
 "میرا ہاتھ پکڑ لو۔" وہ سرعت سے آگے بڑھی تھی۔ اس کا یہ عمل قطعی غیر ارادی تھا مصطفیٰ نے بھی بے دھیانی میں اس کا ہاتھ پکڑا ہوا ہاتھ تھا اور چھلانگ لگا دی تھی۔ گیلی گھاس پہ اس کا پاؤں صبح سے نہ پڑا اور وہ گرے گرے بچا۔ زرناب نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو تھاما۔
 "تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے مصطفیٰ کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

تب ہی معصومہ، راہداری کا دروازہ کھول کے اپنے دھیان میں پچھلے برآمدے میں آئی تھیں لیکن جو بھی ان کی نظر سامنے کو اٹھی وہ اپنی جگہ پہ ساکت رہ گئی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" وہ اتنی زور سے چلائیں تو دونوں اس اچانک افاد پہ بری طرح حواس باختہ ہو گئے۔
 "کچھ نہیں بھر جاتی۔ میں جھولا ڈالوا رہی تھی۔" سرعت سے مصطفیٰ کی بازو چھوڑ کے وہ پیچھے ہٹی تو معصومہ اسے شعلے برساتی نگاہوں سے گھورتی دندناہی ہوئی ان کے سر پہ آ پہنچیں۔

"اس کی بازو پکڑ کے تم جھولا ڈالو اور یہی یا جھول رہی تھیں؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولیں تو زرناب مارے شرمندگی کے زمین میں گر گئی۔

"بھر جاتی، یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟" اس کا چہرہ احساس تو بہن سے جل اٹھا تھا۔ جبکہ مصطفیٰ کی کانٹو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت

ہو گئی تھی۔

"بی بی صاحبہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا پاؤں۔۔۔"

"چپ کر اوئے!" معصومہ نے حقارت سے اس کی بات کاٹ ڈالی۔ "میں تجھ جیسے بد ذاتوں کی نیت اچھی طرح جانتی ہوں۔ موقع پرست کہیں کے دفع ہو یہاں سے!"

زرناب شاہ کی آنکھوں سے آنسو قطرہوں کی صورت بہہ نکلے تھے۔ مصطفیٰ کا خون اس کی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ اس درجہ ذلیل کرتا انداز اور ایسے گھٹیا الزام پہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس عورت کا منہ توڑ دے۔ ایک کھوتی نظر معصومہ شاہ یہ ڈالتے ہوئے اس نے زرناب کی آنسوؤں بھری آنکھوں کی طرف دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

اس کے جاتے ہی معصومہ کی توپوں کا رخ پوری طرح زرناب کی طرف ہو گیا تھا۔ جو بے آواز درستی تھی۔

"بزارو نا آ رہا ہے اپنے اس گئے کے لیے؟" ان کے استہزائیہ انداز پہ اس کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ ایک جھکے سے ہٹتی تھی اور آگے بڑھتی تھی لیکن اگلے ہی پل اس کی کلائی معصومہ کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔

"اپنی جوانی سنبھالو بی بی، درنہ تمہارے کروت تمہارے باپ بھائیوں تک پہنچانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی!" کاٹ دار لہجے میں اپنی بات مکمل کرتی وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اندر کی جانب بڑھ گئی تھیں اور زرناب چند لمحوں کی بے یقینی کے بعد دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

☆☆☆

سیف علی جنگ کی گاڑی دھول اڑاتی

قبرستان کے سامنے آرکی تو وہاں کا چوکیدار ایب انجان چہرے کو دیکھ کے اس کے قریب چلا آیا، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ ان کے علاقے کا نیا اے ایس بی ہے تو وہ بڑی خوش اخلاقی سے بولا۔

"بسم اللہ جی۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی سرکار تھاڑے نال مل کے۔" (آپ سے مل کے بہت خوشی ہوئی سرکار) اس نے نیازمندانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھاما۔ سیف نے مسکراتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟" وہ آگے بڑھا تو نظر درخت کے نیچے کھڑی پراڈوسے جا گرا۔

"سفید جو بی بی دی سرکار۔۔۔۔۔ بی بی صاحب ہواں آئے نے۔" (حویلی کی سرکار۔۔۔۔۔ بی بی صاحبہ آئی ہوئی ہیں) اس کے جواب پہ سیف لطفے بھر کو ٹھنکا اور پھر اثبات میں سر ہلاتا اندر کی جانب چلنے لگا۔ ناچار گاہے چوکیدار کو بھی اس کے ساتھ چلنا پڑا۔

"صاحب جی تسی اتھے (قبرستان) کس طرح تشریف لیائے او۔ میرا مطلب اے کوئی عزیز رشتے دار۔۔۔" (صاحب جی آپ یہاں کیسے تشریف لائے ہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی عزیز رشتے دار۔۔۔) وہ جھجک کے چپ ہوا تو سیف نے اک گہری سانس لی۔
 "نہیں۔ میں یہاں شاہ صاحب کے مزار پہ فاتحہ کے لیے آیا ہوں۔"

"اوا چھا اچھا۔ یعنی تسی دی اوٹاں دے عقیدت مندوں چوں او۔" (یعنی آپ بھی ان کے عقیدت مندوں میں سے ہیں) وہ خوش ہوا۔

"لیکن تانوں تھوڑا انتظار کرنا ہے گا۔ اندر بی بی صاحب نے۔" وہ اسے لیے پتیل کے گھنے پیڑ تلے لے آیا، جہاں چار پائی بیچھی تھی۔ "تسی تشریف رکھو۔ میں تھاڑے واسطے لی لے کے آتا آں۔" سیف کے منع کرنے کے باوجود وہ بعد

اصرار اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا تو اس نے دور نظر آتے گنبد کی طرف دیکھا۔ تعیناً یہی شاہ صاحب کا مزار تھا۔ اس نے رک کر چند لمحوں تک چوکیدار کا انتظار کیا مگر جب وہ نہیں آیا تو وہ خود ہی اس طرف چل پڑا۔

ارد گرد اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ "شاید حویلی والے چلے گئے ہوں۔" یہی سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مزار کا خراب دار دروازہ اس کے سامنے آمو جو ہوا۔ دگرختی سے اس آخری آرام گاہ پہ نظر ڈالتے ہوئے اس نے اپنے پاؤں پشاور کی چپل کی قید سے آزاد کیے اور سفید ماربل کے فرش پہ قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ لیکن مزار کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ ہال کے وسط میں نیچے زمین پہ کالی چادر میں لپٹا ایک نسوانی وجود، اپنی پیشانی ہٹھوں پہ نگائے، اور گردے بے نیاز میٹھا تھا۔

"کون ہیں آپ؟ اور اندر کیسے آئے ہیں؟" اسے دیکھ کر ایک طرف بیٹھی فضلی سرعت سے اٹھی تھی۔ اس کی آواز سے زرناب بھی جیسے خود میں لوٹ آئی تھی۔ ایک جھکے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے دروازے کی سمت دیکھا اور سیف علی جنگ پلٹیں جھپکتا بھول گیا تھا۔

"باہر جائیں! دیکھ نہیں رہے بی بی صاحبہ بیٹھی ہیں۔" فضلی تیوریاں چڑھائے اس کی جانب بڑھی تھی۔ اسے ایک ٹک اپنی جانب تکتا دیکھ کر زرناب نے ناگواری سے رخ موڑ لیا تھا۔

"میں آپ سے بات کر رہی ہوں!" فضلی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی لیکن سیف تو جیسے کسی خواب کی سی کیفیت میں تھا۔ "میں ابھی مردوں کو بلوائی ہوں۔ شاید آپ کو پتا نہیں کہ یہ بختیار شاہ کی بہن ہیں۔"

"چھوڑو فضلی! زرناب کی آواز پہ فضیلت نے

تیزی سے اس کی طرف دیکھا جو دروازے کی جانب پشت کیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اپنا چہرہ نقاب کی اوٹ میں کرتے ہوئے وہ چلتی اور سیف کی طرف ایک نگاہ غلط ڈالے بنا مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی دروازے کی جانب آئی۔ سیف علی جنگ کو اپنی دھڑکنوں میں ارتعاش ساہر ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"راستے سے نہیں۔" اس سے قدرے فاصلے پر رکتے ہوئے اس نے ساٹ لہجہ میں کہا۔ سیف کی نظر اس کی جھکی پلکوں پہ ٹھہری گئیں۔

"میں نے کہا راستے سے نہیں!" غصے سے اپنی بات دہراتے ہوئے زرناب نے ایک پل کو اپنی شیطی برساتی آنکھیں اس کی نیلی آنکھوں میں ڈال دیں تو سیف علی کے لیے اپنی خوش بختی پہ یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ خود کو سنبھالتا ہوا وہ ایک طرف کو ہوا تو زرناب لب بپینچے، ہوا کے جھوکے کی طرح اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئی۔ اور پیچھے وہ محرزہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ زرناب چلتی ہوئی اس کی نظروں سے غائب ہو گئی۔

☆☆☆

معصومہ کی تذلیل نے اس کے اندر جو آگ بھڑکائی تھی، اس کی تپش سے اس کا چہرہ انگارے کی طرح دھبہ رہا تھا۔

اپنا غبار دار درگو کی چیزوں پہ نکال لینے کے بعد جب دماغ ٹھوڑا ٹھنڈا ہوا تو اسے زرناب کا خیال آیا۔ کتنے برے طریقے سے رو رہی تھی وہ، اور کتنی گری ہوئی بات معصومہ نے ان دونوں کے حوالے سے کی تھی۔ وہ تو زرناب شاہ کے سامنے نگاہ اٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ زرناب سے اس کی محبت ایک ایسی اہل حقیقت تھی جسے معصومی نے بھی جھٹلانے کی کوشش نہیں کی تھی مگر جسے پانے کا خواب اس نے اس نا بھگی کی عمر میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

زرناب شاہ کی عزت وہ خود پہ فرض سمجھتا تھا، وہ

اس ہستی کی بیٹی تھی جنھوں نے اسے دین و دنیا کی بھلائی سے آشنا کر دیا تھا۔ جو اس کے صرف محسن ہی نہیں بلکہ اس کے روحانی باپ بھی تھے۔ پھر بھلا وہ ان کی عزت کی طرف نگاہ اٹھانے کی گستاخی کیسے کر سکتا تھا؟ وہ اپنے اور زرناب کے مقام کو بہ خوبی سمجھتا تھا اسی لیے آج معصومہ کے ریکٹ الزام نے اسے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔ وہ اس حد تک شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی آنکھیں مارے بے بسی کے بھر آئی تھیں۔

ادھر زرناب بھی اپنے کمرے میں بیٹھی زار و زار رو رہی تھی۔ صدف اور شفق اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھیں۔ اور بالآخر جا کے شاہ بی بی کو بلا لائی تھیں جو اسے یوں آنسو بہاتا دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

"زری، کیا ہوا بیٹا؟" اس کا چہرہ ادنیٰ کرتے ہوئے انھوں نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو وہ ان کے سینے سے جا لگی۔

"بس۔ بس میرا بچہ۔" وہ اسے خود میں سینے سے لپٹا لے لگیں۔ "کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" انھوں نے صدف اور شفق کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں بی بی، یہ تو مصطفیٰ سے پیچھے جھولا ڈلوا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اندر آئی تو رو رہی تھی۔" صدف کی بات پہ شاہ بی بی نے اسے زبردستی خود سے الگ کیا۔

"مصطفیٰ سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟" انھوں نے اس کی ٹھوڑی اوپر کی تو پل بھر کی کچکا پھاٹ کے بعد زرناب کا سر اثبات میں ہل گیا۔

وہ معصومہ کی آخری دھمکی سے اتنا خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اسے لگ رہا تھا کہ اگر اس نے معصومہ کی شکایت کسی سے کی تو وہ بدلے میں یہ بھوٹا قصہ سب کو سنا دے گی جس کے بعد کا تو محض تصور ہی اس کے لیے سوبان روح تھا۔

"حد ہوتی ہے۔" شاہ بی بی نے مسکراتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔ صدف اور شفق نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

"چلو اب چل کر کھانا کھائیں۔۔۔ پاگل نہ ہو تو۔" انھوں نے زبردستی اسے اٹھایا تو وہ پیچھے کے ساتھ چلتی نیچے چلی آئی جہاں ہال میں دسترخوان پہ معمول کے مطابق دوپہر کے اس وقت صرف گھر کی خواتین ہی تھیں۔ معصومہ کو خاموشی سے کھانا کھاتا دیکھ کر زرناب نے بے اختیار سکون کا سانس لیا تھا۔

اس روز شاہ صاحب کی شہر سے واپسی رات گئے ہوئی تھی۔ اگلی صبح وہ بے حد طول سے تھے۔ مگر میں ایک صرف شاہ بی بی تھیں جو اپنے بھائی کی کیفیت سے واقف تھیں۔ اپنی جدی پشتی گدی کو آگے نہ بڑھانے کا فیصلہ، کتنا بڑا اور تکلیف دہ تھا! یہ کوثر شاہ سے بہتر بھلا کون جان سکتا تھا، جن کی آنکھ پیروں کے گھرانے میں کھلی تھی اور جنھوں نے ایک زمانے کو



اپنے باپ واداکر عزت کرتے دیکھا تھا۔ مگر پھر نظر حسین شاہ بھی اپنی جگہ پہ بالکل درست تھے۔ اس نام مقام کی حرمت پر انگلیاں اٹھوانے سے بہتر تھا کہ وہ اس سلسلے کو باعزت طریقے سے ختم کر دیتے تاکہ ان کے گھرانے کے عقیدت مند جب بھی ان کے بزرگوں کا نام لیں تو کم از کم اسی ادب اور محبت سے لیں جیسا کہ وہ ہمیشہ سے لیتے آئے تھے۔

ابھی بھی وہ دونوں بہن بھائی اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ جب ملازم نے آکر بڑی حویلی والوں کی آمد کا بتایا۔ خود کو سنبھالنے شاہ صاحب حجرے سے نکل کر ہال میں آئے تو آگے پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکروں سے لدی اپنی بھابھی، بھتیجیوں اور ان کی بہوؤں کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئے۔ ایسی ہی حیرت بی بی نور بانو، بی بی حورائے اور صبور شاہ کے چہروں پر بھی تھی، جو آج صبح ہی شہر سے آیا تھا۔ ایک صرف معصومہ اور بختیار شاہ تھے جن کے

کی آنکھوں میں ایسا کوئی حیرت بھرا تاثر نہ تھا۔ "خیر تو ہے بھرجانی، یہ آپ اتنی چیزیں کیوں لے کر آئی ہیں؟" سلام دعا کے بعد پھر نظر حسین شاہ نے نشست سنبھالی تو اپنے ساتھ ساتھ باقی سب کے دل کی بات بھی پوچھ ڈالی۔ بی بی نرجس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم سے اپنی گھر کی خوشی لینے آئی ہوں میرے دو۔ زرناب کو میرے ہاشم کی دہن بنا کے میرے آگن میں روشنی کر دو نظر۔ تم جانتے ہو یہ صرف میری ہی نہیں تمہارے مرحوم بھائی کی بھی خواہش تھی۔" رمان سے کہتے ہوئے انھوں نے شاہ صاحب کی طرف دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

بی بی نور بانو نے اڑی رنگت کے ساتھ شاہ بی بی کو دیکھا جو خود بھی لب پہنچے بڑی بھابھی کو تک رہی تھیں۔ اپنی معصوم سی زرناب کے لیے، بڑی

حوالی کا تنگ اور سازشوں سے بھرا ماحول ان میں سے کسی کو بھی پسند نہ تھا۔ اوپر سے معصومہ جیسی تیز طرار کے ساتھ دٹے سٹے کے رشتے میں بندھنا، ایک ایسا عذاب تھا جس میں وہ کسی قیمت پہ زرناب کو جھونکن نہیں چاہتی تھیں۔

"معافی چاہتا ہوں بھرجانی مگر میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر نظر حسین شاہ کی ٹھہری ہوئی آواز ہال میں ابھری تو تمام حاضرین محفل یہ گو با سکتہ طاری ہو گیا۔ "کیوں نہیں کر سکتے؟ آخر کس چیز کی کمی ہے میرے ہاشم میں؟ کیا وہ پڑھا لکھا نہیں، صاحب جاسیدا نہیں یا تمہارا خون نہیں؟" بی بی نرجس نے بڑی مشکل سے اپنی ناگواری پہ قابو پایا تھا۔

"وہ صاحب کروار نہیں۔" شاہ صاحب سرد لہجے میں بولے تو سب چپ کے چپ رہ گئے۔

"میں آج تک صرف اس لیے خاموش تھا کہ پاتیں صرف سننے اور ستانے کی حد تک محدود تھیں۔ لیکن کل جس طرح میں نے اس لڑکے کو بے حجابانہ لڑکیوں کے ساتھ سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے دیکھا ہے میرے لیے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ ہاشم کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں۔"

"ہاں تو اس میں کون سی غلط بات ہے۔" بی بی نرجس شپٹا کر سنہلیں۔ "جب شہری بوینڈر سٹیوں میں لڑکیوں کے ساتھ پڑھیں گے تو نال (ایک ساتھ) اٹھنا بیٹھنا تو ہو گا ہی۔"

"اور اس کی شراب نوشی کے بارے میں کیا کہیں گی بھرجانی؟" انھوں نے سپاٹ نظروں سے بی بی کی طرف دیکھا تو وہ ساکت رہ گئیں۔ پھر نظر حسین شاہ یقیناً اتنے بے خبر نہیں تھے جتنا کہ وہ انھیں سمجھنے کی غلطی کر بیٹھی تھیں۔

"یہ ہمارے ہاشم پہ الزام ہے جا چا

جی۔" معصومہ جالبلا کر بولیں تو شاہ صاحب کی بازو ب نظر میں بہو کے چہرے پر جاتھہریں، جو نجائے کیوں ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے نظریں چرا گئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کے پلے پٹے ان کے سامنے جھوٹ بول رہے تھے یہ مقام افسوس نہیں تو اور کیا تھا۔

"چلو الزام ہی سہی۔ لیکن میں زرناب کے لیے ہاشم کا رشتہ قبول نہیں کر سکتا۔" انھوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں گفتگو تمام کی۔

"نہ فی ردی کتھے دیا میں گا نظر؟" (تو پھر بیٹی کہاں بیا ہو گے نظر؟) بی بی نرجس نے استہزائیہ انداز میں شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔ "اگر میرا ہاشم برا ہے تو پھر تو خاندان کے سارے لڑکوں میں کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ تم کیا بیٹی کے لیے خاندان سے باہر رشتہ ڈھونڈو گے؟" انھوں نے کاٹ دار لہجے میں سوال کیا۔

"کیوں نہیں۔ اگر غیر خاندان سے کسی دین دار اور سلجھے ہوئے لڑکے کا رشتہ آئے گا تو میں اسے ضرور قبول کروں گا۔" وہ بنا کسی پس و پیش کے بولے تو سب کے منہ کھل گئے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا صاحب؟" بختیار شاہ نے ناگواری سے باپ کی جانب دیکھا۔

"وہی جو ترقی دین ہے۔ یہ ذات برادری اور خاندان میرے لیے کوئی مٹھی نہیں رکھتے۔ میرے لیے اہم ہیں تو شرافت اور نجابت۔ پھر چاہے وہ اپنوں میں ملے یا غیروں میں! " انھوں نے بیٹے کی طرف دیکھا تو معصومہ کی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔

"بس تو پھر غیروں میں شادی کی تیاری کریں چا چاجی کیونکہ آپ کا نیک داماد تو اسی حویلی میں ہی ہے۔" ہونٹوں پہ کاٹ دار مسکراہٹ لیے، وہ سلکتے لہجے میں بولیں تو ایک پل کے لیے سب کو ساپ

سوکھ گیا۔

"کیا ایک رہی ہو!" بختیار شاہ نے بیوی کو آنکھیں دکھائیں۔

"بک نہیں رہی، آپ لوگوں کی آنکھوں پر پڑا پروہ اٹھا رہی ہوں۔ دوسروں کے کردار پہ بات کرنا تو بہت آسان ہے، اب ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانک لیں۔"

"اس فضول گوئی کا مقصد؟" شاہ صاحب کی سرد آواز اچانک گوئی تو بی بی نرجس نے پریشان ہو کر بیٹی کو دیکھا جو نجائے کیا اول فول بولے جا رہی تھی۔

"یہی کہ جن کے اپنے کتھے کھوئے ہوں انھیں دوسروں پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ آپ نے جس بیٹی کے لیے شرافت کا بہت اونچا معیار قائم کر رکھا ہے وہ تو نجائے کب سے آپ کی ناک کے نیچے اس حویلی کے لیے ایک "دیندار" اور "پرہیزگار" داماد ڈھونڈنے بیٹھی ہے!" معصومہ نے زہریلے انداز میں

"دیندار" اور "پرہیزگار" یہ زور دیا تو پھر نظر حسین شاہ کو لگا جیسے زمین ان کے قدموں تلے سے کھٹک گئی ہو۔ الفاظ تھے یا کوئی ہم۔ سفید حویلی والوں کو آسمان اپنے سر پہ گرتا محسوس ہوا تھا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا خبیث عورت!" بختیار شاہ کی دھاڑنے رو دیوار کو لرزا کے رکھ دیا تھا۔ وہ جھجکی سی تیزی سے اٹھے اور معصومہ پہ پل پڑے۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

سوانحی کتب

ماڈل حمیرا مغل
میک اپ --- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا

خوشگشتے کا

تیز برستی بارش اور ساعتوں میں کسی کے تیز چہیتے بیٹے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں میں آفندی اور سہیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انکس اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہر ماہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہر ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی، آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا خان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں۔ تالی جان، مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، ان کی بیوی شہرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو جانے کی وجہ سے مہر ماہ کا رابطہ غیر سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ وقار آفندی اور زرنگار آفندی کی محبت اور آفندی کے بے بسی کے بارے میں سوچتی رہ جاتی ہے۔

وہ موحد کے آفس میں رابطہ کر کے اس سے ملنے کا کہتی ہے وہ گھر آ کر بات کرنے کا کہتا ہے۔ وہ اس کے آفس پہنچ کر اس کے سامنے نیر کی داستان سن کر اس سے ہمدردی محسوس کرنے کا کہتی ہے۔ موحد کہتا ہے کہ اس کی پوری کہانی سن کر فیصلہ کرنا کہ وہ کس چیز کا حق دار ہے۔ سزا یا معافی۔

ملاح نے ڈرائیور کو کچھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ اور کبیر کے لیے اس کے دل میں شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ کبیر اسے کالج سے واپسی پر لینے آتا ہے اور اپنے گھر لے جا کر اسے اپنی ماں بہنوں سے ملوٹا ہے۔ نمبر فون پر مہر ماہ کو اپنی اور صوری کہانی سنا تا ہے۔ آغا جان مہر ماہ سے بات کرتے ہیں۔ اور نمبر سے نکاح قائم رکھنے پر اسے سخت سناٹے ہیں۔

وہ نمبر کی حمایت کرتی ہے تو وہ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ مہر ماہ فون پر نمبر سے کہتی ہے کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ ہائی ممبر لیتا ہے۔ ملاح، موحد سے مدد مانگتی ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی رشتہ لاتا ہے۔ ملاح ناراض ہو جاتی ہے۔

مہر ماہ، نمبر آفندی سے ملنے کبیر کے ساتھ جاتی ہے اور اسے باہر انتظار کرنے کا کہہ کر ریٹورنٹ کے اندر چلی جاتی ہے پہلے سے کب کی ہوئی ٹیبل پر اس کا انتظار کرتی ہے۔ کہ چائیک ایک آواز پر چونک جاتی ہے۔

زرنگار کی کہانی جان کر مہر ماہ آفندی ہاؤس والوں کی بے بسی اور کبیر پر دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ موحد کو بلا کر اس سے بات کرتی ہے۔

موحد ملاح کے لیے رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔ تو ملاح بہت افسردہ ہوتی ہے۔ وہ کبیر کو چاہتی ہے۔ موحد اسے بتاتا ہے کہ کبیر گھر چھوڑ گیا ہے اور اس نے آفس سے اپنی برابری کے کاغذات بھی چرا لیے ہیں۔
 کبیر آفندی مہر ماہ کو راستے میں ملتا ہے۔ وہ اسے جھڑک کر آگے بڑھ جاتی ہے۔
 موحد ملاح کے لیے جو رشتہ لاتا ہے۔ ان کی شان و شوکت دیکھ کر سائرہ چچی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتی ہیں۔ جبکہ ملاح شدید پریشان ہے۔

یاتیسیوں قیظ

نجانے کتنے کلکوں میں بنا ہوں
 میں اپنے ہاتھ سے خود گر پڑا ہوں

مقابل ہے مرے سارا زمانہ
 میں اپنے ساتھ بس تنہا کھڑا ہوں

مٹانے کو مجھے سب مر رہے ہیں
 سویلوں ثابت ہوا، سب سے بڑا ہوں

نہ کوئی ساتھ تھا، نہ ساتھ ہے اب
 اکیلا ہوں، اکیلا ہی ڈٹا ہوں

کوئی بتلائے کیا بس میں غلط ہوں
 یا بس حق بات پر اک میں اڑا ہوں

بنے گی کیا مری پھر ظلمتوں سے
 دیا تھا، بن کے سورج میں جلا ہوں

قیامت کیا ہے مجھ کو نہ بتا یہ
 میں ایسے ہی حادثوں میں پلا ہوں

(انتہا ابرک)

آفندی ہاؤس پر غیض و غضب کی فضا طاری تھی۔ معزز مہمانوں کو چائے سے تواضع کرنے کے بعد ان کے ساز و سامان سمیت واپس کر دیا گیا اور تائی جان نے کوئی خیال کیے بنا مہمان خواتین کے ٹکٹے ہی شرہ چچی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

”کیا تھا شرہ..... کس بات کا بدلہ لیا ہے موحد نے ہم سے..... میری بیٹی کے لیے یہ اعلیٰ رشتہ لایا ہے وہ؟“ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے شرہ نے اطمینان سے انہیں دیکھا۔
 ”جس گھر میں میری ہو، وہاں پتھر آیا ہی کرتے ہیں بھابی! اور یہ پتھر کسی مخصوص قسم کے نہیں ہوتے۔ ہر طرح کا پتھر شامل ہوتا ہے ان میں“
 ”پر یہ بھی تو دیکھو شرہ! کہ ہمارے ہی گھر کے ڈرائیور کا رشتہ ہماری بچی کے لیے لایا ہے وہ؟“ سائرہ چچی کے پیٹ میں کسی کے مارے بل پڑ رہے تھے مگر بظاہر بہت درد مندی سے کہا۔
 ”تو ڈرائیور کیا انسان نہیں ہوتے اور کبیر کون سا آپ لوگوں کا زرخیز تھا؟“ شرہ نے انہیں نگاہ غلط

انداز سے دیکھا۔
 ”جس شان سے کبیر کی بہنیں ملاح کا ہاتھ مالتے آئی تھیں ویسے تو ہماری کسی بھی بچی کی قسمت نہیں کھلی۔ صاف لگ رہا ہے کہ کبیر الحمد للہ بہت اچھے حالوں میں ہے۔“

”تمہارا بیٹا جو بل چکا ہے اس کے ساتھ۔ حالات تو اچھے ہونے ہی تھے۔ یہ کرداروں کی جائیداد کے کاغذات، باسی روٹیاں کچھ کراس کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ اس کی ہمت تو بڑھنا ہی تھی تاہم ہاری کوئی بیٹی ہوتی تو میں دیکھتی کیسے ان چوڑے چاروں کے رشتے اکٹھے کرتیں تم“ تائی جان کا چہرہ خطرناک حد تک لال ہو رہا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے سے تو ملاح کا چہرہ ہی نہ ہٹتا تھا۔

”ہماری ہونے والی بھابی تو اس قابل ہیں کہ یہ سب چیزیں ان پر واردی جائیں“ ملاح جو مہر ماہ کے ساتھ آتے ہوئے بس مرنے والی کیفیت میں تھی یہ آواز سن کر بے تحاشا چوکی۔ اور نگاہ اٹھا کر لڑکے کی بہن کو دیکھا تو اعصاب کو شدید قسم کا جھٹکا لگا۔

”ہماری بہت سی زمینیں ہیں آئی۔ بہت بڑا آبائی گھر ہے۔ اور ابھی پچھلے ماہ یہاں شہر میں نیا گھر لیا ہے.....“ وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ ملاح کا ذہن لمحہ بھر کو خالی ہو گیا۔
 (بھابی اپنی بہنوں کے لیے اچھے فیصلے ہی کیا کرتے ہیں) اسے موحد کی بات یاد آئی تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”باقی باتیں چائے کے بعد..... آئیں آپ لوگ“ شرہ نے باتوں کا سلسلہ روک دیا۔ چائے کے ساتھ دیگر ریفریشمنٹ سے پوری میز بھری ہوئی تھی۔

اور ملاح..... اس کا تو دل چاہتا تھا کہ چنگ بن کر ہوا میں اڑنا شروع کر دے۔ اور پھر چائے کے دوران اس نے کبیر کی بہنوں کو آگے بڑھ کر بہت محبت سے ایک ایک چیز پلیٹ میں ڈال کر دی اور بعد اصرار کھلائی اس نے جہاں تائی جان کو حیران کیا وہیں ان کا دل مطمئن بھی ہوا کہ ملاح رشتے والیوں کی چکا چوند سے متاثر ہوئی تھی۔ اب ان کے تو فرشتوں کو بھی آنے والی قیامت کے مارے میں علم نہیں تھا کہ گزشتہ تین دنوں سے ملاح بی بی کے زرد بڑے کال پکا ایک دبک کیسے اٹھے۔ مہر ماہ خود ملاح کو دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی کہ ذرا دیر کے لیے ہی سہی مگر گرم از کم وہ افسردگی کے لمبا دے سے تو نکلی۔

”نام کیا ہے آپ کے بھائی کا..... کیا کام کرتا ہے؟“ تائی جان نے خوش دلی سے بالآخر وہ سوال پوچھ ہی لیا جسے آنے والیاں ابھی تک جان بوجھ کر شاید پیچھے رکھے ہوئے تھیں۔ لمحہ بھر کو ڈانٹنگ روم میں خاموشی پھیل گئی۔ مہر ماہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”آپ اسے ہم سے بھی زیادہ اچھی طرح جانتی ہیں آئی! کبیر خان نام ہے ہمارے بھائی کا۔ اور اللہ

نے اتنا نواز رکھا ہے کہ فی الحال تو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں انہیں، وہ مسکراتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

لو جی۔۔ ایک چھت تو کیا پورا آفندی ہاؤس تائی جان۔ مہرماہ اور سارہ چچی برگوا آن گراہ مہرماہ نے بے یقینی سے ملاحد کی طرف دیکھا تو اسے تھمتاتے چہرے کے ساتھ مسکراہٹ دباتے دیکھ کر گہرا سانس بھر کر رہ گئی (تو ملاحد کے دل کی خوشی کا نام کبیر خان تھا۔) اور یہ بات موحد کو پتا چلی۔۔۔؟

"کبیر۔۔۔ وہ جو ڈرائیو رہا ہمارا؟" تائی جان کا چہرہ تاریک پڑا مگر وہ خود کو بدقت اس جھٹکے سے سنبھال کر بولیں تو لہجہ آپوں آپ نصیحت آمیز ہو گیا۔ مگر کبیر کی بہنوں کے چہرے پھٹکے نہیں پڑے۔

"جی آئی! لیکن اب الحمد للہ اسے کسی ایسی نوکری کی ضرورت نہیں رہی، وہ مسکرا کر اعتماد سے بولی۔ لیکن دلوں کے تنگ لوگوں کے دماغ اور سوچ بھی اتنی ہی تنگ ہوا کرتی ہے۔ تائی جان نے انہیں سخت سست سنائیں اور ان پر اپنی جاہ و حشمت اور خاندانی حسب و نسب کے ساتھ ساتھ کبیر اور اس کے خاندان کی بد حالی کو۔۔۔ اچھی طرح واضح کیا۔

"شرم آتی چاہیے تم لوگوں کو۔ شخص ایڑیاں اٹھا لینے سے ہاتھ بڑھا کر چاند کو نہیں چھو لیا جاتا۔ اس کے لیے قدامت کا ہونا ضروری ہے"

مہمانوں کو ان کے تحائف سمیت واپسی کا راستہ دکھا کر اب تائی جان فی الحال شرہ چچی کی گوشمالی کر رہی تھیں۔ اس کے بعد آغا جان یقیناً موحد کی کھال کھینچنے والے تھے۔ جو گھر سے تب ہی سے غائب تھا جب مہمان بس آنے ہی والے تھے۔ اور اس کی وجہ اب سب کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"ای! اب اپنا وعدہ پورا کریں۔ آپ کا کہا ہوا پروپوزل منظور کر رہی ہوں میں۔" ملاحد نے ہمت کر کے کہا تو تائی جان کا دل چاہا، اس کے منہ پر پھپھر دے ماریں۔

"بکو اس بندر کو ملاحد! اس موحد کے بچے کی کھال تو آغا جان اتاریں گے۔ مجھے تو یہی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے ڈرامہ کیا کھیلایا ہے ہمارے ساتھ۔ اور یہ کبیر۔۔۔ اس قدر خبیث اور بددیانت لکے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ غضب خدا کا۔ گھر کی عزت پر نظر رکھی ہوئی تھی اس نے۔ اور اس کا ہاتھ نہ جانے دولت کے کس کنویں میں پڑ گیا ہے۔ ہونہ۔۔۔ ہمیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ تملتا تملتا کر بے حال ہو رہی تھیں۔ بھی موحد پر غصہ آتا تو کبیر بھی پر۔

"پہلے وہ غریب تھا تو اس کے ڈرائیو رہنے پر اعتراض تھا آپ کو۔ اب اگر ہماری حیثیت کا بن کر اس نے رشتہ مانگا ہے تب بھی آپ کو اعتراض ہو رہا ہے، ملاحد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"مجھے کیا پتا تھا وہ ذلیل انسان ایک کی کارشتہ لے آئے گا ہمارے لیے۔ اور تم بھی ملاحد۔۔۔ کچھ تو دیکھ کر گرتیں، انہوں نے تم وغصے سے کہا تھا۔

"لیکن آپ نے کہا تھا کہ۔۔۔۔۔"

"بکو اس کی تمی میں نے۔ ہر حال میں انکار ہی کرنا تھا میں نے۔ سنا تم نے، وہ چلا اٹھیں۔

"لیکن یہ رشتہ تو موحد بھائی کے توسط سے آیا ہے ای امیری تو اس میں کوئی انوالومنٹ نہیں۔"

"منہ بند رکھو اپنا۔ ایک بار اسے ہمارے ہاتھ تو لگ جانے دو پھر حشر دیکھنا اس ذلیل انسان کا۔ ساری عمر ہمارے ٹکڑوں پر پلا اب چار کاغذات ہاتھ میں کیا آگئے زمینوں کے ہمارے ہی گھر کا داماد بننے کے خواب دیکھنے لگے وہ نامراد" وہ حقارت سے بولیں۔

"اس کا کوئی تصور نہیں۔ یہ خواب اسے میں نے دکھایا ہے امی! وہ ایک دم سے بولی تو صدیقہ بیگم کا جلال عود کر آیا۔ ان کے پھپھرنے ملاحد کو ہلا دیا۔ مہرماہ تیز لہجے میں بولتی اندر داخل ہوئی۔

"بس کر دیں اب یہ ظلم کی داستانیں لکھنا امی! ماضی سے نہیں تو حال ہی سے صیحت پکڑ لیں آپ لوگ! اس نے ملاحد کا سر شانے سے لگا کر پیسے کہا۔ تو وہ سرد مہری سے گویا ہو میں۔

"تم تو اپنی زبان بند ہی رکھو مہر! ایک بے غیرت تو زبردستی ہمارے خاندان میں داخل ہو گیا تھا۔ دوسرے کو اپنی مرضی سے شامل کر لیں، اتنا دماغ خراب نہیں ہوا ابھی ہمارا۔ لے جاؤ اسے بھی یہاں سے، میرا تو تم دونوں کی شکل دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا! ماں باپ کا نام رول کر رکھ دیا ہے تم دونوں نے"

"پتا نہیں ہم کب اس حقیقت کو سمجھیں گے کہ ہمارے اعلا حسب و نسب ہونے میں ہمارا ایسا کوئی کمال نہیں ہوتا کہ ہم بانی سب کو تقویٰ کے بجائے محض اس کے اسٹیشن کی بنیاد پر پرکھنا شروع کر دیں!" مہرماہ متاسفانہ نظروں سے ماں کو دیکھ کر سرد لہجے میں کہتی ملاحد کو کمرہ کے پورشن میں لے گئی۔ تائی جان دکھتا سر لیے بستر پر گری گئیں۔

☆☆☆

موحد گھر آیا تو مہرماہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ پورچ میں دو گاڑی سے نیچے اُترا تو ساتھ ہی مہرماہ اس کا بازو تھام کر اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے لان کی کچھیلی طرف لے گئی۔

"کیا ہو گیا، کون سی قیامت آگئی ہے؟" وہ حیران تھا۔

"قیامت ہی سمجھو۔ تم نے جو کام کیا ہے یہ آغا جان اس کے نتیجے میں تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں، مہرماہ نے تنہی سے کہا۔

"ایسا کیا کر دیا ہے میں نے؟" موحد نے شانے جھٹکے۔

"تم جانتے تھے کہ یہ رشتہ کبیر کا ہے؟" مہرماہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تو موحد نے نرمی سے کہا۔

"اب میں رشتہ لایا ہوں تو ظاہری بات ہے جانتا ہی ہوں گا نا۔"

"پھر بھی تمہیں کیسے پتا چلا۔ ملاحد خود تو بتائیں سکتی۔ کبیر ہی ہو گا تمہارا ساتھی" مہرماہ نے طنز کیا۔

"اس پر الزام مت لگاؤ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں پروپوزل ضرور دیا ہے اس نے میرے کہنے پر۔"

"اب تم یہ سوچ لو کہ آغا جان کے سامنے کیا کہنا ہے جاکر۔ وہ تو تمہاری کھال کھینچنے کو تیار بیٹھے ہیں۔"

مہرماہ نے غلٹ سے کہا۔

"وہ تو خیر میں جانتا ہی تھا لیکن تمہاری اتنی ہمدردی کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے گہری نظروں سے مہرماہ کو دیکھا تو وہ بدکی۔

انسان ہے، خاندانی بھی ہے، میرے خیال میں تو آغا جان کو کوئی خاص اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“ موحد بے اختیار مسکرایا۔
 ”چلو، یہ بھی اچھی بات ہے۔ کبیر کی سپورٹ میں کافی لوگ ہو جائیں گے۔ اس طرح آغا جان کو منانے میں بھی آسانی ہوگی۔“
 ”کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ تم آغا جان کو نہیں جانتے۔“ مہرماہ نے اسے ٹوک دیا، وہ جواب اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لمحہ بھر کو رک مڑ کر مہرماہ کی طرف دیکھا اور کئی سے بولا۔
 ”مجھ سے زیادہ اچھی طرح انہیں کون جان سکتا ہے۔ اس ہمدردی کا شکریہ۔“ مہرماہ خاموش رہ گئی۔ موحد دروازہ دھکیلا اندر داخل ہو گیا تو وہ جیسے حواس میں لوٹی۔ خود کو کوسا۔ صبح سے خود کو سمجھا رہی تھی کہ موحد سے ہمدردی نہیں کرنی۔ لیکن بار بار خیال آتا کہ آغا جان سے اتنا بڑا پرچکا اس نے ملاجی کی خاطر لیا ہے اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں۔ تو بے اختیار ہی اسے ہوشیار کرنے کے ارادے سے روک بیٹھی۔ خود سے الجھتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

آغا جان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ موحد کو اسی وقت سنگسار کر دیں۔
 ”تمہارا دماغ خراب لگ رہا ہے ان دنوں مجھے۔ جس وقت تم نے کبیر کو جائیداد کے کاغذات واپس کیے تھے، مجھے اسی وقت پاورٹائرنی کی سلسل کروا دینی چاہیے تھی۔“ وہ بے حد ناراضی سے بولے۔
 ”تو اب یہ شوق پورا کر لیں۔ ابھی کچھ نہیں بچتا۔“ موحد نے اثر لیے بغیر کہا تو آغا جان کے تاثرات میں ناگواری اترنے لگی اور لہجے میں پتھر پلا پلا گیا۔
 ”کبیر کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا؟“
 ”فکر مت کریں حلال کی کمائی ہے اس کی ساری۔“ وہ مسکرایا۔
 ”مجھے بے وقوف مت بناؤ موحد! اتنا تو کوئی بے وقوف بھی سمجھ سکتا ہے کہ فقط جائیداد کے کاغذات ہاتھ میں آنے کی بنا پر وہ اتنا امیر نہیں ہو سکتا کہ لاکھوں لانا شروع کر دے۔“ وہ ہنسنے لگا۔
 ”اس کی بہادر آباد والی زمین کیش پر خرید لی ہے میں نے۔“ وہ سینے پر بازو پھیرتا اس قدر آرام سے بولا کہ وہ سنائے میں آ گئے۔ پھر سر سراتے لہجے میں کہا۔
 ”وہ..... وہ تو پہلے ہی ہماری تھی..... کتنے میں خریدی؟“

”ہماری نہیں اس کی تھی۔ ہاں البتہ قبضہ آپ کا تھا اور چونکہ آپ کو وہ زمین بہت پیاری تھی۔ اس لیے میں نے وہاں اس کی فصل کی قیمت سمیت وہ زمین آپ کے لیے خرید لی ہے۔“ موحد نے سچ کرتے ہوئے نرمی سے بتایا تو وہ بھڑک اٹھے۔
 ”اے کیسے کیش ادا کر دیا تم نے..... زمین کے کاغذات واس کا انتقال۔۔۔ وقت لگتا ہے اس پرنسپل کو سب کچھ اور پیسہ واپس لو اس مردود شخص سے۔“

”میں نے مارکیٹ کی ڈیمانڈ کے مطابق اس زمین کی سوا کروڑ کی قیمت ادا کی ہے آغا جان! کاغذی کارروائی کا کیا ہے وہ آرام سے ہوتی رہے گی۔ اب کبیر ہمارے لیے کوئی انجان شخص تھوڑی ہے۔ ہم سے رشتہ جوڑنے کی خاطر اس نے شہر میں گھر لیا ہے گاڑی لی ہے۔ اب بے چارہ کہاں سے واپس کرے گا سارا روپیہ۔ اور ویسے بھی میں اسے قول سے پھرنے والا نہیں ہوں سو یہ ذیل پرنسپل نہیں ہو سکتی۔“ وہ مسکرا رہا

تھا۔ آغا جان کو اتنی سردی میں بھی سوا کروڑ کا سن کر پسینہ آنے لگا۔ وہ دل تھام کر اپنی کرسی پر گرے گئے۔
 ”بے وقوف۔۔۔۔۔“ وہ اتنی زور سے گرجے کہ ان کے حلق میں خراش سی آ گئی وہ کھانسنے لگے۔ موحد نے ہمدردی سے آگے بڑھ کر ہاتھ سے ان کی پشت مسکی تو انہوں نے موحد کا ہاتھ جھٹک دیا۔
 ”ایک چیز جو پہلے ہی ہمارے قبضے میں تھی اسے رقم دے کر۔۔۔ بلکہ کروڑوں روپیہ دے کر خریدنا بے وقوفی ہے اول درجہ کی۔“ وہ غصے سے بولے موحد نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔
 ”یہ تم کا مال اسے ایمان داری سے لوٹا دینا اول درجہ کی نیکی ہے آغا جان! بہت غلامی کاٹی ہے ان باپ بیٹے نے آپ کی۔ اب بس ختم ہوا وہ دور۔ اب تو ملاحد اور کبیر کی شادی کا سوچیں آپ۔“ موحد کا انداز پر سکون تھا۔ مگر اس کی آنکھیں..... آغا جان تھرا گئے۔ سہیل ٹھیک کہتا ہے، اس کی آنکھوں کی آنچ دیتی سردی کیفیت..... وہ آج دکھائی دی تھی انہیں۔ اور اوپر سے اس کے الفاظ..... ان کی روح پر جیسے کسی نے کوڑا رسید کیا ہو۔

”بکواس مت کرو۔ اتنے اعلا خاندان میں موری کی اینٹ لگا کر زمانے کی جوتیاں کھائیں ہم؟“

”ہا۔۔۔۔۔ اعلا خاندان.....“ موحد ان کے سامنے کھڑا ہوا اور مسخرانہ بولا۔

”کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں آپ کے خاندان میں آغا جان! آپ میں کبیر، ہم سب انسان ہی تو ہیں ایک جیسے۔ ایک سا خون۔ ہمارے دین میں رنگ و نسل اور خاندان کے بجائے صرف مٹتی اور پرہیزگار انسان کی برتری ثابت ہے۔“

”ایک غلطی وقار نے کی تھی جس کا خمیازہ آج تک ہم بھگت رہے ہیں۔ اب تم چاہتے ہو کہ دوسری غلطی ہم کریں۔ اس ڈرامہ کو اپنے خاندان میں شامل کر کے۔ آج تمہیں کچھ تو ہماری اور اپنی جاہ و شہمت کا خیال کیا ہوتا۔“ وہ اس وجہ حقارت سے بولے کہ موحد با مشکل ضبط کر پایا۔

”اس چیز کا کیا خیال کروں آغا جان! جس میں آپ کا یا میرا کوئی کمال ہی نہیں۔ یہ ساری عزت و آسائش تو اللہ کی دین ہیں۔ ان پر کیا اترا نا اور پان کرنا اور ہی بات غلطی کی تو اس وقت بھی غلطی آپ کی تھی اور آج بھی آپ ہی غلط ہیں آغا جان!“ بے حد تنبی سے کہا تو وہ ہارے غصے کے لرزے لگے۔

”دع ہو جاؤ یہاں سے اور اس پاور آف اٹارنی کو کل سے پرنسپل سمجھو، میں صبح بات کرتا ہوں وکیل سے۔ آفس جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔“ ان کا انداز قطعی تھا۔ چند لمحے انہیں دیکھنے کے بعد وہ تاسف سے بھرا لہجے میں بولا۔

”توبہ کا دکھلا ہوا انسان کو دیر نہیں کرنی چاہیے آغا جان! اور نہ بعض اوقات واقعی بہت دیر ہو جایا کرتی ہے۔“

”گیٹ آؤٹ“ وہ زور سے گرجے تو وہ شانے جھٹکتا اسٹڈی سے نکل گیا۔ آغا جان نے اسی وقت سہیل اور مبین آفندی کو طلب کیا۔

”کل سارا سلسلہ اپنے ہاتھ میں لو تم دونوں اور موحد کو گھسنے نہیں دینا آفس میں۔ اس نالائق کو میں کچھ زیادہ غلط ہی سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ تو ہمدردی اور ترس میں ہی سب کچھ گنوا دے گا۔“ وہ قطیعت سے کہتے دونوں بھائیوں کے دل کے پھول کھلا گئے۔

انہوں نے مؤبدانہ سر ملاتے ہوئے ایک دوسرے کو مسکراتی نظروں سے دیکھا تھا۔ خس کم جہاں پاک۔ موحد نامی کاٹا جیسے ان کی راہ میں آیا تھا ویسے ہی خود بخود دھٹ گیا تھا۔ جبکہ آغا جان کا تو کلیجہ مسلسل

Celebrating
50 Years of Success

The Smart School
Tomorrow is our Destiny
A Project of The City School

THE SMART SCHOOL

ADMISSION OPEN



Quality Education

Community Commitment



- Holistic development
- Project based learning
- Investigative processes, technology, interactive resources
- Early Years Education through fun and play
- Exam focused Student Resource Material for Matric
- Child Educational Insurance

Head Office:

31- Gurumangat Road, Industrial Area,
Gulberg III, Lahore
U.A.N. +92 42 111 444 123
Phone +92 42 35773069-77
E-mail: info@thesmartschools.edu.pk

Southern Region:

The Smart Tower Plot-C-10/2,
Off Shalimar-e-Faisal Lines Area,
Sector 8, Opp Gora Gashistan, Karachi
Phone +92 21 32780125-8
E-mail: msr@thesmartschools.edu.pk

Northern Region:

House 875 Block-F Satellite Town,
Near Holy Family Hospital,
Rawalpindi
Phone +92 308 8686011-7
E-mail: gm-sr@thesmartschools.edu.pk

نہی نے منہ میں جکڑا ہوا تھا۔ موحّد سے انہوں نے وقار آفندی اور فاران کے جسے کی محبت بھی محسوس کی تھی۔ وہ ملا تو یوں لگا جیسے دونوں بیٹوں کو سود کی شکل واپس پالیا ہو۔ وہ فاران کا بیٹا تھا اور اس میں شک کا وقار کی جھلک تھی۔ تو اب اس کا پلٹنا انہیں کیوں تکلیف نہ دیتا.....؟

☆☆☆

کبیر کی کال دیکھ کر ملاح کا دل ترنگ میں دھڑکا۔ اس نے فوراً موبائل کان سے لگا یا۔
"السلام علیکم۔۔۔ کیسی ہیں؟" کبیر کا لہجہ مسکراتا ہوا سا تھا۔ ملاح کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

آہستہ آواز میں اس کے سلام کا جواب دیا۔ تو وہ ہنسا اور شرارت سے پوچھا۔
"پھر کیا سوچا ہے آپ نے میرے پرو پوزل کے بارے میں یور ہائی ٹیس.....؟" ملاح کی مسکراہٹ گم ہوگئی۔

"گھر میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا ہے کبیر! اللہ جانے آغا جان اب موحّد بھائی کا کیا حشر کریں گے۔"
"میں خود آغا جان کی خدمت میں حاضر ہوں گا یہ تو موحّد سر نے منع کر دیا تھا فی الوقت مجھے۔ وہ گھر والوں کو ذاتی طور پر بتا کر جاتا ہے۔"

"کوئی بھی راضی نہیں کبیر! امی نے تو ہنگامہ ہی مچا دیا ہے۔" ملاح آزرده ہو کر بولی۔ "اب کیا ہوگا؟"

"اب کیا ہوگا؟" کاب کیا سوچتا۔ وہ ہلکے سے ہنسا۔
"پھر بھی کبیر! میں گھر والوں سے بغاوت نہیں کرنا چاہتی۔ باعزت طریقے سے رخصت ہونا چاہتی ہوں اس گھر سے۔ ایسے کہ سب نہیں اتنی ہی عزت دیں جتنی کہ موحّد بھائی کو دیتے ہیں۔"

"ہوں۔۔۔۔۔" وہ جیسے کسی سوچ سے چونکا پھر آزرده ہو کر بولا۔
"عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ملاح! موحّد تو محض میرا ساتھ دینے پر ہی لپٹ میں آ گیا ہے۔ آفندیز بہت کم کسی پر مہربان ہوتے ہیں۔" اسنے بنجیدہ ماحول میں بھی اس کی بات سن کر ملاح کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔

"تم تو پھر بہت خوش قسمت ہوئے خان!"
کبیر کا موڈ بھی ایک دم سے بدلا۔ پھر یور تہہ اس کے لبوں سے آزاد ہوا تھا۔ ملاح جھینپ گئی۔
"میں دوسرے معنوں میں کہہ رہی تھی۔ موحّد بھائی کی سپورٹ حاصل ہے تمہیں۔"
"وہ تو ہے ہی مگر ملاح آفندی کی نظر کرم اس سپورٹ پر بھاری ہے۔" وہ مدہم لہجے میں بولتا ملاح کی دھڑکنیں منتشر کر گیا۔

"وہ..... تم نے اسنے پیسے خرچ کر دیے۔ بس کپڑے اور پھول ہی کافی تھے میرے لیے۔" اس نے فوراً بات بدلی۔

"وہ ہمارے گھرانے کی روایت ہے ملاح! دنیا دکھاؤ انہیں تھا اور روایت نہ بھی ہوتی تو ملاح آفندی پر یہ سب شاز"

ملاح کی آنکھ کا کونا بجھنے لگا۔
یہ شخص نہ ملا تو ملاح آفندی کے دل کا بہت بڑا نقصان ہونے جانا تھا۔
"خوش ہو.....؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ ملاح نے جھنجکی سے آنکھ کا کونا صاف کیا۔

”بہت۔۔۔ مگر خوف زدہ بھی کبیرا نہ جانے کیا فیصلہ ہو۔“

”اللہ بہتر ہی کرے گا ان شاء اللہ۔ فکر مت کرنا ملاحدہ میں نے یہ پروپوزل تمہاری زندگی کو مشکل بنانے کے لیے نہیں بلکہ اس میں خوشیاں بھرنے کے لیے بھیجا ہے تو باقی کی فکریں کبیر خان کے لیے رہنے دو۔ تم صرف اچھے اچھے خواب دیکھو۔“ وہ مسکراتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ملاحد کا دل ٹھہرنے لگا۔

”تم ہو کہاں اس وقت۔۔۔؟“

”گھر میں ہی ہوں۔ اب جاؤ تو تمہاری مہربانی سے ختم ہوگئی۔“

”فکر مت کرو۔ ساری زندگی ڈرائیور ہی بنا کر رکھوں گی۔“ ملاحد نے اسے چھیڑا تو وہ مسکراتے لہجے

میں برجستہ بولا۔

”عمو! اچھے شوہر ہی اپنی بیوی کے شوہر ہوا کرتے ہیں، آپ کے لیے یہ بھی منظور ہے۔“ ملاحد نے ہاتھوں کی لوٹک سرخ پڑ گئی اس کی خوب سی خاموشی پر وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ اگلے دو چار روز میں دونوں بھائیوں نے سارے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ مبین آفندی کیپوٹر آپریٹر کے سر پر کھڑے اکاؤنٹس چیک کر رہے تھے۔ آغا جان کے وکیل نے موحد کے نام کی ٹی یاد آف انٹارنیٹس کیسٹل کروادی تھی۔

”اتنی بڑی بڑی رقم۔۔۔۔۔“ مبین آفندی اکاؤنٹس کی پوزیشن دیکھ کر ششدر تھے۔

”یہ سب وقتاً فوقتاً موحد صاحب نکلاتے رہے ہیں سرا“ اکاؤنٹس مینیجر نے دبے لفظوں میں کہا۔ مگر

ان کی نظر مانیٹر اسکرین پر تھی۔

”یہ سوا کروڑ تو زمین کی خریداری کے لیے نکال دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ جو پچھلے چند ماہ کے دوران بڑی رقم نکلائی گئی ہیں ان کا مطلب یہ نہیں آ رہا سہیل۔۔۔۔۔ ہر ماہ تو مال کی پے منٹ نہیں کی جاتی وصولی اور ادائیگی کا سرکل تو پورا سال چلتا رہتا ہے۔ وہ تنگ سے کہہ رہے تھے۔

”جی ہاں۔۔۔ اور پچھلے ماہ ترقی والوں نے مال کی جو ڈاؤن پے منٹ کی تھی، اس کا دس لاکھ بھی نظر نہیں آ رہا“ ان کا حلق تک گڑا وہور ہا تھا۔ ان سب کی پوری زندگی کی محنت کی کمائی آغا جان کے اندھے اعتماد کی وجہ سے ڈوب گئی تھی۔

”موحد کا کوئی سینڈ اکاؤنٹ ہو گا ضرور۔ اتنا پیسہ وہ خرچ کہاں کرے گا۔“ وہ یقین سے بولے، مبین صاحب نے سوالیہ نظروں سے مینیجر کی طرف دیکھا تو وہ گھڑا کر نظر میں جھکا گیا۔

”تم جتنا ڈوبیم! اس بارے میں کوئی انفارمیشن؟“

”ڈونٹ نوسر! ہاں یہ بات بہت عجیب ہے، موحد صاحب کی کہ بینک سے کیش نکالوانے خود جاتے ہیں اور اپنا اے ٹی ایم کارڈ یا دستخط شدہ چیک وغیرہ آج تک انہوں نے کسی درکر کے حوالے نہیں کیا۔ جبکہ اکاؤنٹس کے شعبے میں باس کا کارڈ بالاحالہ استعمال کرنا پڑ رہا ہے اکثر۔ جیسے آپ لوگوں کا۔“ وہ سوچ کر بولا تو سہیل آفندی نے چونک کر بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی گہری سوچ میں گم تھے۔ ابھی وہ مکمل معاملات تو نہیں سمجھتے تھے لیکن جو نظر آ رہا تھا۔ وہ پریشان کن تھا۔

”یہ سب باتیں آغا جان کو فوری بتائی پڑیں گی تاکہ وہ موحد سے سارا حساب طلب کریں۔“

”موحد صاحب آفس میں ہیں سرا آپ چاہیں تو ابھی ان سے پوچھ لیں۔“ مینیجر نے مؤدبانہ کہا تو وہ پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گئے۔

”وہ آفس آ رہا ہے؟“ ان کے انداز میں اس قدر بے یقینی تھی کہ مینیجر گڑبڑا گیا۔

”جی سرا! انہوں نے کوئی چھٹی نہیں کی ابھی تک۔“

”الو کا بچھا۔۔۔۔۔ اس کو تو میں پوچھتا ہوں ابھی جا کر۔“ اول جملہ زیر لب بول کر وہ اونچی آواز میں کہتے دروازے کی طرف بڑھے۔ پچھلے تین چار روز میں وہ ”تحقیقات“ میں ایسے مگن تھے کہ سوچا ہی نہیں کہ موحد کی آفس میں موجودگی یا غیر موجودگی کا پتا کرتے۔ سہیل آفندی مینیجر اور کیپوٹر آپریٹر کے ساتھ مل کر باقی کا ڈیٹا چیک کرنے لگے۔

مبین آفندی پیش میں بھرے موحد کے آفس میں پہنچے تو یہ پہلی بار تھا کہ وہ دستک دیے بنا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے۔ موحد نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر سے چونک کر نظر ہٹائی اور انہیں دیکھا۔ جن کے چہرے پر غم و غصہ کی کیفیت صاف ظاہر تھی۔ میز کے اس پار کھڑے وہ پہلیوں پر ہاتھ جمائے کڑے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ دوبارہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اونچے گھر سرد لہجے میں بولا۔

”کسی کے روم میں ناک کر کے جانا آپ کی دینی اور گھریلو تربیت کو ظاہر کرتا ہے بالی داؤے۔“ مبین آفندی بری طرح سچے۔ انہوں نے جھک کر اس کی میز پر دونوں ہاتھ جمائے اور کئی بھرے انداز میں بولے۔

”اور تم۔۔۔ تم نے تو بہت اچھی طرح اپنی تربیت شوکی ہے۔“

”کوئی کام تھا آپ کو۔۔۔۔۔ میں کچھ بڑی ہوں اس وقت۔“ وہ رکھائی سے دھڑوک بولا تو وہ تھلا اٹھے۔

”تم شاید بھول گئے ہو کہ آغا جان انہیں فارغ کر چکے ہیں۔ پوچھ سکتا ہوں کہ تم کس سلسلے میں بڑی ہو؟“ کئی سے پوچھا تو لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اس نے آرام سے کرسی سے ٹیک لگائی اور انکشت شہادت سے سامنے دیوار پر لگی وقار آفندی اور فاران آفندی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

”اپنے باپ کے آفس میں بیٹھا ہوں کوئی مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا حق نہیں رکھتا۔“

”کہاں خرچ کیا ہے تم نے اکاؤنٹس کا پیسہ؟“ وہ اس سے جیت نہیں سکتے تھے سوسیدھے سبھاؤ پوچھا تو وہ ہنسنے لگا اچکا کر جیسے حیران ہوا۔

”آپ اس بارے میں مجھ سے کچھ انویسٹی گیشن نہیں کر سکتے کیونکہ تب باور آف انٹارنی میرے پاس تھی۔ میں اپنے فیصلوں میں آزاد تھا تا یا جان۔“ وہ پرسکون انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا لیوں پر پھٹکی ہنسی مسکراہٹ مبین آفندی کا دل جلا رہی تھی۔ وہ میز چھوڑ کر گہری سانس بھرتے سیدھے ہوئے اور اسے دھمکیا۔

”اب تو آغا جان تم سے اچھی طرح پوچھیں گے کہ تم نے ان کے بزنس اکاؤنٹس کہاں جھاڑے ہیں۔“

”اوکے۔۔۔ اور کچھ؟“ وہ یوں کرسی جھلا رہا تھا۔ جیسے وہ دنیا کا مطمئن ترین انسان ہو اور بات کرنے کا انداز ایسا کہ مبین صاحب کو ہنک محسوس ہوئی۔

”اس بھول میں مت رہنا موحد آفندی! کہ آغا جان تمہاری اس دھوکا دہی کے بعد بھی تمہارے اکاؤنٹ پوتا ہونے کے لاڈ اٹھائیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے، تمہیں جیل کی ہوا کھانی پڑے۔“ وہ دانت کچکا کر بولے۔

”ہوں۔۔۔۔۔ انکارم کرنے کا شکریہ۔ دروازہ آہستہ بند کر کے جائے گا“ وہ نرمی سے بولا تو دل ہی دل میں اسے ناقابل اشاعت گالیوں سے نوازتے اور کھا جانے والی نظروں دیکھتے آفس سے نکلے تو دروازہ زور سے مارا۔

”آ آ آ۔۔۔ دونوں باپ بیٹی ماشاء اللہ ایک جیسے ہیں۔“ مودھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے کی فکری کے برعکس اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل چکی تھیں۔ آغا جان کی ٹیبل تک ساری تفصیل پہنچی تو وہ دنگ رہ گئے۔

”اغتاپیہ وہ کیسے نکلا سکتا ہے۔۔۔ اور سب کچھ اسی کا تو تھا اسے ایسی بے ایمانی کرنے کی کیا ضرورت تھی مبین!“

”کیونکہ وہ جانتا ہے آغا جان! ہمارے ذاتی اکاؤنٹس الگ سہی لیکن برنس اور برنس کے اکاؤنٹس پر ہمارا بھی حق ہے تب ہی تو پاور آف انٹاری ہاتھ آتے ہی اس نے آہستہ آہستہ اکاؤنٹس خالی کرنے شروع کر دیئے بار بار تو موقع نہ ملتا اسے ایسا ہاتھ مارنے کا۔“ سہیل تلخی سے بولے۔

”اگر ایسا ہی ہے تو میں اسے معاف نہیں کروں گا سہیل! اس نے پیار ہی دیکھا ہے ابھی میرا۔“ ان کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔

”آپ اسے بلا لیں ابھی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“ مبین آفندی تو ویسے بھی مودھ سے جلے بیٹھے تھے۔

”ابھی نہیں مبین!“ وہ تھکے ہوئے انداز میں انہیں ٹوک گئے۔ ”ابھی اس دل کو ذرا سنبھل لینے دو۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ مودھ ایسی حرکتیں کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔“

”وہ ہمارا کبھی بننا ہی نہیں آغا جان! مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کسی منصوبے کے تحت آیا ہے یہاں۔ اس نے ماضی کی تلخیوں کو نکال دیا، نہیں اپنے اندر سے۔ اسی لیے ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔“ سہیل تندہ لہجے میں بولے تو آغا جان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک کر جانے کا اشارہ کیا۔

”بس اسی نرمی کا فائدہ تو وہ اٹھا رہا ہے تمام عمر آغا جان کے دل سے پوتے کی خواہش نگنی تو اب اسے سزا دیں بھی تو کیسے۔“ ان کے کمرے سے نکل کر سہیل آفندی برہمی سے بڑے بھائی سے مخاطب تھے۔ وہ آغا جان کی نرمی دیکھ کر غم و غصے کے حصار میں تھے۔

”لیکن ہم اسے بھی معاف نہیں کریں گے۔“ مبین صاحب کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

”تم اپنا سامان اٹھاؤ اور اپنے کمرے میں واپس آؤ مہر!“ تائی جان نے مہر ماہ کو رات کے کھانے کے بعد بطور خاص شرہ چچی کے سامنے غم دیا، مودھ خدا جانے کہاں تھا شاید وہ شعوری طور پر آغا جان کے سامنے آنے سے کتر رہا تھا۔ یا شاید اسے کسی مٹی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ آغا جان کے اٹھتے ہی مہر ماہ کو آڈر ہوا تو اس کے پتیلیں اکٹھی کرتے ہوئے ہاتھ ٹھکے۔ شرہ نے چونک کر صدیقہ بیگم کی شکل دیکھی۔ جہاں تھے ہوئے تاثرات تھے۔

”وہ کیوں؟“ وہ لمحہ بھر چوکنے کے بعد اب دوبارہ کھانے کے برتن اکٹھے کرتے ہوئے رکھائی سے بولی۔

”جب ایک نکاح کو تم مانتی ہی نہیں تو کیوں اور کس رشتے سے تم وہاں پر رہ رہی ہو؟“ وہ تلخی سے گویا ہوئیں۔ مہر ماہ نے ملاحظہ کو برتن اٹھانے کا اشارہ کیا اور خود کہنیاں میز کی سطح پر ٹکا کر تائی جان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بہت دیر سے آپ کو یاد آیا۔ خیر اس نکاح کو میں اس لیے نہیں مانتی ہوں امی! کیونکہ کس بھی طرح سہی مگر میں میرے نکاح میں ہوں۔ اور میں مودھ کے ساتھ نہیں بلکہ میری ماں کے پاس رہ رہی ہوں تو میرا نہیں خیال کہ کسی کو اس پر اعتراض ہونا چاہیے۔“ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پھر دفعتاً تائی جان حواس میں آ کر غرا گئیں۔

”تو اس مت کر مہر! یہ آغا جان کا حکم ہے۔ سمجھیں تم خبردار کوئی اول فول کی ہو تو۔“

”امی! یہ نکاح خواہ کسی بھی حالت میں ہوا ہو مگر جب تک یہ قائم ہے۔ اس کی پاسداری مجھ پر فرض ہے۔ زرنکار آئی کی ذمہ داری ہے مجھ پر جب تک وہ یہاں اس گھر میں ہیں، اگر میں انہیں اپنے ساتھ لاسکتی ہوں تو کیسے میں آج ہی آجاتی ہوں۔“

تائی جان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ان کی لاڈلی اور باغی ترین اولاد کیا فلسفہ بگھا رہی تھی۔ شرہ کی آنکھیں غم ہو گئیں بعض لوگوں کے ساتھ زمانہ بہت برا سلوک کرتا ہے مگر وہ اپنی اچھی روش نہیں چھوڑتے۔

”مہر۔۔۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی اس قدر فضول بات کرنے کی۔۔۔ اب تم اس سنگ انسانیت کے ساتھ زندگی گزارو گی وہ۔۔۔ جس نے تمہاری زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

”آباد بھی کسی نے نہیں کی امی! اگر اس نے دھوکے سے زبردستی نکاح کیا تھا تو آپ لوگوں نے نکاح پر نکاح کر کے اس سے بھی بڑا گناہ کر دیا۔ میرے بارے میں تو کبھی کسی نے نہیں سوچا۔“ وہ تلخی سے بولی تو ان کا دماغ گھوم گیا۔

”تو تم۔۔۔ تم اب اس کے ساتھ رخصت ہونے کا سوچ رہی ہو؟ کاٹ کر دریا میں پھینک دیں گے تمہیں مہر! مگر یہ بات بھی سوچنا بھی مت۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے، بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



تنزیلہ ریاض
قیمت - 350/- روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جمیل
قیمت - 400/- روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میونہ خورشید علی
قیمت - 350/- روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400/- روپے

فون نمبر
32735021

منگواہے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

”میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا لیکن میں زرنگار آئی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ جب تک وہ انہیں یہاں سے لے نہیں جاتا۔ اور آپ بے فکر رہیں۔ طلاق دے دے گا وہ مجھے اگر اس کو اس کے باپ کی جائیداد دے دی جائے۔“ وہ کل سے ان کی بات برداشت کرتے ہوئے بولی۔ تائی جان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ادھر ہی سینہ پیٹ ڈالتیں اپنا۔

”جائیداد.....؟ کون سا باپ؟ کیسی جائیداد؟ اللہ جانے کس کا خون ہے اس کی رگوں میں۔ ایسے ہی کوئی منہ اٹھا کر.....“

”باااا۔۔۔ ای بس۔“ مہر خود پر قابو کھو کر زور سے بولی اور پاس بڑے گلاسوں کو ہاتھ مارا تو چاروں گلاس اڑتے ہوئے زمین پر گرتے ہی کرچیوں میں تبدیل ہو گئے۔ تائی جان نے ششدر نگاہوں سے پہلے گلاسوں کی کرچیوں اور پھر مہر ماہ کے غصے سے بچتے چہرے کو دیکھا۔

”وہ وقار چچا کا بیٹا ہے اور ان کا خون کوئی مانے یا نہ مانے لیکن میں مانتی ہوں اس حقیقت کو۔“

”ہاں۔۔۔ تم تو وہاں تھیں نا ڈیلیوری کے وقت۔“ ساڑھ چچی نے مسخراڑایا۔

”آپ بھی نہیں تھیں چچی جان!“ اس نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ کر کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پاک باز عورتوں پر تہمت لگانا کبیرہ گناہ ہے۔ اور اس کی سخت وعید ہے یہ بات یاد رکھیے آپ لوگ۔“

”تمہاری یہ ساری جھوٹاں میں آغا جان کو بتاتی ہوں جا کر وہی تمہیں سیدھا کر بس گئے، تائی جان بے بس ہو کر اتنا ہی کہہ پائیں۔ مہر ماہ ان کی بات نظر انداز کرنی اٹھ کر چلی گئی۔ ملاحہ فرش صاف کر کے سیدھی اس کے کمرے میں آئی تو بے چینی سے پوچھا

”آئی اکیلا واقعی تم واپس نہیں آؤ گی؟“

وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بستر پر بیٹھی تھی۔ آرزو ہی ہو کر اس نے ٹھوڑی گھٹنے پر رکھ لی اور آنکھیں موند کر تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ ”پتا نہیں ملاحہ! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ان حالات میں میں نہیں کھوئی۔ مجھے نہیں پتا کہ میں اپنا آپ کہاں سے واپس لاؤں۔“

”ایسی باتیں مت کرو آئی! موحہ بھائی بہت اچھے ہیں۔ تم نمبر سے طلاق لے لو اور دوبارہ موحہ بھائی سے شادی کر لو۔“ ملاحہ نے جذباتی ہو کر کہا تو مہر ماہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

”موحہ میں کون سے نمبر سے جڑے ہیں جو میں ایک کنویں سے نکل کر دوسری کھائی میں چھلانگ لگا دوں۔“

”ایسے تو نہ کہو آئی! موحہ بھائی نے تمہارے ساتھ آج تک کچھ برائیاں کیا بلکہ ہمارے لیے تو وہ اچھا ہی سوچتے ہیں۔“

”یہ تو تمہی اور ابو سے پوچھو ذرا کہ اب وہ موحہ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے اس نے۔ اب تو آغا جان کا پوتے والا شوق بھی پورا ہو گیا ہے بہت غصے میں ہیں وہ.....“ مہر ماہ نے نیچے انداز میں کہا۔ ملاحہ کی بات اور موحہ کی اس طرح حمایت کرنا اسے پسند نہیں آیا تھا۔

”یہ اچھی بات ہے۔ اپنی مرضی سے سب کچھ دیا تو ٹھیک اور اگر کچھ فیصلے انہوں نے اپنی مرضی سے کر لیے تو اس پر سب چراغ باہور ہے ہیں۔ ویسے بھی تو آغا جان موحہ بھائی کو ساری جائیداد کا وارث بنانے پر تلے ہوئے تھے تو اس میں ایسی کیا عجیب بات ہوئی اگر کچھ انہوں نے اپنی مرضی سے خرچ کر لیا تو.....“

”مجھے نہیں پتا جا کر یہ سب باتیں اپنے لاڈلے بھائی سے پوچھو میں کون سا اس کی لیگل ایڈوائزر ہوں

اور وہ کون سا ہر کام میرے مشورے سے کرتا ہے۔“ مہر ماہ نے اکتا کر کہا۔

”لیکن وہ اچھے ہیں۔ آپ آغا جان پھر کی ایسے ویسے کو اٹھا کر لے آئیں گے تمہارے لیے۔“ ملاحہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

”ہاں اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری لاڈلے بھائی کو ہی جھاڑ پونچھ کر ٹھیک ٹھاک کر لوں۔“ مہر ماہ نے نقل سے کہا تو ملاحہ جھینپ گئی۔

”امی نے کبیر کے بارے میں کیا کہا ہے؟“ مہر ماہ نے بات بدل دی تو وہ اداس ہونے لگی

”مجھے نہیں پتا تھا کہ موحہ بھائی کبیر کا پروپوزل لا رہے ہیں مگر یہ ضرور پتا تھا کہ جب بھی میری پسند کا رشتہ آیا اور امی کو پتا چلا کہ یہ پروپوزل کبیر کا ہے تو وہ بھی نہیں مانتیں گی۔“

”اب یہ تو موحہ کا دوسرا ہے جو یہ پروپوزل لایا تھا یا پھر کبیر سے کہو کہ وہ آکر آغا جان سے بات کرے یا ابو سے“ مہر ماہ نے تنبیہ کی سے کہا تو ملاحہ نے جھرجھری لی۔

”تمہارا کیا خیال ہے آئی! یہ لوگ اسے زندہ یہاں سے واپس جانے دیں گے۔“ ملاحہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ تو وہ اکتا کر بولی۔

”سالوں بیت گئے مگر آفندی ہاؤس کے رہنے والوں کے دلوں پر لگی مہر میں نہ اتریں اتنے سخت دل ہیں ان لوگوں کے پتا نہیں کس طرح نرم ہوں گے۔“

دونوں کے درمیان خاموشی کی دیوار تن گئی تھی۔ * * *

ترنین اور طلال کے تعلقات پہلے سے بہتر چل رہے تھے اسی لیے گھر میں امن اور سکون کا دور دورہ تھا۔ اب ترنین گھر کے کاموں میں بھی مارے باندھے حصہ لے ہی لیا کرتی تھی جبکہ طلال کے ساتھ طنزیہ گفتگو کرنا بھی کم کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے گھر کا ماحول پرسکون تھا۔ اب بھی ساڑھ واٹس اپ پروڈیو کال کے ذریعے اسے گھر کی تمام رپورٹ دے رہی تھیں۔

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا اس مہر ماہ کی قسمت کتنی بلند ہے۔ پہلے طلال کو اپنی اداؤں میں پھنسائے رکھا، وہ تو شکر ہے درمیان میں نمبر آ گیا اور مہر ماہ کو آڑا کر لے گیا۔“

ترنین لیٹ کر آرام سے کہہ رہی تھی، طلال ابھی تک گھر نہیں آیا تھا سو وہ آزادی سے بات چیت کر رہی تھی۔

”خاک اچھی قسمت سے اس کی۔ عین شادی کے دنوں میں وہ غمیٹ آدمی اسے اغوا کر کے لے گیا اور نکاح بھی پڑھوایا مہر ماہ کے ساتھ۔ طلال تو اس کی زندگی سے لکھا ہی تھا جو زمانے بھر میں تھوٹو ہوئی وہ الگ۔

وہ تو آغا جان نے اس بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے مہر ماہ کا نکاح موحہ سے کر دیا اور نہ طلال تو شاید ساری عمر مہر ماہ کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ بہتری کے لیے ہی ہوتا ہے اور موحہ کون سا گیا گزرا ہے اس مہر ماہ کے تو ویسے ہی مزاج نہیں ملتے۔ وہ تو اس نکاح کو مانتی ہی نہیں خوب تماشا لگایا ہوا ہے دونوں بہنوں نے گھر میں۔“

”وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں نے طلال کو یہی بتایا ہے کہ مہر ماہ نے موحہ کی خاطر اسے ٹھکرایا ہے ورنہ تو وہ ابھی تک راجھا بنا پھر رہتا، مہر و کے پیچھے۔“ ترنین کڑوے لہجے میں بولی تو دروازے کی چوٹ پر کب سے ساکت کھڑا طلال زرد چہرہ لیے اٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ ساڑھ چچی اب بیٹی کو گھر کے موجودہ حالات بتا رہی تھیں۔ جن میں کبیر کی بدلتی حالت اور ملاحہ کے لیے آنے والا اس کا پروپوزل تھا۔ وہ حیران

ہو کر سن رہی تھی۔

☆☆☆

”تم ٹیس پر آ سکتی ہو مہر!“ مہر ماہ نے اس کی کال انٹینڈ کی تو وہ مدھم لہجے میں بولا۔ مہر ماہ کو جھٹکا لگا۔

”تم اس وقت چھت پر ہو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ تم سے بات کرنی ہے۔“

”شٹ اپ۔ آغا جان کو پتا چلا تو گولی مار دیں گے ہم دونوں کو۔ تمہاری تو خیر ہی ہے لیکن مجھے کم از کم بے گناہ مرنے کا کوئی شوق نہیں، اس نے کبل کو مزید اپنے گرد لپیٹا۔

”گولی سے تو نہیں لیکن سردی سے ٹھکر کر ضرور گزر جاؤں گا میں۔“ اب کی بار وہ گویا کیپا کر بولا۔
”تمہیں ضرورت کیا۔۔۔ کئی یوں جان پر کھیلنے کی۔ نفرت ہے مجھے تم سے اور تم مجھے گھر کی چھت پر آدھی رات کو ملنے کے لیے بلارہے ہو۔“ ناراضی سے کہتے ہوئے وہ کبل ہٹا کر کبھی۔ پاؤں چپلوں میں چھسائے اور شال لپیٹ لی۔

”تم ہو کس غلط فہمی میں موحدا! دھوکے سے ہماری ساری پراپرٹی ہڑپ کر گئے ہو اور پھر بھی سوچ رہے ہو کہ میں ابھی بھی تمہاری بات سنوں گی؟“

موبائل کان سے لگائے ٹکڑے سے کہتی وہ ایک نظر سوئی ہوئی زرنگار پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل آئی تو آدھی میز جیوں تک آتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ گرم بستر میں سے نکل کر محض ایک شال لپیٹ کر چلے آنا ایک بہت بڑی بے وقوفی تھی وہ بھی موحدا جیسے دھوکے باز بندے کی خاطر پھر سوچا۔

لیکن اس نے ملاحظہ کے لیے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تو ذرا سی بات سن لینے میں کیا حرج ہے کھاتو نہیں جائے گا۔ وہ ٹیس پر کھڑا جھٹکے سے نیچے اندھیرے لان میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ مہر ماہ موبائل آف کر کے اس کی طرف بڑھی۔ چند دن پہلے بارش کھل کر بری تو اب مطلع صاف تھا اور چاند کی سردراتوں کی اداس سی روشنی ہر بوکھری ہوئی تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ پر وہ اس کی طرف پلٹا۔

”سوری..... اتنی سردی میں تمہیں زحمت دی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا تو مہر ماہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اب یہ زحمت کر رہی لی ہے تو برائے مہربانی اپنے ڈرا سے بند کر دو اور وہ بات کر د جس کے لیے مجھے اتنی

سردی میں ٹیس پر انوائٹ کیا ہے۔“ جھٹکے سے ٹیک لگائے کھڑا وہ چند لمحے خاموش رہا۔

”تائی جان نے تم سے گھر واپس آنے کو کہا تھا؟“ اس نے پوچھا تو مہر ماہ کو کوئی حیرت نہ ہوئی یقیناً اسے شمرہ کی زبانی ساری بات پتا چل چکی تھی۔

”ہاں..... اور میں نے انہیں کیا جواب دیا۔ وہ بھی یقیناً تمہیں پتا چل گیا ہوگا؟“ مہر ماہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے نمبر کو مظلوم سمجھ لیا ہے؟“ موحدا نے منطاط لفظوں میں پوچھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، کیا وہ شخص قابل معافی ہے؟“ مہر ماہ نے مٹی سے پوچھا تو وہ لمحہ بھر کو چپ رہ گیا۔

”مجھے اس ساری داستان میں صرف زرنگار اتنی کا کردار قابل ہمدردی لگا ہے صرف وہی ہیں جنہوں نے جبر کو مبر سے برداشت کیا۔ میر نے تو اپنا بدلہ لے لیا۔ وہ بھی ایک بے قصور ہے تو اب وہ اور اس گھر کے مکین ایک ہی صف میں آگئے ہیں۔ وہ کہاں سے مظلوم رہ گیا۔“ مہر ماہ نے مٹی سے کہا تو کافی دیر کے بعد وہ

مدھم لہجے میں بولا۔

”اور موحدا.....؟“ مہر ماہ نے حیرت نظروں سے اسے دیکھا۔

”میرے لیے تو موحدا اور نمبر ایک ہی تصویر کے دو رخ بن گئے۔ اس نے اپنے حالات کا بدلہ مجھ سے لیا اور تم نے دوست بن کر دھوکا دیا تو بتاؤ۔ کیا موحدا اور نمبر دونوں کے پلڑے برابر نہیں ہیں۔؟“ وہ جھٹکے سے ٹیک لگائے کھڑا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ شال کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹے وہ اسے شمرہ سے کیپانی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”تم نے کوئی سویر نہیں پہنا؟“

”تم یہ مت سمجھنا کہ میں محض تمہارے ایک بلاوے پر دوڑی چلی آئی ہوں۔ مجھے بھی تم سے ایک بات کرنی ہے۔“ اس کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے مہر ماہ نے جتانے والے انداز میں کہا۔ لیکن موحدا کا ذہن ابھی تک اسی بات میں انکا ہوا تھا۔

”سوری لیکن مجھے پتا ہے کہ اب کسی کو بھی میرا تم سے بات کرنا گوارا نہیں ہوگا اس لیے سوچا کہ یہیں پر بات کر لوں، مجھے نہیں پتا تھا کہ تم سویر پہنے بغیر آ جاؤ گی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ خود وہ کبھی سویر کے اوپر لیدر جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔

”تم نے آغا جان کا سارا رویہ کہاں غائب کیا ہے؟“ مہر ماہ نے اب کی بار وہ سوال پوچھا جس کی وجہ سے وہ اتنی سردی میں موحدا کے بلانے پر چلی آئی تھی۔

”یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے مہر ماہ۔“ موحدا نے اسے ٹوکا۔

”یہ ہم سب کا معاملہ ہے، میں گھر والوں سے الگ نہیں ہوں۔“ مہر ماہ نے جتایا۔

”میں نے وہ روپیہ اپنی مرضی سے استعمال کیا ہے۔ تب میرے پاس باور آف اتارنی تھی مجھ پر اسے خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس لیے اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کر سکتا۔“ وہ رکھائی سے بولا تو مہر ماہ نے آنکھیں سیڑ کر اسے دیکھا اور طنز سے بولی۔

”بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے تم پر موحدا! شمرہ چچی ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ موحدا کے سینے میں نمبر کا دل نہیں ہے تو تم نے یہ سرد مہری کہاں سے سیکھی؟ تم تو شمرہ چچی کے موحدا ہونا؟“ موحدا ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ مہر ماہ نے اپنے دونوں بازوؤں کو اپنے گرد لپیٹ کر سردی کی شدت کو جیسے کم کرنے کی کوشش کی۔ موحدا نے

بتا کچھ کہے اپنی لیدر جیکٹ اتار کر اس کے شانوں پر ڈال دی۔ مہر ماہ اس کی حرکت پر دنگ رہ گئی۔ اس نے وہ جیکٹ اتارنے کی کوشش کی۔

”مجھ پر یہ مہربانیاں مت کر موحدا! میں تو اب خاردار رستوں پر چلنے کی عادی ہو گئی ہوں“ موحدا نے اس کے ہاتھ پیچھے کر کے جیکٹ تھیک سے اس کے شانوں پر جمادی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ ساری رقم میں نے نمبر آفندی کے اکاؤنٹ میں جمع کروادی ہے۔“ مہر ماہ نے بیانی سے اپنی جگہ جم سی گئی۔

”اب بتاؤ کیا کرنا چاہیے مجھے؟“

”کچھ نہیں۔ اب تو جو کرنا ہے وہ میں ہی کروں گی۔ نمبر کو دولت چاہیے تھی۔ جائیداد میں حصہ چاہیے تھا وہ تم نے اسے دے دیا۔ بہت شکریہ اب وہ یقیناً مجھے طلاق دے دے گا۔“ وہ لفظوں کو چبا کر کڑوے لہجے میں بولی تو موحدا نے بے اختیار اسے شانوں سے تھام لیا۔

”اور میں...؟“ مہر ماہ نے بڑے حوصلے سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور قطعی انداز میں بولی۔

”تم موحد آفندی!.... تم تو اس پوری داستان میں کہیں تھے ہی نہیں۔ تمہارا کیا ذکر۔“
”سنو.....!“

وہ ذرا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔
ناراض ہوئے؟

مگر ہم وہ ہیں
جن کو ٹوٹنا بھی نہیں آتا

کسی نے آج تک ہم سے محبت جو نہیں کی ہے
محبت کس طرح ہوتی

ہمارے شہر کے اطراف میں تو سخت پہرہ تھا
خزاؤں کا

اور اس کی فصیلیں زرد بیلوں سے لدی تھیں..... اور ان میں نہ کوئی خوشبو
نہ کوئی پھول تم جیسا۔

کہ مہک اٹھتے ہمارے دل و جاں.....
جس کی قربت سے

ہم اس شہر پریشاں کی دیراں گلیوں میں۔۔۔ کسی سوکھے ہوئے زرد پتے کی طرح تھے۔
کہ جب ظالم ہوا

ہم اپنے قدم رکھتی تھی
تو اس کے پاؤں کے نیچے ہمارا دم نکل جاتا۔

مگر بیت جہنم کا موسم
سنا ہے کل چکا اب تو۔

مگر جو ہمارا ہو نا بھی
سو وہ تو ہو چکی ہم کو

سنو!

ہارے ہوئے لوگوں سے تو روٹھا نہیں کرتے۔۔۔
وہ دم سا دھسے اس دم اور ٹھہرے ہوئے لہجے کو سنتی رہی۔ سانس سا کن تھی اور وہ خود دم بخود۔

”یہ کیا نا کھیل کھانا شروع کر دیا ہے تم نے میرے ساتھ؟“ ذہن (اور دل بھی؟) اس کے لفظوں میں
الٹھا لٹھا جارہا تھا مگر وہ لہجے میں ناگواری بھر کر بولی۔

”کھیل کھیلنا تھا، مانتا ہوں..... مگر اعتراف کر رہا ہوں کہ ہار گیا ہوں تم سے۔“ وہ اس قدر متین سے بولا کہ
مہرماہ کو مزید کچھ سننا دو بھر ہو گیا، اس کے ہاتھوں کو شانوں پر سے جھٹکتے ہوئے وہ تیزی سے بیڑھیوں کی طرف پلٹ

گئی، موحد وہیں کھڑا اسے خود سے دور جاتے دیکھتا رہا، اور وہ دل میں اس دوری کی کک ککچوس کر رہا تھا۔
☆☆☆

یہ اگلے روز کی بات تھی۔ مہرماہ پر رایت کی بے خوابی کی وجہ سے سخت سستی طاری تھی موحد کی باتوں نے
اسے ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا یہی وجہ تھی کہ ذہن سے سب کچھ جھٹک کر سونے میں لگتی ہی رات جاتے

ہوئے نکل گئی تھی۔ کسی اجنبی نمبر کی کال آئی تو تو لیے سے چہرہ پوچھتی مہرماہ نے پہلے تو نظر انداز ہی کیا مگر :۔۔۔
مسلک ٹھنی جتنی رہی تو اس نے کال اینڈ کر ہی لی۔
”ہیلو۔۔۔“

”مہرماہ۔۔۔۔۔“ دوسری طرف سے مردانہ لہجہ ابھرنا تو وہ گڑ بڑائی۔
”جی ہاں۔۔۔۔۔“ لیکن آپ کون ہیں؟“

”میں طلّال بول رہا ہوں مہر..... مہر کا طلّال“ وہ جذباتی ہو کر بولا تو مہرماہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے سر
پر پہاڑ توڑ دیا ہو۔

”میں جان گیا ہوں کہ تم اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً مجھ سے جدا ہوئی تھیں مہر! اب بھی دیر نہیں ہوئی
ہے مہرماہ! میں تمہارا تھا اور تمہارا ہی ہوں، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں مہر!“ مہرماہ کا ذہن کن۔ کیفیت میں تھا۔

جبکہ دوسری طرف سے مسلسل وہ اسے پکار رہا تھا۔
☆☆☆

سہیل، آفندی نے چند پیرز آغا جان کے آگے رکھے۔ تو وہ چوگے۔
”یہ کیا ہے؟“ عینک ٹھیک سے جما کر انہوں نے کاغذات اٹھا کر نظروں کے سامنے کیا۔

”یہ شہوت ہے اس دعا بازی کا جو آپ کے لاڈلے پوتے نے آپ کے ساتھ کی ہے آغا جان! اس نے
سارا روپیہ آپ کے اکاؤنٹ سے نکلوا کر وقار کے بیٹے نمبر کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔“

وہ بھٹکے ہوئے لہجے میں پوٹے تو آغا جان کو دیکھ رہے تھے..... ورد کی ایک شدید لہران کے بائیں پہلو سے اٹھی اور
سینے کو ایسا جکڑا کہ ان سے سانس لینا دو بھر ہو گیا۔ سہیل آفندی جو یہ قیامت خیز انکشاف کرتے ہوئے بھول گئے تھے

کہ آغا جان دل کے مریض ہیں اور شاید اب کی بار جو دل کا دورہ آئیں بڑتا، وہ ان کی زندگی کا آخری دورہ ہوتا۔ آکسیجن
کی کمی کی وجہ سے ان کا سیاہ پڑتا چہرہ دیکھ کر بے اختیار بھاگ کر اسٹڈی کا دروازہ کھول کر سب کو آوازیں دینے لگے۔

جگہ دل لگانے کی دینا نہیں ہے!!!
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

☆☆☆
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہوئے ہیں

خوبصورت مردوں
خوبصورت عورتوں
میں
میں
میں
میں

☆ تنلیاں، پھول اور خوشبو راحت جمیں قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیباں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

منوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”میں شرط لگا سکتا ہوں کہ آپ یہ جاب نہیں کر سکتیں۔“ کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بلند آواز میں کہتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

”کیوں؟“ جوئے کا بکبل بند کرتے ہوئے تیزی سے پوچھا گیا۔

”کیوں کہ آپ کا تین برسوں اپنی ٹیوڈو کھ کر انہوں نے آپ کو جاب دینی ہی نہیں اور اگر ان کی قسمت پھولی ان کے ستارے گردش میں ہوئے ان کے سر پر نعمت کے بادل منڈلا رہے ہوئے اور انہوں نے آپ کو اپنی بد قسمتی کی بنا پر یہ نوکری دے دی تو آپ تین دن سے زیادہ یہ جاب کر ہی نہیں سکیں گی۔“ ڈرامائی انداز میں جواب دیا گیا۔

ساتھ ساتھ وہ اپنی بہن کی پھرتی سے تیاری کا بھی جائزہ لے رہا تھا اور جس طرح پورے کمرے کو میدان جنگ بنائے ہوئے ہوئے تھا وہ تیار ہو رہی تھی۔ اسے اپنی شرط جیتنے کے آثار بالکل واضح نظر آرہے تھے۔

”کیوں؟“ اب کی بار بھی مختصر جواب موصول ہوا، لیکن اسے بتایا گیا تھا۔

”کیوں کیا بھی! آپ کا غیر مستقل مزاج رویہ وہ لوگ بے حد سنجیدہ اور ذہیلان والے لوگ مانتے ہیں اور آپ ٹھہرس بارہ صفت شخصیت۔ آپ نے تو بیڑ بجا رہی ہے ان کے نظم و ضبط کی، میری باتیں، چھوڑیں یہ نوکری دوکری کا جھجھٹ، کوئی اچھی سی کارٹون مووی دیکھتے ہیں۔ آپ کے بغیر میں اکیلا ماماکی ڈانٹ کھاؤں گا، دونوں بہن بھائی مل کر کھاتے ہیں تو درودٹ جاتا ہے۔“ اصل مدعا بیان کیا گیا تھا۔

”اچھا اب بک بک بند کرو اور مجھے چھوڑ کر آؤ۔“

آخری بار اپنی تیاری کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ یہ پاس ہی تو ہے اب کیا میں روزانہ آپ کو لانے؟“ تارے کی ڈیوٹی بھی سرانجام دوں گا۔ نو دے۔“ حیرت اور پریشانی سی لٹی میں سر ملاتے ہوئے جھٹ جواب دیا گیا۔

”بد تمیز! پتا ہے مجھے پاس ہی ہے، لیکن آج پہلا دن ہے۔“ انڈیو بولتا ہے۔ ذرا آج چھوڑ آؤ۔ پر اس پھر میں خود ہی آیا جابا کروں گی۔“ پرس کو کندھے پر ڈالتی اور اپنے ڈاکو منٹس کی فائل سنبھالتی وہ جلدی سے بولی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی وہ بھی پیچھے ہی تھا۔

”لو کے ماما اور بابا! اللہ حافظ۔ میں جا رہی ہوں۔“ کھانے کی میز پر اعجاز صاحب کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے ماما کو دیکھ کر دروڑ سے ہی جملہ اچھلا گیا تھا۔

”اور واپس بھی آرہی ہوں۔“ ماما سے جھٹ جواب ملا جو بائیک کی چابی جھلاتے اس کے پیچھے تھا۔

”منحوس! آئیے کو چھوٹا بھائی ہے، لیکن بڑائی جھالو ہے۔“ دونوں نوک جھونک کرتے گیٹ سے باہر نکلے اور مسز اعجاز جو اس کے جیلے پر اسے نوکنے لگی تھیں بس مسکرا کر رہ گئیں اور اعجاز صاحب نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔

پون کو دروازے پر نہ پا کر اور سامنے پر نیل کے نام کی سختی دیکھ کر اس نے جوش سے بلکہ ڈور سے دروازہ کھولا۔

اور اندر سے دروازہ کھولنے والے شخص کو اتنی زور

سے جا کر لگا کہ بے چارہ کراہ کر ماتھا پکڑتا چند قدم پیچھے ہٹا اور دو جھٹ سے اندر۔

”مے آئی کم ان سر؟“ کمرے میں کھڑے ہو کر سویر بننے ہوئے پوچھا گیا۔

”آب ریڈی اندر آچکی ہیں۔“ مھوری میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا گیا۔ وہ ابھی تک ماتھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔

”تو بے استے لیے چوڑے انسان کا فائدہ پورا اہل ٹاور بنا کھڑا ہے اپنا آپ بونا لگ رہا ہے حالانکہ پانچ فٹ پانچ انچ قد ہے میرا۔“ دل میں بد مقابل شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا گیا۔

”اوہ سوری! مجھے پر نیل صاحب سے ملنا ہے۔“ آپ کے اسکول کی جانب سے فی میل نیچر کی ضرورت کا اشتہار پڑھ کر آئی ہوں۔“ ٹھہ مار انداز میں سوری کرتے ہوئے اس نے پر نیل کی تلاش میں اوصرا دھر نظرس دوڑاتے انگریزی زبان میں اپنی انٹری کی وجہ بیان کی تھی۔

”جی میں ہی پر نیل ہوں۔“ سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے بھی انگریزی زبان میں ہی جواب دیا۔ اور اہل ٹاور کو کرسی پر بیٹھتا دیکھ کر وہ تھوڑا سا گریڈ پائی تھی اس کے تصور میں تو کوئی سڑی کھڑوس سی عمر رسیدہ خاتون یا کھڑوس ساموٹا عمر رسیدہ سر کے بال اڑائے اور موٹا سا چشمہ لگائے پر نیل تھا اور سامنے والی شخصیت کھڑوس ضرور تھی مگر باقی کے تصور پر پوری نہیں اترتی تھی۔

”لگتا ہے اشد ضرورت تھی انہیں نیچر کی جومارے شامت، آپ کو یہ جاب دے دی گئی ہائے بے چارے۔“ ماما نے لاؤنج میں صوفے پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے کہا اور مشعل بس اسے گھور کر رہ گئی۔

”نکو مت! سارا وقت وہ اہل ٹاور اسے اسکول کے نظم و ضبط کی گردان کرتا رہا اور جتا ہے ماما! اسے لین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ایم ایس سی فرسک کی ڈگری

حاصل کی ہے۔ بقول اس کے حلیے اور شخصیت۔ میں شخص بی ایس آنرز لگ رہی ہوں اور نیچر سے زیادہ اسٹوڈنٹ نظر آتی ہوں۔ میں سوچ رہی ہوں زیر و زبر کے گلاسز لگا کر جاؤں شاید نیچر لگوں اور اباں جان مجھے شایک بھی تو کرنی ہے کیڑوں کی؟ آخر مجھے جاب مل گئی ہے۔“ لاڈ میں ممانک فرمائشیں پینچائی گئیں۔

”خدا کا خوف کرو مشعل! اسنے سارے کپڑے“

جوتے تو ہیں تمہارے پاس اور اب تو تم نے اسکول بھی جانا ہے اب تمہارے پاس کیڑوں کی ڈیزا کنگ اور سینے کا وقت نہیں بچے گا اور دیسے بھی تم فارغ تھیں تو میں نے اجازت دے دی تھی جنگ کی۔ اس دوران تمہارا کوئی اچھا رشتہ آیا تو بس ختم یہ جاب اور تم اپنے کمرے۔“ انہوں نے حسب معمول گھورتے ہوئے پھر سے اپنی بات دہرائی۔

”اور کراس آئی کو فارغ وقت میں شارت کو ر سز کبھی کو کنگ تے، کبھی سینے پر رونے کے، کبھی پینٹنگ



کے اب آپ انہیں کھرہ سب سکھانے کے لیے بٹھا بھی نہیں سکتیں مجترمہ ویسے ہی بڑی سکھوں اور اگر ان کا کھرہ دیکھیں تو بے چارہ رو رہا ہوتا ہے کیوں دیا مجھے اس۔۔۔ اس لفظ کو خلق کے اندر اتارا اور بات اوصوری چھوڑی کہ مشعل کے ہاتھ کشن منتقل ہو چکا تھا۔

”تم بس ہزار روپے نکالو۔ مجھے جاب مل گئی ہے ایمان احمد صاحب۔“ مشعل نے مالی کا پورا نام لیتے ہوئے کہا۔

”ایک ہفتہ بھی آپ یہ جاب کر گئیں اور آپ کی حرکتوں کو آپ کے کھروس باس نے برداشت کر لیا تو پھر لینا آپ۔“ مالی نے فوراً جواب اور عافیہ بیگم نے بچن کا رخ کیا۔ شام کے کھانے کا انتظام کرنا تھا اعجاز صاحب آنے ہی والے تھے۔ ان دونوں بس بھائیوں کی لوگ جھونک اب کشن لڑائی میں تبدیل ہونے والی تھی وہ جانتی تھیں کہ کچھ دیر بعد اگر مشعل خود ہی ان کی ہیلپ کرنی شروع کر دے گی۔

وہ جتنی لاپرواہ بس کھ، شرارتی اور چلیلی تھی اتنی ہی حساس، سمجھ دار اور سلیقہ مند بھی تھی۔ وہ اس کی متضاد شخصیت پر کبھی حیران ہوتیں اور کبھی پریشان نہ جانے اس کا شوہر اور سسرال اسے سمجھ پائے گایا نہیں۔

”یا اللہ یہ یوں ہی ہستی مسکراتی خوش و خرم زندگی گزارے اور جلد ہی اس کا بہت اچھا رشتہ آجائے۔ آئیں۔“ دل سے دعا کرتی وہ بچن کے کاموں میں مشغول ہو چکی تھیں۔

”اف! قسم کھا رکھی ہے اس ہندی نے میرے اسکول کے ڈسپلن کا بیڑہ غرق کرنے کی۔“ عاصم سے بات کرتے اپنے آفس کے ونڈو گلاس سے باہر کے پلے گرائڈ کا منظر دیکھ کر وہ کہتے ہوئے بولا تھا۔ اس

کی بات پر عاصم نے بھی مڑ کر باہر دیکھا تھا جہاں ایک نازک سی لڑکی سفید لیس والی قدرے لمبی گول گھیرے

والی شرٹ پر چننا ہوا بیڑہ گردن میں ڈالے ہاتھوں کی فریج ٹاٹ بنائے نرسری کے بچوں کو جھولوں پر جھلارہی تھی بلکہ ایک چھوٹا سا بچہ اس نے گود میں بھی اٹھا لیا تھا۔

عاصم، اس کا جائزہ لینے تک۔ بیوں کو اسے بلوانے کے لیے بھیج چکا تھا۔ عاصم کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ رہی تھی جب بیوں کے پیغام پر کندھے اچکا تو وہ آفس کی جانب بڑھی تھی۔

”ییس سر؟“ دروازہ کھلا دیکھ کر اندر آنے کی اجازت مانگے بغیر اس نے پوچھا تھا اور ابرار اس کے انداز پر دانت کچکا کر رہ گیا۔

”مس مشعل جہاں تک میری معلومات ہیں یہ پیریڈ نرسری کلاس کا میڈیا پیریڈ ہے نہ کہ ٹیم پیریڈ تو پھر وہ باہر بندروں کی طرح کیوں جھولے جھولتے پھر رہے ہیں۔“ ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے پوچھا گیا۔

”تو یہ ہے! اس اہفل ٹاور سے ہر وقت دھواں ہی نکلتا رہتا ہے۔“ منہ میں بڑبڑاتی تھی۔

”سر میڈیا پیریڈ ہی ہے لیکن جب لائٹ نہیں ہوگی اور جزیئر کا اس روم کے ساتھ کنکشن نہیں اور نرسری کلاس میڈیا روم میں کارٹون نہ لگنے کی صورت میں بھال بھال روٹا شروع ہوگئی تھی لہذا میں نے انہیں ٹیم پیریڈ کا ہمسوا دے دیا۔“ یہ ساری گفتگو انگریزی زبان میں کی جا رہی تھی اور عاصم کو نہ جانے کیوں لطف آ رہا تھا۔

”اوکے! اس سلسلے میں جلد ہی میٹنگ کرتا ہوں لیکن آپ فی الحال انہیں میڈیا روم لے کر چائیں۔“ شیدگی میں اب بھی کوئی کی دایع نہیں ہوئی تھی۔

”سراسر کی ضرورت نہیں ان کا پیریڈ آف ہو گیا ہے اور میں ان کو ان کی کلاس میں لے کر جا رہی ہوں۔“ چرسے پر بکھری لٹوں میں سے ایک لٹ کو کان کے پیچھے اڑتے دھواں پس مڑ گئی تھی اور عاصم کو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گئی تھی۔

”تمہارے بوسے دانت کل رہے ہیں میرا بس چلے

تو میں اسے ابھی فارغ کر دوں اس جاب سے۔“ باقی کا غصہ عاصم پر نکالنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئے کہا گیا۔

”یار ابرار! ہانپو کیوں ہو رہے ہو اگر اتنا ہی ناک میں دم کر رکھا ہے تو کرو فارغ۔“ آخر اس اسکول کے مالک ہو، سیاہ سفید کر سکتے ہو۔“ عاصم نے کندھے اچکا کے مشورہ دیا۔

”نہیں یار! اشی اذوری ٹیلنڈ اینڈ ہارڈ ورکر۔ پندرہ دن میں اس نے کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا اور پھر ہمیں سینئر گرلز سیکشن کے لیے ایک سائنس ٹیچر کی اشد اور فوری ضرورت تھی لاسٹ ٹرم بالکل اینڈ پریس براؤنم اپنی بیماری کی وجہ سے جاب چھوڑ گئے اور اس نے آتے ہی ناٹن اور ایٹ کلاس کو اتنا اچھا پڑھانا شروع کیا کہ ان کے ٹیسٹ میں نمایاں فرق نظر آ رہا ہے۔ میں حیران ہوں اس کی پر سنائی کے برعکس بچے اس کے ساتھ لپیٹ ڈھکی ہیں اور کلاس پیریڈ میں بالکل خاموشی اور جب جا کر سوالات کیے ٹاپک کے متعلق تو سب کو جواب آتے تھے۔ تم تو جانے ہو کہ مجھے ایسے ٹیچرز کی اشد ضرورت ہے! اسکول کی بہترین ریپوٹیشن بنانے کے لیے۔“

پاپا نے اس سے پہلے جس پرنسپل کو یہ اسکول سنبھالنے کے لیے دیا تھا اس نے سب کچھ بگاڑ کر ہی رکھ دیا اس لیے اب اسے سنوانے اور ترقی کی راہ پر لے جانے کا بیڑہ میں نے اٹھایا ہے پاپا کو اس کی بہت ٹینشن تھی۔“

عاصم جو کئی عرصے سے ملک سے باہر رہا تھا اب اچانک۔ واپس آکر اس سے ملنے چلا آیا تھا اصل صورت حال سے ابرار واقف کر ہی رہا تھا کہ نرسری کلاس کا ایڈوکل آیا پھر سے اپنی ادھوری باتوں کا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے ابرار نے جواب دیا اور بدلے میں عاصم کے شریر جواب پر بس وہ پھر وہٹ اسے اتار تارہ گیا۔

”اوکے یار اب میں چلتا ہوں۔“ کچھ دیر بعد ہی

عاصم نے جانے کا قصد کرتے ہوئے کہا۔ ”رک نہ۔“ ابرار نے فوراً کہا۔

”نہیں بتایا ہے ناکہ رشتے داروں سے ملنے اسلام آباد جانا ہے۔ لاہور سے اسلام آباد کا فاصلہ کافی ہے۔ گھر پر تو آج کل ملتا نہیں بقتل آئی کے بس آج کل اسکول ہی اور ٹانچھوٹا بنا ہوا ہے تمہارا اس لیے تم سے ملنے نہیں آگیا دیسے میری بات پر غور کرنا۔“ عاصم نے اس سے ہاتھ ملاتے آخری بات شریر لہجے میں کہی جس پر ابرار بس اسے گھو کر رہ گیا۔

ممکی بات نے اسے شک کر دیا تھا اور پھر وہ فوراً نتیجے پر پہنچ گئی تھی ان کے نیم رخا مند رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے حتیٰ سے نفی میں جواب دیا تھا۔ ماما نے پھر بھی اسے سوچنے کا وقت دیا تھا لیکن اسے کچھ سوچنا ہی نہیں تھا وہ اس کی چال کو بہت اچھی طرح سے سمجھ گئی تھی لہذا اگلے روز بھی اس نے وہی جواب دیا جو ایک دن پیشتر دیا تھا چونکہ ایک اینڈ تھا اور وہ ہفتہ صفائی منارہی تھی لہذا پورے گھر کو انٹ پلٹ کے صفائی کا کام زور و شور سے جاری ہو چکا تھا۔ عافیہ بیگم نے بھی اسے اس کے حال پر پھوڑ دیا تھا۔

شاک تو ابرار کو بھی لگا تھا رات ماما نے جوابات اسے بتائی تھی وہ اس سے بے حد پریشان ہو گیا تھا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ضرور اس مسئلے کو حل کر کے چھوڑے گا بس اگلے روز کا اب اسے بے چینی سے انتظار تھا۔

اور پھر اگلے روز کی اطلاع نے اسے اور زیادہ شاک کر دیا تھا، ٹیچرز کے ساتھ میٹنگ، ٹی کلاسز کا سٹینس، نئی بکس، نیا یونیفارم وہ ان سب باتوں کو ایک پل میں میسر فراموش کر گیا تھا۔

ذہن بے حد الجھا ہوا تھا زندگی ایک دم بلیک ہو گئی تھی بے چینی اور پریشانی اتنی بڑھی

کہ بے اختیار اس نے کسی کے لینڈ لائن کا نمبر تیزی سے اپنے سہل نمبر سے ملا تھا اور پھر تیزی سے کاغذ پر چند سطریں تھپتھپ کر کاغذ کو مٹھی میں جکڑے وہ آفس سے نکلتا چلا گیا تھا۔

والیسی پر وہ لانگ ڈرائیو پر چلا گیا تھا جس کی اسے اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی ڈرائیونگ کے دوران گزشتہ دنوں کی باتیں فلیش بیک کی طرح ہم سفر تھیں۔ کبھی لیوں پر مسکان، کبھی انجھن، کبھی بے حد پریشانی اور کبھی کچھ کھوجانے کا ذرا ان سب کیفیات سے وہ بیک وقت گزر رہا تھا۔

”ابراہیم! ہم لوگ، میں اور تمہارے پیلا چاہ رہے ہیں کہ تمہارا رشتہ عافیہ سے گریا جائے جس طرح کے تم سنجیدہ مزاج، ڈسپلینڈ، ہونے لگی ہو، سوہر، خاموش طبع اور تمہاری ہی طرح 37 ہین لڑکی ہے۔ ہمارے خیال میں تم دونوں پر فیکٹ کیل ثابت ہو گے۔ اگر لائف پارٹنر ہم مزاج ہو تو زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے اور پھر وہ تمہارے پیلا کے بے حد اچھے دوست کی بیٹی ہے۔ ہم اس فیملی سے بہت اچھے طرح واقف ہیں ہم لوگ بھی ایک دوسرے سے کئی بار فنکشنز وغیرہ پر مل چکے ہو اور اب تم نے اسکول کی دوسری برانچ سنبھال لی ہے۔ اپنی لائف میں سیٹھل ہو وہ تمہارے ساتھ ان سب میٹرز کو شیر کر سکتی ہے، سنبھال سکتی ہے۔ اس لیے ہم بہت جلد یہ رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دل میں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کے بے حد ارمان ہیں اور اب ہم انہیں جلد از جلد پورا کرنا چاہتے ہیں۔“

مسز گلزار نے ابراہیم کے بیڈ روم میں بیڈ پر لیٹے ابراہیم کے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کافی تفصیل سے بتایا جو ان دونوں میاں بیوی نے سوچا

تھا۔

لیکن ابراہیم کے رد عمل اور اس کی بات نے چند لمحے

کے لیے انہیں ساکت کر ڈالا تھا اور پھر وہ اس کے اصرار پر گلزار صاحب سے ہر بات معاملے پر بات کر کے تیسرے روز ہی مشعل کے گھر جا پہنچی تھیں۔ پتا انہیں مشعل کی فائل سے ملا تھا جو انہوں نے ابراہیم کے علم میں لانے بغیر اسکول کی کو آڈیٹر مسز عارفہ سے منگوائی تھی۔

”کلاس تھری! یہ پیریڈ میرا فیکسچو پیریڈ ہے اور آپ کا اردو کا ہے میں چونکہ سینئر سیکشن کی سائنس ٹیچر ہوں لہذا آئے اردو پڑھانا تو آسان ہے مگر چونکہ یہ آپ کا اردو خوش خطی کا پیریڈ ہے تو مجھے آپ لوگ پڑھائیں گے۔ کہ اردو کے الفاظ یا حرف کسی طرح لکھے جاتے ہیں۔“ راؤنڈ ٹیبل پر ابراہیم کے قدم کلاس تھری کے باہر ڈرافٹ پر غصے سے ٹھک گئے تھے۔

اس سے بڑھ کر ایک ٹیچر کی نالائقی کیا ہوگی کہ وہ چھوٹے بچوں کے سامنے اپنی خامی کا تذکرہ یوں فخریہ بیان کر رہی ہو آج اسے ڈانٹ لکھانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا یقیناً ”کو آڈیٹر مسز عارفہ اور مشعل کی انسلٹ ابراہیم کے آفس میں ہونے والی تھی۔ آخر مسز عارفہ نے مشعل کا پیرڈ لگایا ہی کیوں اگر وہ اس مضمون کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔“

”جی تو حرف ”س“ کے کتنے شوشے ہوتے ہیں؟ کیا میں نے وائٹ بورڈ پر ٹھیک لکھے ہیں یا کوئی مجھے کرکٹ بتائے (درست) گا۔“ اندر سے آئی آواز پر وہ متوجہ ہوا تھا اور پھر چند سیکنڈ میں وہ جان گیا تھا کہ یہ مشعل کا بچوں کا پڑھانے کا طریقہ ہے جو کافی دلچسپ تھا۔

ٹیچر کو سمجھانے کے چکر میں پوری کلاس پوری توجہ اور شوق سے خوشخطی کے پیریڈ کو اینڈ کر رہی تھی اور ہاتھ کھڑے کر کے ٹیچر کو بتا رہی تھی کہ وہ کون سا حرف درست لکھ رہی ہیں اور کون سا غلط۔

”یعنی مسز عارفہ! آج آپ کی تھری کلاس نے اردو خوشخطی کا پیریڈ شوق سے اینڈ کیا ہے اور سب بچوں

نے نوٹ بکس پر بھی اچھی اور صاف لکھائی۔“ کی کوشش کی ہے یہ وہی کلاس ہے نا جو اردو لکھائی میں کافی خراب جا رہی ہے مسز مریم کو میں بتا دوں گی کہ ان شیطانوں کو کس طرح سے قابو کرتے ہوئے اس سبجیکٹ میں ان کی دلچسپی بڑھائی جا سکتی ہے۔“ کلاس سے باہر نکلتے ہی مسز عارفہ کے ساتھ ابراہیم کی مخالف سمت میں چلتی ہوئی وہ بولی تھی وہ دونوں ہی ابراہیم کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔

اس روز وہ اس لاروہ سی لڑکی کی ذہانت کا تھوڑا سا قائل ہوا تھا اور اس کی پرفارمنس پر ہر طرف سے اطمینان بخش جواب پا کر وہ اس کی بجائے کنکریوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھا یہ وہ جان چکا تھا۔

ایک اور یاد فرٹ سیٹ پر آئی تھی تھی۔ جب اس روز ہنگی پھوار میں بچوں کے ساتھ بھگتی بھگتی ہنستی کھلکھلائی اس کے لیوں کو بھی مسکان سے آشنا کر گئی تھی۔ اسی کی طرح شفاف مسکان اور اب وہی اس کے لیوں سے مسکان کو چھین رہی تھی ایسا دکھ دیا تھا اسے کہ گیل لکڑی کی مانند سنگ رہا تھا۔

ڈرائیونگ کرنا بھی وہ بھروسہ ہو گیا تھا اس کے لیے۔ ”توبہ ہے مشعل چلتی پھرتی میوزک ہو یا رتم تو۔“ وہ اس کی چوڑیوں اور بازو کی کھٹکناہٹ سے خاموشی سے لیپ ٹاپ پر ضروری کام کرتے ہوئے بولا تھا۔ یہ آوازیں اس کی توجہ کو مرکوز نہیں رہنے دے رہی تھیں۔

جواب میں اس کی ہنسی کی جلتنگ بجی تھی۔ ”لو اس کی کمی تھی“ خواہ خواہ ابجھا۔

”تو یہ بیٹھی ہوں میں مجسمہ بن کر نہ ہوں گی نہ میوزک بجے گا اور نہ ہی بولوں گی۔“ منہ پھیلا کر وہ ناشتے کی میز پر اس کے مقابل کر رہی پر آن بیٹھی تھی۔

”یار ایک کپ اور کافی بنا دو تم کافی بے حد مزیدار بناتی ہو۔ بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے پھر سٹوڈنٹ فری ہے۔“ لیپ ٹاپ پر تیزی سے کام کرتے ہوئے وہ

مصروف سے انداز میں بولا تھا اور پھر بالکل خاموشی سے چوڑکا تھا اس کی تلاش میں اوسر اوسر دیکھا تو وہ بالکل سامنے پھولے منہ کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔

اس کے انداز پر وہ بے اختیار رہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

”سوری یار تمہارے۔۔۔ یہ سب ہی انٹرومنٹ نیچے پسند ہیں پلیز میوزک بجائی میرا مطلب مدھر میوزک بجائی ایک کپ کافی بناؤ۔ اس کے بدلے میں ذر میں تمہیں آج تمہارے فیورٹ ریڈیو سٹ میں کراؤں گا۔“ ہنسی پر قابو پاتے وہ خوش مزاجی سے بولا تھا۔

اور ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتیں مسز گلزار بے ساختہ ان دونوں کی باتوں اور حرکتوں پر مسکرائی تھیں۔ واقعی مشعل کے سنگ زندگی بتانے کا فیصلہ ان کے بیٹے کا بہترین فیصلہ تھا اور نہ ابراہیم یوں ہنسنے ناممکن وہ بے حد سنجیدہ مزاج بلکہ خشک مزاج تھا۔

اس روز اسکول آکر ابراہیم کو پتا چلا کہ مشعل اسکول چھوڑ رہی ہے اس کی نیبل پر مشعل کا استغنی پڑا تھا۔ نیپ پیٹے ہی رات سے پریشان تھا جب ممانے بتایا کہ مشعل کے گھر سے جواب نفی میں آیا ہے اور پھر اس نے مشعل کے گھر کا نمبر ملا کر مسز عارفہ سے بات کر کے اسی وقت ان کے گھر آنے کی اجازت طلب کی تھی اور جواب مثبت پا کر وہ فوراً ”ان سے ایڈریس پوچھ کر ان کے گھر روانہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو مشعل کی پرسنل فائل سے بھی ایڈریس لے سکتا تھا لیکن ان باتوں کا اسے دھیان ہی کب تھا۔

ڈرائیونگ روم چھوٹا لیکن بے حد نفیس اور خوب صورتی سے سجایا ہوا تھا۔ جب وہ ڈرائیونگ روم میں داخل ہوئی۔ تو مسز عارفہ چند لمحے ابراہیم سے رسمی گفتگو کرنے کے بعد چائے بنانے کا کہہ کر اٹھ آئی تھیں۔

انہیں ابراہیم بہت اچھا لگا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ ان دونوں کے درمیان جو بھی غلط فہمی ہے وہ بات چیت کے ذریعے دور ہو جائے انہیں اپنی بیٹی پر خود سے بھی

زیادہ اعلیٰ تھا۔

”میں اس رشتے سے انکار کی وجہ جان سکتا ہوں؟ آخر آپ نے مجھے رجم چھٹ کیا ہے تو اتنا حق تو رکھتا ہوں کہ مسترد ہونے کی وجہ جان سکوں۔“ چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں آپ کو شروع سے پسند نہیں ہوں۔ میری ہر بات آپ کو بچکانہ لگتی ہے۔ کسی نہ کسی بات پر روز میری حاضری لگ جاتی ہے۔ کبھی یہ ڈسپن خراب کیا کبھی وہ ڈسپن توڑا تو پھر رشتہ بچوانے کو میں کیا سمجھوں۔ یہ آپ کی چال ہے اس طرح آپ مجھ پر اپنا رعب قائم کر ڈالیں میں آپ کے سامنے کچھ نہیں بول پاؤں اور وہ جو آپ کے دل میں باس ہونے کے ناتے میری انسانیت کی خواہش بیدار رہتی ہے وہ یہ رشتہ ہونے کے بعد پوری ہوگی۔ میں آپ کی ساری چال سمجھ گئی ہوں اس لیے انکار کر دیا۔“ مشعل نے گرون اگڑاتے ہوئے جواب دیا اور آخری الفاظ مقابل کی جانب دیکھتے ہوئے کہے لیکن اس کے اثرات دیکھ کر وہ دل میں سم گئی تھی۔

”ہوں۔ ہوں۔ میرے پیلا اکلوتے تھے۔ رشتہ داروں نے ہمیشہ ان کے ساتھ منافقانہ رویہ اپنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش رکھی۔ اتفاق سے میں اکلوتا بیٹا ہوں ان کا پیلا ہمیشہ گھر میں اس تکلیف اور دکھ کے ساتھ دیکھا کہ میں اکیلا ہوں اور کوئی خالص رشتہ نہیں ہے۔ پیلا کو اپنے اکیلے پن کا ایک طرح سے دکھ ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس سوچ سے احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے۔ ماما کو بھی ان کے بہن بھائیوں سے زیادہ ملنے جلنے نہیں دیتے تھے کہ لوگ فریبی ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول ہے حد خاموش، سنجیدہ اور ایک طرح کی اداسی لیے ہوئے تھا۔ میں بھی اس ماحول میں ڈھل کر سنجیدہ مزاج ہوتا چلا گیا اور پھر ایک روز جیسے ہمارا آئی یعنی تم میری زندگی میں آئیں، تمہاری آن بے ساختہ سی بچکانہ حرکتوں پر میرا دل مسکرائے لگا۔ اسکول کو لے کر میں کافی سیریس اور منشن میں تھا لیکن پھر مجھے سب ہی معاملات مجھے محل کرنے ایچھے اور آسان لگنے لگے۔ تمہاری قابلیت کا میں چند دن

میں ہی قائل ہو گیا تھا اور پھر تمہاری اس شوخ چیخیل شخصیت نے مجھ پر ایسا اثر کرنا شروع کیا کہ جب ماما نے مجھ سے شادی کے متعلق بات کی تو فوراً ”تمہارا تصور ذہن میں آیا اور میں نے انہیں اپنی مرضی بتادی۔ بس یہی احساسات تھے جو میں نے آپ تک پہنچا دیے۔ اب اگر آپ کو لگے کہ میں کسی سازش اور چال کے بغیر سچائی کے ساتھ آپ کے ساتھ اپنی سنجیدہ سی زندگی کو قوس قزح کے رنگوں سے بھرنا چاہتا ہوں تو جب اس بار میری ماما آپ کو جواب مثبت دے دیجیے گا اور میری دعا ہے کہ آپ کو میرے سچے جذبات پر یقین آجائے“ گلا صاف کرتے ہوئے وہ چند لمحے بعد بولا تھا بیان میں آپ سے تم اور تم سے آپ کا سفر اس نے بہت تیزی سے طے کیا تھا اور پھر گاڑی کی کیچین نیبل سے اٹھا کر خدا حافظ کہتا ہوا اس کے گھر سے نکلتا چلا گیا تھا۔ اس کی سچائی والدین کو رشتہ بھجوانے سے واضح تھی۔

کوئی وجہ نہیں تھی جو اس رشتے سے انکار کیا جاتا۔ اعجاز صاحب اچھی طرح سے ان کی چھان بین کر دیا تھے۔ مزے گزار دو بار ان کے گھر آچکی تھیں۔ تیسری بار وہ گلزار صاحب کے ساتھ آئی تھیں۔ دونوں مہاں بیوی مشعل اور اس کے والدین کو نفیس اور سادگی طبیعت کے مالک لگے تھے مشعل ابرار کے اس عمل سے دل سے قائل ہوئی تھی کہ اس نے اس رشتے کو بنانے کے لیے صاف اور سیدھا راستہ چنا تھا۔ اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجا تھا۔ ماما کو بھی ابراہیم لے آیا تھا اور وہ مشعل کا سر کھاتا تھا کہ ہاں کرو اور میری بیوی کے لیے میدان صاف کرو۔ مشعل کی رضامندی یا کردوئوں گھر انوں میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں۔

”ہمارا آئی۔“ ***
تو جیسے یک بار لوٹ آئے ہیں پھر بعد میں وہ خواب سارے شباب سارے۔
لظہم لظہم لظہم لظہم وہ ابرار کے لیے کافی بنانے کی جانب بڑھ گئی ساتھ ہی اس کے کانوں کے پاس شرارت سے چوڑیاں بجائی ہوئی تھیں۔

خواتین و رشتہ رازوں کے پی پی طرز پر ہند

خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2018ء
کے شمارے کی ایک جھلک



- ✽ ”افرار کا موسم“ ایمل رضا کاکمل ناول، ✽ میمونہ صدف اور فوزیہ فرخ کے ناول،
- ✽ ”دیکھتے نہایتے روشنی“ مصباح علی سید کاکمل ناول، ✽ آپ کی پسندیدہ مصنفہ ”نیلما ابرار“ سے ملاقات،
- ✽ ”دھبہ جنوں“ آمنہ ریاض کاناو، ✽ ٹی وی فنکار ”علی مرتضیٰ“ سے باتیں،
- ✽ ”حالم“ نمرہ احمد کاناو، ✽ کرن کرن روشنی احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ✽ قائد راہبر، داعضہ زیدی، قرۃ العین سکندر، ✽ ہمارے نام اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
- عذیب ذہرا، ایمین فیاض، اور شیدیل کے افسانے،

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔



دیکھنے میں جو آنکھیں میسلی لگتی ہیں
تینز آجالے ان کے اندر ہوتے ہیں
ان کے من میں کئی سمندر ہوتے ہیں
روشنیوں کے دریا جن میں گرتے ہیں

دیکھنے میں جو آنکھیں بھیگی بھیگی ہیں
ان کی تہہ میں کئی طوفان ہوتے ہیں

ان کے چہچہے خشک بیاباں ہوتے ہیں
جن میں دن بھر ریت کے بادل اڑتے ہیں
ٹوٹے دل کب جڑتے ہیں

دیکھنے میں جو آنکھیں سہمی سہمی ہیں
ان کے اندر خواب اُمدتے بستے ہیں
بچھر بچھر کے گہرے دریا بہتے ہیں
جن کے کناروں پر خواہش دکھ جیتی ہے
یوں کب قسمت بنتی ہے
محمود شام

کبھی تعجیل ہوتی ہے، کبھی تاخیر ہوتی ہے
مرتب کس طرح انسان کی تقدیر ہوتی ہے
کسی سائل کی صورت کو کبھی دیکھو تو واضح ہو
کہ خاموشی میں کتنی دکھ بھری تقریر ہوتی ہے
زمانہ تو بصورت اُلجھنوں کا ایک چکر ہے
جدھر بچ کر نکلتا ہوں، وہیں زنجیر ہوتی ہے
زیادہ عشق کا اظہار بھی خطرے کا سنگل ہے
مری بات ان کو یوں لگتی ہے جیسے تیر ہوتی ہے
یہ ڈر ہے کہ کبیرے کی آنکھ خود اندھی نہ ہو جائے
عدم اس جسم میں کچھ اور ہی تو رہا ہوتا ہے
عبدالحمید عدم

یہ اچھا، وہ بُرا ہوتا ہے
ان باتوں سے کیا ہوتا ہے

رات گئے بھی آسکتے تھے
دروازہ تو کھلا ہوتا ہے

جب دیکھو اس دروازے پر
کوئی نہ کوئی کھڑا ہوتا ہے

تم تو خوش ہوتے ہو مل کے
سارا شہر خفا ہوتا ہے

صاف نظر آ جاتا ہے وہ
جس نے پیار کیا ہوتا ہے

چُپ رہتا ہوں شعور کے منہ پر
گو افسوس بُرا ہوتا ہے

الور شعور

خمار بارہ بنکوی

تسلی

اعتبار

ایک لڑکا اور لڑکی پیار میں کامیاب نہیں ہو سکے

265 2018

نکالتی کھلتا کھلتا

شفیقہ تبسم کتاب کر دو کے کھم گم شدہ باب کے ہیں ترے نیلے کے نیچے بھی ہمارے خواب دکھے ہیں رسکنا نہ چوہدری مدد کے انتظار میں جس کے ذندگی بتانی تھی راہ اس نے آمد کی مددوں دکھائی تھی آج ہو گیا رخصت اک چراغ سا چہرہ جس نے غم بھر سب کو روشنی دکھائی تھی شبہ صنف لاهور کس طرح چھوڑ دوں تمہیں جاناں تم میری زندگی کی عادت ہو داستان ختم ہونے والی ہے تم میری آخری محبت ہو لیلا رب نواز ودھیواں بھکر وقت رہتا نہیں کہیں تک اس کی عادت بھی آدمی سی ہے بشری جاوید قریشی پرھراڑ ہم سے پوچھو مزاج بارش کا ہم جو بچے مکان والے ہیں حافظ اقبال جاوید پھر تو اپنی شیشہ گری کا ہنر نہ کرنا آج میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے

زاد دگر مگر ازالہ ان کو مزاج پر ہی کی فرصت نہیں ہے ہم کو بھی کوٹنے یاد کی عادت نہیں رہی تنہائیاں ہوتی ہیں مری جب سے غم گسار مجھ کو تمہارے پیار کی عادت نہیں رہی

نوال افضل گمن بکرات وہ عادت ہے تو عادت سے کنارہ ہو بھی سکتا ہے مگر اس ساری کوشش میں خسارہ ہو بھی سکتا ہے ہمیں حیرت سے مت دیکھو، اب ایسا کیا کیا ہم نے نسیمی عشق ہے صاحب دوبارہ ہو بھی سکتا ہے غمراہ اقبال ہسکانہ بلے دل، سو شکایت بھی چھوڑ دوئی غور سے بھی اب فرار کی عادت نہیں رہی کیا عشق کیا جتنوں یہ ہم سے نہ پھر چھوے اس راہ غار دار کی عادت نہیں رہی خنبہ اکرم اپنے حصے کی چال تم چل نیلے ہمارے منتظر رہنا، کھاتی ختم کرنی ہے رابعہ بھری کراچی ہم شہر جاں میں آخری نغمہ سنائے گے سمجھو کہ اب تمہارا تماشا ختم شدہ سیدہ نوباحلا اکبر وڈپکا فکرت کھلے ذرا سی تو بانی بانی ہو میں چاہتا ہوں کہ دشمن بھی خاندانی ہو شازبہ سعید شاہ ٹکندر اندھیرے سے لڑائی کا، یہی احسن طریقہ ہے تمہاری دسترس میں جو دیا ہو، وہ جلا دینا فریحہ فیصلہ شاہ ٹکندر جن جن کو تمہارا یہ عشق کا آزار مر گئے اکثر ہمارے ساتھ گئے بیمار مر گئے افراتینز تھکاوں دیر باخان بیلانی کلس فکس، گمان گمان، حیاں سارے مسترد تو نہیں تو کچھ نہیں، سارے سہارے مسترد

آسمان جاوید علی پور بھٹہ کیا کرے میری مسیحا بھی کرنے والا زخم یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا شامل ہونے کو ہے اور آنکھوں میں کھاب نہیں اس گھر میں نہیں کوئی روشنی کرنے والا ناویہ اشرف رسلے دند ہم نے تمہارے بعد نہ رکھی کسی سے کس اک تجربہ بہت متاثرے کام آگیا فوزیہ شریٹ بکرات راز دل نہ سنانا کسی کو سواغز دیتا میں ہم راز بدل جاتے ہیں کسی سے بچھڑنے کوئی مرنے نہیں جاتا ہاں مگر مینے کے انداز بدل جاتے ہیں نرینب کراچی کبھی ساہیاں نہ تھا ہم، کبھی کہکشاں بھی قریب قریب کبھی بے مکان کبھی لاکھوں میری آغوش غمزدگی آسے پایا اسے کھو دیا بھی نہیں دیا بھی رو دیا بڑی مختصر ہے یہ داستان مری آدمی غمزدگی عائشہ مرزا فیصل آباد سناسے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ بچوں کو سکھارہی تھی محبت ایسے لکھتے ہیں افراتینز دریا خان بیلانی اس نے جب بچوں کو جنس دی عدم رائیگاں گفتگو کے سب فن گئے تسلیم اختصار اسلام آباد وہ جنگل کے پھولوں پہ مڑا ہے کیوں اس کو اچھے لگتے ہیں دیرانے کیوں محسن جب کبھی چوٹ نئی کھالتا ہوں دل کو یاد آتے ہیں یاد پرانے کیوں شفاعت بٹول جام پور ادا اس مت ہو کہ موسم بدل رہا ہے یہاں وہ دیکھنا شاخ سے پتا اٹل رہا ہے یہاں نہ وہ آئینہ آرائیاں ہیں اور نہ چراغ بس ایک دل ہے سو مدت سے جل رہا ہے یہاں

نیں تارا جام پور میں عمر بھر نہیں رویا، مگر ہنسنا بھی نہیں یہ دل کسی کا نہیں غصا مگر کسی کا رہا بقیس ریاض سرگودھا ہنستے ہوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت روونے کی یہاں دیسے بھی فرصت نہیں ملتی کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی غصا ہیں ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی شاہل الور سدووال مار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں غم بھر کے لیے آزار ہوئی جاتی ہے یاسین کنول پسرورد اک تمنا یہ لے کے پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہیں بے وہ ملتا نہیں یہ دکھائے گی امد کیا ہم تو بھید قسمت کا ہم پہ کھلتا نہیں افشاں مرزا فیصل آباد خوشی سے ہم نے ہیں بے وفائیاں کیا کیا ذرا سے لطف سے نکلیں بھراؤں کیا کیا یہ اب رکیب نہ ناصح نہ غم گسار توئی تم آشنا تھے تو تھیں آشنا یاں کیا کیا مدرثرہ سلیم نوشہرہ جمیلرا ایک دل ہے کہ سایا نہیں جاتا ہم سے لوگ محلوں کو گھزار بنا دیتے ہیں صدق عمران کے دی اے سراشی کیا کہوں، دل پہ قیامت سی گزرجاتی ہے اتفاقا جو کسی آنکھ میں آنسو چکے کتنی غمزدگیوں کو ترے نام سے شہوت کیا میری خواہش تھی بھرے شہروں اک تو چکے



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، میں جبینہ قبیلہ کی ایک شاخ حرقہ کی طرف (لڑائی کے لیے) بھیجا جہاں صبح صبح ہم ان کے پانی کے چشموں پر حملہ آور ہو گئے (لڑائی کے دوران) میری اداغاری کی مڈبھیڑ ان کے ایک آدمی کے ساتھ ہوئی جب ہم نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تو اس نے (کلمہ) پڑھا۔ لا الہ الا اللہ جس پر (میرے سامنے) انصاری نے تو اپنا ہاتھ روک لیا لیکن میں نے اپنا نیزہ مارا۔ حتیٰ کہ اسے قتل کر دیا۔ جب ہم مدینہ واپس آئے تو یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔
”اے اسامہ! کیا تم نے اسے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کر دیا؟“
میں نے عرض کیا۔ ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس نے تو صرف جان بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پھر) فرمایا۔
”کیا تم نے اسے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کر دیا؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی فقرہ بار بار دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے آرزو کی کہ میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔“
(یعنی اب مسلمان ہوتا تاکہ میرے ہاتھوں ایک نو مسلم کا قتل نہ ہو) (بخاری و مسلم)

نوابزادہ سائل :-
ظاہری حالات پر اسلام کے احکام کا فیصلہ ہوگا۔ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح

استغای کا رد وائوں سے روک دیا گیا ہے ورنہ کوئی بھی شخص اپنے دشمن کو قتل کر کے دعوہ کر سکتا ہے کہ اس نے اسلام کا جھوٹا دعوہ کیا ہے۔ جیسا کہ آج کل اکثر توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگا دیا جاتا ہے چنانچہ باطنی کیفیت کی کھوج لگانے کو میرے سے عزیز و دی قرار دے دیا گیا اور صرف ظاہر معاملہ کر کے کی تاکید کی گئی۔

ہمہان،

ایک دن امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ روئے گئے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟
آپ نے فرمایا۔
”اس لیے رو رہا ہوں کہ سات دن سے کوئی ہمہان گھر نہیں آیا ہے۔“

ریاکاری،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اپنا سر نیچے کیے ہوئے ہے یعنی یہ ظاہر کر رہا تھا کہ میں بارگاہ ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا۔
”اے عروہ! کچھ کرنے والے، گردن سیدھی کر۔ تواضع اور خوگساری کا تعلق دل سے ہے گردن نہیں۔ بھائی کا ساتھ دینا،“

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف بن زون علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ میں تمہاری قوم سے ایک لاکھ آدمیوں کو ہلاک کروں گا۔ جس میں ابھی ہزار ایک افراد ہوں اور میں ہزار گنہگار۔“
حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا۔ ”یہ

نیک لوگ کیوں ہلاک ہوں گے؟“
اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
”اس لیے کہ انہوں نے ان شر پسندوں اور خفا کاروں کو اپنا دشمن نہیں سمجھا اور ان کے ساتھ کمانے پیئے، آٹھنے بیٹھے اور دوسرے معاملات کرنے میں کوئی احتراز (دور رہنا) نہیں کیا۔“

توکل،

مولانا محمد علی جوہر جیل میں نظر بند تھے۔ ان کی اہلیہ جیل خانہ میں ان سے ملاقات کے لیے گئیں۔ انہوں نے اپنے شوہر مولانا محمد علی جوہر سے کہا۔

”تم ہماری فکر نہ کرنا۔ اللہ ہی پہلے بھی رازق تھا اور اب بھی وہی رازق ہے۔ تم صرف ایک واسطہ تھے اور اللہ بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا۔

”رہا تمہارا کام، اس کو اگر اجازت ہو تو میں کرتی ہوں۔“
چنانچہ انہوں نے ”کام“ شروع کیا اور دوسرا کے عرصہ میں پینتالیس لاکھ روپے کا چندہ خلافت تحریک کے لیے جمع کر لیا۔

اسلام کی سچائی،

یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ ساری دنیا میں یورپ کی عیسائی قوموں کا غلبہ تھا۔ قاہرہ کے ایک عیسائی پادری سے ایک شخص نے پوچھا۔
”آپ کتنے دنوں سے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟“
”پچاس سال سے،“ پادری نے جواب دیا۔
”اٹھنے دنوں میں کتنے مسلمانوں نے عیسائیت کو اختیار کیا؟“ اس کا اگلا سوال تھا۔

”تقریباً دو تیرہ سو۔“ پادری نے کہا۔ پھر فوراً ہی بولا۔ ”لیکن یہ کوئی قابل اطمینان بات نہیں ہے؟“

”کیا مطلب؟“ اس شخص نے سوال کیا۔
پادری نے کہا۔ ”وہ بے کے لیے عیسائی تو ہو جاتے ہیں لیکن پھر موت کے وقت تو بکرہ لیتے ہیں۔“
یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے کہ بہت کم مسلمان اسلام لانے کے بعد عیسائیت یا کوئی اور مذہب اختیار کرتے ہیں جبکہ اسلام مسلسل پھیل رہا ہے۔

باتیں اشتقاق احمد کی،

وہ اللہ کے دیے ہوئے میں سے دیا کرو، تم نے کون سا اپنے پتے سے دینا ہوتا ہے۔
وہ جب آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے ہیں تو قبولیت کے سمندر میں مژدہ بھل جاتی ہے۔

وہ جب انسان اندر سے مر جاتا ہے تو وہ حد سے زیادہ خوش اخلاق ہو جاتا ہے۔

وہ دنیا میں کبھی کسی اچھے انسان کو تلاش مت کرنا بلکہ خود اچھے بن جانا اس سے کسی اور کی تلاش ختم ہو جائے گی۔

وہ فاتحہ لوگوں کے مرنے پر نہیں بلکہ احساس کے مرنے پر پڑھنی چاہیے کیونکہ لوگ مرنے میں تو میر آجاتا ہے، احساس مر جائے تو معاشرہ مر جاتا ہے۔

وہ انسان کے اوپر کئی طرح کا بوجھ ہوتا ہے۔ ہمارے اوپر رب سے بڑا بوجھ تکبر کا ہوتا ہے اور ہم یہ جانتے بغیر کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون بڑا ہے اور کون چھوٹا، فیصلے خود ہی کرتے رہتے ہیں۔

وہ ہم اللہ کے لاڈلے مزدب ہیں مگر اتنے بھی نہیں جتنا ہم خود کو سمجھتے ہیں۔

وہ معذہ و حیدر سعدی۔ اسلام آباد

کم غذا،

ایک شخص نے ایک دیہاتی آدمی کو دیکھا ساتھ سال سے زیادہ عمر ہوئے کے باوجود وہ خوب تندرست اور سرگرم دکھائی دیتا تھا۔
”آپ کی صحت کا راز کیا ہے؟“ اس نے پوچھا



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

کے بعد؟ ایک درخواست کے ساتھ حاضر ہوں اپنی کم شدہ مصنفات کی واپسی کے ساتھ۔ فرحت اشتیاق نے کافی عرصے سے اپنی آمد بند کردی اور پھر بیٹوں نے خورشید نے تو اتنا لبا و قد دے رکھا ہے کہ.....؟ تین عدد بچین سسر زنے نہ ہواؤں نہ بارشوں نہ خواہشوں نہ موسموں کی کوئی دم جھم پڑتی پھواروں جیسی تحریر بھیجی اور عالیہ بخاری کی تحریروں میں ٹھہراؤ آ گیا۔ بشری احمد، آمنہ ریاض، ساجدہ حبیب، عمیرہ احمد کلاہر ہیں یہ سارے میرے جواہرات ان سب کو برآمد کیا جائے۔ کوشش، کوشش اور پھر کوشش کیا یہی زندگی نہیں ہے تو پھر کیجیے۔ میں نے عرصہ ڈیڑھ سال سے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ زندگی کا تاریک اندھیرا کچھ روشنی میں آیا پھر سوچنے بجھنے کی صلاحیت لوٹنے لگی۔ اللہ کرے دماغ بچ رہے جو ایک دشمن نمائندگی نے مفلوج کر دیا تھا اپنی بے بسی کی عالم حرکات و اعمال سے۔ یہاں سے یاد آ یا کہ۔

اس ماہ جب تجھ سے نانا جوڑا تھا میں پشانی بہن

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے
دعا میں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم اور اپنے حفظ و
امان میں رکھے۔ آمین

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔ پہلا خط
نوشہرہ علیہ السلام سے مدثرہ سلیم کا ہے۔ ہتھی ہیں۔
فروری کی شروعات بہت اچھی رہی ایک تو یہ کہ
ہمارے گھر مستورات کی جماعت ٹھہری جس سے بہت
کچھ سیکھنے کو ملا دوسرا میں نماز کی پابندی کرنے لگی ہوں۔
پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں سنا
آپ بہت نیک کا کام کر رہے ہیں اس سے بہت کچھ سیکھنے
کو ملتا ہے دین کے بارے میں ”خواب شیشے کا“ میری
فیورٹ اسٹوری ہے اور ہر ماہ میرا پسندیدہ کردار ”شہر زاد“
پھر وہی بات صائمہ جی! آخر یہ ہم زاد ہے کون؟ اب بتا
بھی دیں ”سنہری دھوپ“ بہت سلو جا رہی ہے فرزانہ۔
کھرل آپ کا نام ہی کافی ہے سب سے پہلے آپ کا
نا دل پڑھا کیا زبردست تھا اشعب کا کردار مجھے بہت پسند
آیا ”محبت تمہارے نام“ ویل ڈن سدرہ المنتہی۔

”آؤ لالہ لگاتے ہیں“ ام ایمان قاضی کی اچھی
کاوش تھی۔ افسانوں میں ”چان روٹھ گیا“ دو آنسو آنکھ
سے نکل کر دوپٹے میں جذب ہو گئے جانے کیوں؟ بانی
افسانے زبردست تھے سارے کے سارے نئی نوزیہ فرخ
کا ”عروں کے سلسلوں“ پسند آیا۔ کوثر خالد جی اس دفعہ
کیوں غائب ہیں ناظمہ زیدی کی نوزیہ شریٹ آئی لائیک پو
دہ ہماری نسبت زہرہ تو پھول ہی ہیں۔ یہ ساری پرانی
رائیٹر زکیاں کھو گئی ہیں۔ شمرہ بخاری کیا جواہری شلی سے ہم
اب کبھی نہیں مل سکتے ناظرہ افتخار ”داسی ڈھولن یاردی“ کی
طرح نیا ناول کب لائیں گی سمیرا حمید علیز ”یاد“ کا دوسرا
حصہ ”کارل“ کب آئے گا۔

ج: بیماری مدثرہ! بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ
نماز کی پابند ہو گئی ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ توفیق عطا
فرمائے۔ آمین۔

سمیرا حمید ”یاد“ کا دوسرا حصہ تو نہیں لیکن بہت جلد
آپ کے لیے ایک نیا ناول لکھیں گی۔
شمرہ احمد نے لکھا ہے
کیا اب کراچی میں اصل امن و امان ہے آپریشن

ہوئی تھی۔ اس لیے میں پانی نہیں پیتا
حضرت سلیمانؑ نے پوچھا: تو نے آزادی کو کیوں
خیر یاد کیا؟ دیا اور دیرانے میں رہتا تو نے کیوں پسند کیا؟
اس نے کہا: ”دیرانہ رب تعالیٰ کی میراث ہے“
میں رب تعالیٰ کی میراث میں رہتا ہوں، جیسا کہ
قرآن کریم میں بھی ہے
حضرت سلیمانؑ نے پوچھا: ”جب تو کسی دیرانے
میں بیٹھا ہے تو کیا بولتا ہے؟“
اس نے کہا: ”میں یہ کہتا ہوں، وہ لوگ کیا ہوئے
جو اس جگہ مزے سے رہتے تھے؟“
حضرت سلیمانؑ نے پوچھا: ”جب تو آزادی سے
گزر رہا ہے تو کیا کہتا ہے؟“
الو نے کہا: ”اس وقت میں یہ کہتا ہوں ہلاکت ہو“

بنی آدم پر ان کو نیند کیسے آ جاتی ہے۔ حالانکہ مصائب
کے طوفان ان کے سامنے ہیں؟
حضرت سلیمانؑ نے کہا: ”تو دن میں کیوں نہیں
لکھتا؟“
”انسانوں کے ایک دوسرے پر ظلم کرنے کی
وجہ سے میں دن میں نہیں لکھتا“
حضرت سلیمانؑ نے کہا: ”اچھا مجھے بتا کہ تو برابر
بولتا رہتا ہے۔ اس میں حیر کیا پیغام ہے؟“
الو نے کہا: ”میرا پیغام یہ ہوتا ہے، اے غافل
لوگو! زاد راہ اور اپنے سفر آخرت کے لیے تیار ہو
جاؤ۔ نور پیدا کرنے والی ذات پاک ہے۔“
اس وقت حضرت سلیمانؑ نے فرمایا: ”پرندوں
میں ان سے زیادہ انسانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد کوئی
نہیں ہے۔ اور جانوں کے دلوں میں ان سے زیادہ
کوئی پرندہ برا نہیں ہے۔“
(حیاء الیوان، جلد دوم)



تو دیہاتی نے جواب دیا۔
”میرے سامنے جب بھی یہ سوال ہوتا ہے کہ کھاؤں
یا نہ کھاؤں تو میں ہمیشہ ”نہ کھاؤں“ کو ترجیح دیتا
ہوں۔“
سقراط کا کہنا ہے۔
”اس وقت تک نہ کھاؤ جب تک تم بھوک سے
بے تاب نہ ہو جاؤ۔“

وضاحتیں،
صرف غلط ہونے پر وضاحتیں نہیں دی جاتیں۔ کئی
بار ہم وضاحتیں اس لیے دیتے ہیں کہ سامنے والا ہمیں
غریب نہ ہوتا ہے۔
مدیر سحر نورین مہک۔ ریگرات

خیر خواہ پرندہ
الونیم نے ”علیہ“ میں حضرت ابن مسعودؓ سے
رایت کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ
ایک دفعہ میں امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے
پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہاں حضرت کعبؓ اخبار بھی
موجود تھے۔ کعبؓ نے حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر
فرمایا۔
”اے امیر المومنین! کیا میں آپ کو ایک نہایت
عجیب فقہ نہ سناؤں، جو میں نے انبیاء کے حالات
کی کتاب میں پڑھا ہے۔ وہ فقہ یہ ہے کہ ایک بار
حضرت سلیمان بن داؤد کے پاس ایک (تورہ) ہمارے
آیا اور اگر کہا۔
”السلام علیک یا بنی اللہ!“
آپ نے جواب دیا: ”وعلیک السلام یا ہمارے؟“
پھر حضرت سلیمانؑ نے اس سے پوچھا: ”اچھا
مجھے بتا کہ تو دکانے کیوں نہیں کھاتا؟“
اس نے جواب دیا۔
”حضرت آدمؑ کو اس وجہ سے جنت سے نکالا
گیا۔“

پوچھا: ”اچھا تو پانی کیوں نہیں پیتا؟“
الو نے کہا: ”اس میں تو نم تو ج ڈوب کر ہلاک

نے اتنا اچھا لپٹنے خیالات کا اور زندگی کا رنگ لکھا بات روز ازل کی طرح صاف عیاں ہے کہ جیسے نیکی، بدی ہیں ویسے ہی اچھے برے لوگ، ظالم، مظلوم ہیں کسی کے ساتھ زندگی میں حکم ہوتا ہے اور زندگی اندھروں میں بھٹکانی جاتی ہے۔

ن: پیاری شرد! یہ حقیقت ہے کہ لوگ ظالم ہوتے ہیں، اپنے مذموم مقاصد کے لیے دوسروں کی زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔ آپ کی دوست نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ آپ کی ہستی کھیتی زندگی کو مسائل اور مصائب میں پھنسا دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے مشکلات اور مسائل کا سامنا بہت اور بہادری سے کیا اور اب بچوں کو تعلیم دے رہی ہیں جو بلاشبہ ایک عظیم کام ہے۔ جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا اسے اپنی طاقت بنالیں۔ اس کا مقابلہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کو شکر کرنے والوں کو کامیابی دیتا ہے۔ وقت کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ گزر جاتا ہے یہ وقت بھی گزر جائے گا۔

پرانی مصنفین کی وی پر معروف ہیں۔ ہم آپ کا پیغام ان تک پہنچا رہے ہیں۔ ویسے فائزہ جبین نے کالی عرصہ بعد لکھا ہے۔ جو خواتین کے فردی کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ آمنہ ریاض بھی خواتین میں ناول لکھ رہی ہیں۔

فائزہ بھٹی نے چوکی سے لکھا ہے سرورق بہترین رہا۔ رنگ برنگے دھاگوں والے جھکے تو زیادہ ہی پہنے جانے لگے ہیں۔ ”پہلی شمع“۔ ”سمہ و نعت“ کے بعد احادیث کی جانب رخ موڑا (جزاک اللہ)

سب سے پہلے ”خواب شیشے کا“، نمبر آفندی بھی پروہ اٹھانے کو تیار نہیں، چلو بھی تمہاری مرضی، مگر دیکھ لیتا یہ نہ ہو کہ ہم لوگ آگیا کر رہی ہوڑ جائیں۔

”شہزاد“، لویڈا بیگم، ہم تو فہم، درود سب کر دیتے، آپ پھر بھی واپس آئیں۔ دیے ایک بات کا تو یقین ہے یہ پہاڑ کھودنے سے ہادی ہی نکلے گا۔ ”شہزاد“ اب کی بار پڑ کر ہی دکھانا۔ درہوار جتنی تم پسند نہیں اتنی ہی حرکتیں عجیب کر رہی ہو۔ ایسا نہ ہو ہم تم سے قطع تعلق کر لیں۔

فرزانہ کھل جس کے لیے بندہ کہہ سکتا ہے نام ہی

کافی ہے۔ لڑکیاں اس سال محبت کے لیے نہیں روئیں گی۔ فرزانہ کھلنا اچھا سبق دیا ہے۔ میں جتنی ہوں محبت کے لیے ہی نہیں کسی معاملے میں بھی مردوں کے سامنے نہیں روئیں گی۔

فرزانہ! ایک بات ہے۔ اقدار کی پاس داری کوئی تم سے سیکھے۔ ”محبت تمہارے نام“، سدرہ انجیلی نے بھی بہت اچھا لکھا۔ دھیمے سروں میں، بہتی ایک اچھی کہانی۔ بہرام اور کلثوم کی کہانی جان دار تھی۔ ”سنہری دھوپ“ اس دفعہ کوئی مزہ نہیں آیا۔ نیچلی قسط میں احسن اچھا لگا تھا۔ نوٹس قسط بھی مگر کوئی خاص مزہ نہ دے پائی۔ ہمیں ”دل کے رستے دشوار“ جیسا کچھ چاہیے سلوٹی جی۔

”مگل فروش“ ناول رہی، اگر یہی کہانی میں نے یا میری جیسی کسی اور قاری نے لکھ کر بھیجی ہوئی تو اس پر بڑا بڑا رنجیکٹ لکھا ہوتا تھا۔ بعض کہانیاں یا افسانے ایسے ہوتے ہیں کہ بے ساختہ دل دہائی دیتا ہے۔ اس سے اچھا لکھتے ہیں ہم یا پھر لکھ سکتے ہیں صرف قلم پکڑنے کی دیر ہے۔

میں اگر آپ لوگوں کے ناموں سے مخاطب کرتی ہوں۔ تو برا مت مانے گا۔ مجھے ناموں سے پکارنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ میرے ابو کہتے ہیں، فضول بیٹنے سے یا پھر کسی کے گھر جا کر بدگوئیاں کرنے سے بہتر ہے انسان اپنے گھر میں بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھ لے۔ اس دفعہ میرا حمید غائب کیوں ہیں۔ آپ نبیلہ عزیز کو پکڑ کر ان سے ایک مکمل ناول تو لکھوادیں۔

اور ایک بات۔ اس بات کی بھی وضاحت کروں کہ قدرت اللہ شہاب کی کتنی بیویاں تھیں؟ میری اور بھائی کی بحث چھڑی ہے۔ وہ کہتے ہیں تم نے قدرت اللہ شہاب کا ”شہاب نامہ“ پڑھ لکھا ہے ان کی کتنی بیویاں تھیں؟ میں کہتی ہوں ایک عفت اور ایک ان کا بیٹا ثاقب۔ وہ پڑھو تو تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں نہیں۔ ان کی دوسرے زیادہ شادیاں ہوئی ہیں۔ ایک شادی تو انہوں نے اگلے تھا چچی لڑکی کو دیکھ کر اس سے کی کمی وہ کسی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔

ن: پیاری فائزہ! سب سے پہلے تو معذرت کہ ہم آپ کے پچھلے خطوط شامل نہ کر سکے۔ بڑی وجہ تو تاخیر سے موصول ہونا ہے لیکن کبھی کبھی صفحات کی مجبوری بھی آڑے آتی ہے۔ اور ہم چاہتے ہوئے بھی بہت سے خطوط شامل نہیں کر پاتے۔

قدرت اللہ شہاب نے ایک ہی شادی کی تھی اور ان کی بیوی کا نام عفت تھا۔ عفت کی وفات کے بعد وہ تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے جہاں تک دوستوں کا تعلق ہے تو ممتاز مفتی صاحب نے ان کا ذکر تو کیا ہے لیکن دوسری شادی کا ذکر نہیں کیا۔ جس کتاب کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے۔ اس کے بارے میں ہمیں علم نہیں۔ عموماً مشہور لوگوں کے بارے میں لوگ اس قسم کی باتیں لکھ دیتے ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

ناموں سے پکارنا اچھی بات ہے۔ قربت اور دوستی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جن سے آپ کے رشتے ہوں وہاں رشتوں کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔

آپ کے ابو نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ انجیلی کتابوں کے مطالعہ سے انسان کی شخصیت گھرتی ہے، اسے دوسرے لوگوں کے احساسات و جذبات کو سمجھنے کا شعور حاصل ہوتا ہے اور انسان بہت سی معاشرتی خرابیوں سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

کہانیوں کا انتخاب کرتے ہوئے ہم مصنف کا نام نہیں دیکھتے صرف اس کی تحریر دیکھتے ہیں۔ ”مگل فروش“ آپ کو پسند نہیں آئی۔ آئندہ خیال رکھیں گے کہ مزید بہتر تحریروں کا انتخاب کریں۔

آپ اچھا لکھ سکتی ہیں تو پھر دیر کس بات کی ہے دل کی دہائی پر توجہ دیں اور قلم تمام لیں۔ یہ یقین رکھیں کہ اچھی تحریر ہوگی تو ضرور شائع ہوگی۔ بس تھوڑا اپنی رائے جنگ پر توجہ دیں۔ ہمیں پڑھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ نمبر احمد جلد مکمل ناول کے ساتھ شامل ہوں گی۔

جھنگ سے روہینہ امجد شریک محفل ہیں لکھا ہے نعت پڑھ کر پیارے نبی کی باتیں پڑھیں جو ہمارے علم میں اضافہ تربیت میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ دوڑ لگاؤ۔ سنہری دھوپ کی بہت اچھا جا رہا ہے مزہ آ رہا تھا کہ ختم بھی ہو گیا بیانی آئندہ۔

عفت سحر ظاہر نمبر آفندی کے سامنے مہرہا کے آنے کے بعد بھی ہم سے چھپا رہی با کمال ہیں تا ہماری عفت صاحبہ، ناک۔

”جب تھ سے نانا جوڑا“ پڑھا پھر اس کے بعد شگفتہ یاسمین اور میاں سے ملاقات کروائی آپ نے جو کہ نشان دار رہی۔ نلم نمبر سے ملاقات بھی بہت اچھی رہی،

تھینکس، شہزاد میں شہزاد کے علاوہ درہوار بھی ہمیں بہت پیاری تھی۔ اب تو دل سے اتر گئی ہے درہوار عمروں کے سلسلوں میں حقیقت سے قریب تر تگی۔

اس مقام پر تو آنسو چھٹک چھٹک پڑے ماریہ نہ جا کر بھی ج کی سعادت حاصل کر گئی ماشا اللہ۔ اچھی نیت کا پھل۔ جب میں اپنے گھر کی مالک بنی کل بخاری بنی تو میں اسے سرال دالوں کو بہت محبت سے بلاتی ہوں۔ ان کا خیال رکھتی ہوں اور ایسا مجھے سکھایا ہے شمع خواتین نے۔ فیصلہ بہت پیاری اسٹوری۔ چائے روکھ گئے اداس کر دیا۔ ”محبت تمہارے نام“ بہت دلچسپ اسٹوری لکھی

”خواب شیشے کا“ میں مہرہا کی زندگی خوشیوں سے بھر دیں۔ پلیز شہری خواہش دل جیسے کٹ کٹ گیا مگر اس میں اس بیٹے اس بھائی نے مرہم ہی تو لگا دیا جس نے اپنے اتنے سے گھر میں سب بھائیوں کو بھابھو سمیت جگہ دی۔ انسانیت بھی تو زندہ ہے آؤ لالہ اگاتے ہیں شروع میں انجوائے کرتی رہی۔ مگر آخر میں تو سمجھ گئی نہیں آ رہا کیا کہوں کیا لکھوں۔

”محبت جنوری جیسی“ فرزانہ کھل بہت خوب صورت ناول۔ میں تمام رائیٹرز سے کہوں گی ابریل منی جون ’جولائی‘ اگست‘ نمبر اکتوبر‘ نومبر‘ یہ بھی کوئی اسٹوری محبت بھری لکھیں تاکہ منی جون کی پیش بھی محبت کا سا سکون بخشنے۔

ن: پیاری روہینہ! آپ کی بیٹی کی نیچر کا جو مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ جب وہ نیچر رو رہی ہیں تو آپ ان نیچر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ اور ان کے خلاف کچھ نہ کریں کیونکہ اگر آپ نے کوئی کارروائی کی اور ان کی نوکری جلی کی تو آپ زندگی بھر ضمیر کی خلش میں مبتلا رہیں گی۔

بچی کو اب اس اسکول میں بھیجنا بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ ڈر گئی ہے اگر کسی اور اسکول میں داخل نہیں کرانا چاہتیں تو بہتر یہ ہے کہ آپ اس کو خود پڑھائیں۔ اسکول زیادہ نہ بھیجیں۔ امتحان کے بعد وہ اگلی کلاس میں چلی جائے گی تو آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

نیچر نے جو داخلہ دوسرے اسکول میں کرانے کی پیش کش کی ہے اسے غلط معنوں میں نہ لیں دراصل وہ بھی اس سارے قصہ سے جان چھڑانا چاہتی ہیں۔

افراء جٹ نے ٹخن آباد سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں
 فردی کا سرورق الفاظ نہیں بیاں کے لیے، شعاع
 کا نائل تو ہر دہائی بہت زبردست ہوتا ہے۔ کسی پارک یا
 کھیتوں وغیرہ میں بھی ایک زبردست سا نائل دے
 دیں، کمال لگے گا (ذاتی رائے) ”پہلی شعاع“ دل جمعی
 سے پڑھی۔ ایک ایک بات سن میں اتر گئی ”حمد و نعت“
 سبحان اللہ، سبحان اللہ، قلب درود اسیر ہو گئے۔ ”پیارے
 نبی کی پیاری باتیں“ بہت ہی زبردست سلسلہ ہے۔
 ”جب مجھ سے ناتا جوڑا“ آسے ملازم حسین بہت اچھا لگا
 انزو، یو، دھیر ساری دعائیں آپ کے لیے (مجھے بھی بوج
 بہت پسند ہیں) ہندھن میں شگفتہ پائین ہمراہ ڈاکٹر شاہد
 ماشا اللہ اچھا کپل ”دستک“ نیلم منیر اور خالد بٹ سے
 ملاقات اچھی رہی۔ ”خواب شیشے کا“ بہت عمدہ جارہا ہے
 ”شہر زاد“ جان ہے ہماری یہ ناول ”سنہری دھوپ“
 زبردست جارہا ہے۔ ”مجت جوری جیسی“ فرزاد کھرل
 بہت اچھا لکھتی ہیں آپ مگر بھول بھلیاں میں پہلے گم ہونا
 پڑتا ہے پھر منزل لکھی ہے۔

”مجت تمہارے نام“ سدرۃ المنتہی ویلڈن جی!
 ”عمر کے سلسلوں“ فوزیہ فرخ تائیں تحریر ”آؤ لالہ
 اگاتے“ ام ایمان قاضی ہر بار کی طرح نہایت عمدہ!
 افسانے (سنہری خواہش) سعیدہ عمر جی موضوع
 بہت اچھا تھا۔ گل فروش قرۃ العین کمال کر دیا۔ فیصلہ نور
 الصباح بہت اعلیٰ بہت اعلیٰ ”چائن روٹھ گیا“ عظمیٰ اختیار
 زبردست۔

”خط آپ کے“ سب کے اچھے لگے۔ ”موسم کے
 پکوان“ اسپنسی ”نارنج کے جھروکوں“ بہت اعلیٰ سلسلہ
 ہے۔ مختلف بادشاہوں کے در بتائیں باری باری۔ آئی
 رضیہ جمیل آپ کے جواب میں بہت پسند ہیں..... مثلاً
 بھائی، پھوپھو، آئی سرین، سیکین میڈم اور بھائی عرب سب کو
 سلام اور بانی تمام کزنز، فرینڈز جو پڑھ رہے ہیں اسی کے
 ساتھ اللہ حافظ۔

ج: پیاری افراء! ہمیں افسوس ہے آپ کا خط شامل
 نہ ہو سکا۔ سب کی بات میں کبھی ڈاک میں تاخیر وجہ بنتی ہے تو
 کبھی صفحہ کی بھوری آڑے آ جاتی ہے۔
 ہینٹل کے سلسلے میں آپ کی تجویز اچھی ہے لیکن کراچی
 میں تو کھیت کیا اب ہر گھنٹہ خال ہی نظر آتا ہے۔

آپ کے تمام عزیز واقارب کو سلام پہنچا رہے
 ہیں۔ لیکن ایک بات بتانا چاہتے ہیں کہ یہ سلسلہ سلام دعا
 کے لیے نہیں ہے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکر ہے۔
 کوثر خالد نے فیصل آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں
 دبیر ہماری نئی کتاب ”نہر نسیم“ جھولی میں ڈال
 گیا۔ اور جنوری میں کا مقدر چکا گیا۔ 19 اپریل کو وہ
 ”سرتاج ولا“ ہوگی ان شاء اللہ اور شیخ یا سر کہلائے گی۔ جو گھر
 کے سامنے ہے چار گھر چھوڑ کر۔ رشتہ میں نے کیسے جوڑا۔
 دعا میری مرضی خدا کی۔ مگر خوفناک حالت صرف بیٹے نے
 کی۔ افسانہ بن سکتا ہے مگر کتنے کون؟ چلیے تبصرہ کی طرف۔
 سرورق روشن سا پہلی شعاع صرف اور صرف ہر لمحے ہر پل
 اللہ کا ذکر اور بدیوں کا خاتمہ اک ماں ہی کر سکتی ہے۔ بجا
 فرمایا۔ اچھی ماں..... اچھی اولاد..... دادی معذور۔ گھر
 چھوڑ کر اکیلی اگر کشتوں کہیں چلی جاؤں۔ دردناک کھلے
 رکھ کے تو الحمد للہ میرا اللہ حفاظت کرتا ہے۔ ذکر کی
 بدولت حمد و نعت دونوں زبردست دعا۔

”نبی کی باتیں“ سر آکھوں پر اور دل میں رحمت بن
 کر چھا گئیں۔ ”ہندھن“ شگفتہ شگفتہ تھا۔ ”دستک“ نیلم نام
 بہت پسند ہے۔ ناول شیشہ و شہر زاد۔ دونوں میں خاتمہ د
 جا کر کردار دکھائے گئے ہیں۔ اچھی بچانا ”گل فروش“
 اچھی لگی۔ محبت ہو تو ایسی ہو۔ یاد آ غر بہت کے دنوں میں
 خالد کو سر می موٹا سوئیٹر لٹے سے لے کر دیا تھا۔ انہیں اچھا
 لگا۔ تو حالات اچھے ہونے پر پھر پانچ سو کا نیا سر می سوئیٹر
 بھی لا دیا۔ وہ بتاتے۔ دوست کہتے ہیں۔ یار تیری بیوی یا
 بھائی کی پسند بہت اعلیٰ ہے۔ اسی طرح شکر قدی تو ہے پر
 پکانے کی تحریف بھی دوستوں سے آئی۔ ”چائن روٹھ گیا“
 قلم تو اچھا ہے مگر ایسی محبت؟ خدا سب کو ذلیل ہونے سے
 بچائے۔ محبت صرف خدا سے اور اس کے تمام بہترین
 بندوں سے ہو تو مجھو بیڑا پار۔ ہماری مشکلی چھٹی میں۔
 دیدار میرٹھ میں۔ ملاقات ماموں کی شادی پر خالد سے
 ہوئی۔ اسنے حسین کے نظر اچھی مگر چوری تنہائی میں بھی بات
 تو کیا دیکھنا بھی کوارنٹن تھا۔ جب ساس نے کہا کہ کوثر ٹینک
 اتار نہیں سکتی شادی کے بعد خط لکھا۔ اگر آپ لوگوں کو
 ٹینک نہیں پسند تو رشتہ تو ڈو۔ جواب آیا ”کچھ نہیں کہتے۔“
 بعد میں ہماری حق گوئیاں انہیں ”جن“ لگیں۔ اور پھر سے
 72 ڈنڈے بڑھائے گئے۔ میری ماں اور خالد کے

سامنے۔ ہم روتے تو کسی کو ترس آتا۔ کلمہ کا ورد زبان پر
 تھا۔ درد کہیں نہ تھا۔ آج وہ ”پیر“ یادداشت کھوئے۔
 گردے ٹپل۔

”نارنج کے جھروکے“ نوری نوری۔ ”خوب
 صورت بیٹے“۔ صائمہ اتم نے وہ دقت کیسے گزارا ہوگا؟
 ہمیں یہ راز بچپن سے پتا ہے۔ جناب والا مسئلہ کوئی بھی
 ہو۔ صدقہ اور ذکر اللہ ہر پل تو پھر۔

ج: پیاری کوثر! آپ ہماری اس محفل کی رونق ہیں۔
 آپ کی عدم موجودگی کو ہم اور ہمارے قارئین بھی بہت
 محسوس کرتے ہیں۔ کئی قارئین نے خطوں میں آپ کے
 بارے میں استفسار کیا۔

پیاری شیخ کا رشتہ طے ہونے پر مبارک باد۔ ہماری
 دعا ہے کہ بخیر خود بخوبی ان کی شادی انجام پائے اور انہیں
 ڈھیر ساری خوشیاں نصیب ہوں۔ آمین
 افراء عزیز جہلیانے گاہوں اور یا خانہ سے شرکت کی
 ہے، لکھتی ہیں

آپ کو خط لکھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس گویگی
 سردی نے اپنا کام دکھایا۔ فلوارڈ نزلہ زکام نے ایسا جکڑا کہ
 پورا کر دیا میں نے بھی گلاب جامن جلیبیاں کھا کے زکام کو
 بھگایا۔

میں دعائیں دیتی ہوں شعاع اور خواتین کو! ان کی
 پوری ٹیم کو خاص کر عمیرہ احمد، میراجیدہ نمرہ احمد، عزیزہ سید کو
 جن کی لازوال تحریروں نے ہمیں کبھی بھٹکنے بابا یوس ہونے
 نہیں دیا۔ نمرہ نے کہا تھا۔ ”لوگوں کی نفی لفت کو انور کرنا ایک
 آرٹ ہے۔“ یقین کریں ہم اس آرٹ سے مالا مال ہیں
 سائرہ رضانے کہا ”ہم کون ہوتے ہیں۔ کسی کے ایمان پر
 فتویٰ لگانے والے۔“ یقین چاہیے ہم اپنی آنکھوں سے
 منافقت سازشیں دیکھتے لیکن پھر بھی چپ چاپ رہتے ہم
 او اس مایوس ہوتے تو ہمیں عیسوہ احمد یاد آتی ہیں۔ ”پتا نہیں
 ہم کتنے نمون، کتنے کافر ہیں لیکن جو بھی ہیں اللہ ہمارے
 دلوں سے بے خبر ہیں۔“ جہاں ہر طرف گھٹو ماحول گھٹو باتیں
 دیکھتے فوراً نمرہ کی بات یاد آتی۔

”ثبت سوچیں اتنا کہ آپ سے ثبت شعاعیں
 پھوٹے لگیں۔ کوئی امید کوئی آس نہ ہونے کے باوجود ہم
 ثبت پوائنٹ ڈھونڈ نکالتے۔ مختصر یہ کہ ہم سکس اسٹار
 گروپ نے جو بھی سیکھا ہے آپ ہی (شعاع، خواتین)

سے سیکھا ہے۔ اگر ہم مضبوط ہیں تو آپ کی وجہ سے کیونکہ
 ہمیں لڑنا حالات سے آتا ہے۔ سب سے پہلے ”شہر زاد“
 پڑھی یہ دردناک تو حرد و پھر چڑی ہو گئی ہے چھپوری حرکتیں
 کر رہی ہے۔ ”سنہری دھوپ“ اب پور کر رہا ہے اہم اور
 دعا کے وہی روایتی جھکڑے شروع۔

فرزاد کھرل۔ مجال ہے جو ان کے کسی بھی ناول
 میں موجود رشتہ داریاں پیری کچھ میں آئی ہوں۔ فرزادہ
 کھرل کے ہیرو، ہیروئن ایک دوسرے سے اتنے سرد
 لکھ میں بات کیوں کرتے ہیں۔ اور پھر فلسفی زبان میں
 بول لکھ گے جو سرے گز جائے بعد میں دماغ میں بیٹھے۔
 ویسے لکھتی بہت اچھا ہے۔

سدرۃ المنتہی بڑے عرصے بعد جھلک دکھائی بہت
 اچھا تھا ناول یہ سدرۃ المنتہی کینز نبوی کی کرن ہیں؟
 افسانے سارے ہی اچھے تھے خاص کر مجھے گل فروش، بہت
 پسند آیا۔ خالدہ جیلانی سے فرمائش ہے بلکہ ریکویسٹ ہے
 کہ جو دنیا افضل آملٹ بنائی تھی سفیدی میں کیوں زردی
 میں شہد اگرایے انڈے بنانا آتے ہیں تو پلیر ہمیں ترکیب
 بتائیں اور ایک گزارش آپ سے ہے پلیر نہیں سے ہنت
 سحر عمیرہ احمد کینز نبوی کو ڈھونڈ لائیں۔ اور نتیجہ انا
 چکوال، نسبت زہرا آپ دونوں بھی کہاں گم ہو۔

ج: واہ بھئی اقرار! آپ کا زکام بھگانے کا نسخہ تو بڑا
 مزے دار ہے۔ یہ نسخہ تو ہم بھی ضرور آزمائیں گے۔
 انڈے کی زردی میں شہد، سفیدی میں کیوں دالی ترکیب تو
 میراجیدہ ہی بتا سکتی ہیں۔ فرزادہ کھرل کی رشتہ داریوں
 سے ہماری بہت سی قارئین ناخوش ہیں۔ ہم نے ان سے
 کہا ہے کہ وہ ہیرو، ہیروئنیں بڑی زیادہ فوج دیں اور دور پرے
 کے رشتے داروں کو دور ہی رکھیں۔ سدرۃ المنتہی کینز نبوی کی
 کرن بھی ہیں اور نند کا رشتہ بھی ہے۔ سدرہ کے بھائی سے
 کینز نبوی کی شادی ہوئی ہے۔

عائشہ جہانگیر ڈھوک صابری لکھ سید اس سے شریک محفل ہیں
 اس ماہ ناول اچھی لگی میں نے تاکتھ کلاس سے
 شعاع پڑھنا شروع کیا اب میں تھوڑا سیر میں ہوں۔ ہم
 نے شعاع کیسے پڑھا، یہ الگ کہانی ہے بہت ڈانٹ
 پڑی۔ حتیٰ کہ مار بھی پڑی مگر ہم نے شعاع نہ چھوڑا۔
 عفت سحر طاہر کا ناول ”خواب شیشے کا“ ٹاپ پر جا
 رہا ہے۔ ”شہر زاد“ بھی اچھا جارہا ہے۔ پلیر صائمہ آئی

ہم زاد کو سامنے لے آئیں۔ باقی ناول افسانے اچھے تھے۔ جلیز نیلہ عزیز سے کوئی ناول نکھو اسے۔

ج: پیاری عائشہ! آپ کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نیلہ عزیز تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

میں رب نواز نے دو چھوٹی جگہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

عفت سحر طاہر کا خواب شیشے کا میں مودہ سے زیادہ نمیر آفندی مجھے پسند آیا ہے۔ ”سنہری دھوپ“ میں سلوٹی سیف اللہ بٹ نے کمال کر دیا۔ بانی سب کہانیاں بھی مزے کی تھیں کیا میں شعاع میں لکھ سکتی ہوں۔

ج: لیلی! اشعار کی محفل میں خوش آمدید۔ شعاع آپ کا پرچہ ہے۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں، صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں۔

فرحانہ مہنا ز نے گوجرہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں ”خواب شیشے کا“ ہائے عفت جی اگر یہی کہانی ڈرامائی شکل میں ہوتی تو میر سامنے تھا لیکن۔ نانا جوڑا تو اس دفعہ بیٹ تھا پڑھ کر اپنا بچپن اور مٹکی کا پر پڑ یاد آ گیا۔ کیونکہ ہم بھی جوانی بچپن کی میں تھے اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں رخصتی تھی۔

آج شہزاد میں درہوار اپنے محبت کے لیے خود سے پہل کر رہی ہے تو چھوڑی کا لقب مل گیا۔ اور اگر کوئی لوکا پہل کرے تو وہی لڑکی محسوس اور پاکیزہ ہوتی ہے اور جلیز ہماری قاری بہنیں غریب کو بچ میں نہ لایا کریں کیونکہ مذہب میں تو ہم زاد کی گفتگو بھی جائز نہیں ہے۔

سنہری دھوپ میں ایک اچھی دوست کو سوتن میں بدل کر کہانی کچھ عجیب سی کر دی ہے۔ مزہ نہیں آتا پڑھ کر، ام ایمان قاضی نے روٹے کھڑے کر دیے والے قلم کرواتے اور اچھا ہونیکلی صاحبہ کو معافی کا موقع بھی نہ دیا۔ ”خس کم جہاں پاک“ فوزیہ فرخ نے بہت اچھی بہو دکھائی جو جگہ کے برابر خواب کما لیتی ہے۔

افسانوں میں سنہری خواہش نمبر لے گیا۔ سنیہ عیر جی اپنا نہیں کیوں سنہری منزل کی قسیم پر مجھے بہت رونا آتا۔ آنکھیں دیکھ لیں تو بچہ آ کر سر مہکا با تو آنکھوں کی جلن کم ہوئی۔

ج: فرحانہ! اللہ تعالیٰ نے عورت میں شرم، حیا، ضبط اور صبر و برداشت کا جذبہ زیادہ رکھا ہے۔ اسے اپنی عزت نفس بہت عزیز ہوتی ہے۔ وہ محبت میں مٹ جاتی ہے لیکن اظہار میں پہل نہیں کرتی۔ درہوار نے حیا کے ساتھ ساتھ اپنی عزت نفس کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اسی لیے وہ قارئین کو بری لگ رہی ہے۔

سنیہ عیر کا افسانہ بہت حساس موضوع پر تھا۔ انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے حقیقت بہت اچھے طریقے سے بیان کی۔ اسی لیے حساس دلوں نے اسے اتنی شدت سے محسوس کیا۔

سلیمہ میمنگل نے دوست محمد بلوچستان سے لکھا ہے مائل کی خوش شکل سی تصویر نے حیران کر دیا۔ سلفے سے کیا ہوا میک اپ بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے، پہلی شعاع کو پڑھا۔ دہل ڈن۔ شہزاد کی اس باریک قسط مزے کی رہی ”خواب شیشے کا“ عفت سحر طاہر جس طریقے سے لے کر چارہیں ہیں۔ بہت حرا آ رہا ہے۔ ”سنہری دھوپ“ دعا کی آزمائشوں کو ختم کر دوس ”محبت جنوری جیسی“ فرزانہ کھل کی کمال کی تحریر تھی۔ فوزیہ فرخ کو داد دی۔ ام ایمان قاضی کسی گریٹ ہوئی۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ دستک — میں شاہین رشید سے درخواست ہے کہ وہ کرکٹر کے انٹرویو لیں۔

ج: سلیمہ میمنگل! آپ کا خط دیکھ کر بے حد خوش ہوئی کیونکہ آپ کا حلق ایسے صوبے سے ہے جہاں سے ہمیں بہت کم خط ملتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

نجمہ ریڈی جی خان سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے شعاع میں کی بار خط لکھا مگر شامل نہیں ہوا اس بار سنہری دھوپ نے خط لکھنے پر مجبور کیا بہت اچھا چارہا ہے صاحبہ اکرم کا ”شہزاد“ زبردست سنہری ہوئی باری ہے۔

ج: پیاری نجمہ! خط لکھنے کا شکریہ۔ صدف رفیق نے جج سے لکھا ہے

سردرق مائل نے توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کی کوشش کی مگر میں نے اسے نظر انداز کر کے ”خط آپ کے“ میں چھلانگ لگائی۔ سردرق سے لے کر ”خواب صورت اپنے“ تک تمام رسالہ ہی لا جواب اور زبردست تھا۔ میر احمد اور امیل رضا کی کی شدت سے محسوس ہوئی۔

دوستوں کے لیے نام سر پر اتر تھا۔ وہ ناراض ہیں کہ ہمارا تذکرہ کیوں نہیں۔ سن لو! نا جو (نازیہ شاہین) ہوا (ماضدر) ڈھیر سارا اس یو اور میرے اسکول کے تمام اُستاد کو سلام۔

ج: بہت شکریہ صدف! شفیقہ عیسٰی جج سے شریک محفل ہیں

اسلام علیکم! اس ماہ کا شعاع زبردست تھا۔ شکل، دیا اور سحر انور (سدواں) نے پوچھا تھا کہ کیا شاعری کرنا اسلام میں پسندیدہ عمل ہے؟ یا تا پسندیدہ؟ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں ان بہنوں کو مطلع کرنا چاہتی ہوں کہ حضرت عائشہ غمرانی ہیں کہ شعر میں اچھی بات بھی ہوتی ہے اور بری بھی اس میں سے اچھی بات لے لو اور بری چھوڑ دو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے اشعار کو پسند فرماتے جن میں توحید اور رشد و ہدایت کی باتیں ہوتی تھیں۔

قرآن میں سورۃ اشعرا کی روشنی میں ایسی شاعری کی مذمت ہے جو مبالغہ آرائی، جھوٹے اور بے ہودہ خیالات کی عکاسی ہو۔

آنحضرت نے ظفار کی جو یہ شاعری کا جواب دینے کی اجازت دی ہے لیکن مومن کو مومن کی جو کہنے کی اجازت نہیں۔

”شاعری اپنی ذات میں تو اچھی، بری نہیں البتہ اس کا نفس مضمون اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔“ میری بہن اسماء عیسٰی کا شکریہ جس کی رہنمائی نے قلم اٹھانے کی بہت دلائی۔

خط کافی طویل ہو گیا ہے لیکن مسئلہ ایسا ہے کہ میں لکھنے پر خود کو مجبور پاتی ہوں۔ آپ بہتر جانتی ہیں کیسے شائع کرنا ہے۔

ج: بہت شکریہ شفیقہ! آپ نے بہت عمدگی سے وضاحت کی۔

پھر دوسرے یاسمین کنول نے لکھا ہے ”پہلی شعاع“ کا ادارہ بہت زبردست رہا۔ حالات و واقعات کے تناظر میں بہت اچھا لکھا۔ واقعی تربیت کی ضرورت لڑکیوں سے زیادہ اب لڑکوں کو ہے۔

”محبت جنوری جیسی“ زبردست ناول ہے واہ واہ گھنٹہ یاسمین کا ہندھن ڈاکٹر شاہد کے ساتھ بڑا پیارا لگا۔ ”جب تجھ سے نانا جوڑا“ بھی پسند آیا خوش قسمت تھے

ابھی انیم فل اور پی ایچ ڈی نے نواب اہلبڑہ، بھارت تعالیٰ اس کے خوبیوں کی تعبیر دکھائے۔ (آمین) ج: پیاری یاسمین! بہت شکریہ لیکن صرف شعاع کے سلسلوں پر ہی تھم رہے ہیں۔

رقیہ سیف نے دہلی کی چوک ملتان سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

سب کہانیاں لا جواب ہوتی ہیں۔ میری فیورٹ قسط دار کہانی ”شہزاد“ ہے۔ اور عفت سحر آپ پلیز اپنے ناول کا جلدی ایڈ کریں۔ خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ فرزانہ کھل صاحبہ سے گزارش ہے کہ ذرا آسان فہم انداز میں ناول لکھا کریں۔ اتنا اچھا لکھا سا ناول مجھے تو ذرا بھی مزہ نہیں آتا ان کے ناول پڑھ کر یہ سلوٹی سیف بٹ کا ناول بھی میرا پسندیدہ ہے ماشاء اللہ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ اور آخر میں آپ سے ایک سوال کہ کیا میں آپ کو یاد ہوں؟ دل تو چاہتا ہے براہ شامل ہوں لیکن چھوٹے چھوٹے دو بچوں کے ساتھ ہزار کام۔ ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔

ج: پیاری رقیہ! اللہ تعالیٰ آپ کے ناموں کی مغفرت کرے۔ آمین آپ نہیں یاد ہیں۔ ہماری قارئین ہمیں اتنی محبت سے خط لکھتی ہیں۔ ہم انہیں کیسے بھول سکتے ہیں۔ فرزانہ کھل تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ سو نیایا یاسمین نے نامیواں سے لکھا ہے

میں بہت شرارتی اور نٹ کھٹ سی بے ضرر لڑکی ہوں ہالہا۔ سب بہنوں کی باریاں لگی ہوئی ہیں اور ترتیب بنائی ہوئی ہے کہ کس کو کس نمبر پر لے جائے جب میری بار ہی آئی تو میں ناٹل پر بنی مائل عروج کو سرا کرانگے چلی گئی اور پھر ”سنہری دھوپ“ پڑھا مگر تو بہت عام سا لکھا کچھ خاص نہیں لگا۔ پھر میں نے صاحبہ اکرم کی ”شہزاد“ سے ملاقات کی جس نے بہت متاثر کیا مگر ”درہوار“ اور ارسل کا رد یہ اچھا نہیں لگا۔ ”شہزاد“ اور ”ہم زاد“ کی لکھا چھٹی اور کب تک چلی گی۔ سامنے بھی آجائیں اب۔ عفت سحر کا ”خواب شیشے کا“ بہت زبردست لگا۔ ”عمروں کے“ سلسلوں میں ”فوزیہ فرخ کا ناول بہت اچھا لگا۔ تمام افسانے بس ٹھیک تھے۔ ”محبت جنوری جیسی“ فرزانہ کھل کا مکمل ناول۔ مصباح کو بہت اچھا لگا بانی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ”تاریخ کے گھر کے“ تو میرا مومست فیورٹ

بہت بہت اچھا لگا۔ ”نوسم کے پکوان“ میں ہائے کھوپرے کی برنی۔ کیا چیز بتاتی ہے۔ وہ میری پیاری پیاری سہیلیوں کی تو قسمت چمک اٹھی کہ اب وہ بہت جلد برنی سے انصاف کرنے والی ہیں (ہاہاہاہا) پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت اچھی لگیں۔ ”جب مجھ سے نانا جوڑا ہے“ پڑھ کے بہت مزا آیا۔ ”خط آپ کے“ میں سرت الطاف، مہر حسین اور ذویہ مہربن گروپ کا خط اچھا لگا۔

ج: پیاری سونیا! اپنی دوستوں کو برنی کھلائیں اور جب وہ خوش ہو کر آپ کو دعائیں دیں تو اس میں خالدہ کا حصہ بھی رکھیں کیونکہ برنی میں تو حصہ ملنا مشکل ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

افراح آصف نے ڈیجیٹل مغل پورہ سے شرکت کی ہے۔ کھتی ہیں

ماڈل گرل اچھی لگی خاص طور پر اس کا میسر اسٹائل..... ہاں ایک بات پوچھنی تھی کہ نمرہ احمد شعاع کے لیے کیوں نہیں لکھتی ہیں؟ سب سے پہلے ”سنہری دھوپ“ بڑھا۔ باقی سب تو ٹھیک ہے مگر غیر لوگوں اور الیاس احمد کی فیملی کا ذکر ہر دفعہ ایک طرح کا ہی ہوتا ہے۔ پلیز سلوٹی آئی بی ایہ اسٹوری ختم بھی کر دیں نا اب بور ہو گئی ہے۔

پھر ”شہزاد“ پڑھی۔ مجھے شروع میں ”در شہزاد“ بہت اچھی لگتی تھی مگر اب تو اف اللہ... شاہ میر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میر فیملی میں صرف ایک وہ ہی ”بندے کا پتر“ ہے۔ ”محبت جنوری بیسی“ اف خدایا! فرزانہ کھل کی کہانی پڑھنے سے پہلے تو پورا شجرہ نسب بنانا پڑتا ہے۔ ہم رسالے ریلیکس ہونے کے لیے پڑھتے ہیں مگر ان کی کہانی پڑھنے کے بعد تو سر میں بھی درد شروع ہو جاتا ہے۔ پوری کہانی کے بعد بھی مجھے مشکل کے ماں باپ کی سمجھ نہ آئی کہ وہ کون تھے؟ اور احمد انوار کا اس سے کیا رشتہ تھا اف خدایا..... ”عروں کے سلسلوں میں“ دلچسپ کہانی تھی۔ ای بابا کی لڑائیوں سے بہت ہی آئی۔ ”آؤ لالہ لگا تے ہیں“ گرگولی عورت اس حد تک گر سکتی ہے یقین نہیں آیا۔ ”مگل فروش“ سب سے اچھا افسانہ تھا پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ”سنہری خواہش“ تلخ حقیقت تھی۔ ”فیصلہ ٹھیک ہی تھی۔“ ”خواب شیشے کا“ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ میر آفندی موجد نہیں..... اس دفعہ آسیر ملازم حسین کا نانا اچھا تھا۔

کافی عرصے بعد نمرہ آیا اور نہ تو پھر نانا ایک جیسا ہی ہوتا تھا۔ ”بندھن“ میں ثقافت یاسین سے مل کر مزہ آیا۔

ج: افراح! فرزانہ کھل کی کہانیوں میں رشتے تھوڑے اچھے ہوتے ہیں لیکن ان کے الفاظ بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ تھوڑی توجہ سے پڑھیں تو کہانی پڑھنے میں لطف آتا ہے۔

مشعل کا کسی سے بھی کوئی رشتہ نہیں تھا۔ احمد انوار کی شادی نسبت سے ہوئی تھی لیکن ایک کزور لکھ کی زد میں آ کر جب انہوں نے فیروزہ بیکم سے شادی کی تو نسبت نے ان سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ مشعل کے والدین نسبت کے پردی سے خود مشعل کو نسبت کے پاس چھوڑ کر گئے تو ایک حادثے میں مارے گئے۔ نسبت نے مشعل کو گود لے لیا۔ کچھ عرصہ بعد نسبت دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن مرنے سے پہلے اس نے مشعل کا رشتہ اپنے بیٹے اشعب سے طے کر دیا تھا۔ احمد انوار مشعل سے اس لیے محبت کرتے تھے کہ نسبت مشعل کو بہت چاہتی تھی انوار احمد کو نسبت کے ساتھ زیادتی کا احساس تھا، اور ان کے دل میں احساس جرم تھا وہ اس کی تلاقی میں مشعل کو چاہتے تھے۔

اب رشتے سمجھنے کے بعد آپ ناول دوبارہ پڑھیں۔ آپ کو لطف آئے گا نمرہ احمد کا ناول فی الحال تو خواتین ڈائجسٹ میں چل رہا ہے۔ اس کے ختم ہونے کے بعد ہی شعاع کے لیے لکھ سکتی ہیں۔

آپ کی عمر صرف تیرہ سال ہے۔ بہت سی باتیں آپ سمجھ نہیں سکتی ہیں۔ کوثر خالد پر آپ کی تنقید ہمیں اچھی نہیں لگی۔ آپ ہماری بچیوں کی طرح ہیں اس لیے سمجھا رہے ہیں۔ برائے ماہیے گا۔

جابر شریف نے چک نمبر 16-14-L ضلع ساہیوال سے شرکت کی ہے، کھتی ہیں

ہمارا 16 چک ضلع ساہیوال کا بہت بڑا چک ہے۔ اس میں لڑکوں کا نڈل اور لڑکیوں کا ہائی اسکول ہے۔ دو پرائیویٹ اسکول اور ایک گورنمنٹ ہسپتال ہے۔ اب حال ہی میں 16 چک کے فرنٹ پر المصطفیٰ فرسٹ کے نام سے ہاسٹل بنایا ہے۔ جہاں مفت علاج کیا جاتا ہے۔ جس سے ارگرد علاقوں کے رہنے والے لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں۔ ہمارے 16 چک کے بالکل وسط میں ایک

انتہائی خوب صورت، وسیع و عریض بلند و بالا مسجد اہل حدیث پوری شان سے ایستادہ ہے۔ جسے دیکھتے ہی دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ ہماری مسجد دیکھنے ضرور آئیں۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس ہیں۔ اب کچھ بات ہو جائے شعاع کی ٹائل پر نازل کی جگہ قدرتی مناظر ہونے چاہئیں۔ اچھی تجویز ہے۔ آپ ہر ماہ کی ایک ڈاکٹر کا انڈرو پو کریں، پیاریوں کے متعلق سوال کریں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت اچھا سلسلہ ہے۔ آپ اس میں نماز کے طریقے کے متعلق بھی احادیث دیں۔ صائمہ اکرم چوہدری ہماری فوریٹ رائٹر ہیں۔ سب سے پہلے شہزاد پڑھتے ہیں۔ سیر احسان گل کہاں غائب ہیں؟ سریم عزیز سے کچھ لکھوائیں اور نبیلہ عزیز ہم آپ کے منتظر ہیں پلیز۔

ج: پیاری صبا! شعاع کی محفل میں خوش آمدید آپ کے چک کا احوال جان کر بہت خوش ہوئی آپ کے چک میں زندگی کی بنیادی سہولیات مہیا ہیں۔ تعلیم اور مفت علاج کی سہولت بھی ہے۔ شہروں میں تو اسکول، کالج یونیورسٹی ہونا عام بات ہے لیکن گاؤں میں یہ سہولت مہیا ہونے سے بہت سے لوگوں کی صلاحیتوں کو سامنے آنے کا موقع ملے گا۔

انڈرو پو کے لیے آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حافظ افراء جاوید اور بشری جاوید بھی پدھراز قلعہ خوشاب سے شریک محفل ہیں

پہلے میں اپنے گاؤں کا چھوٹا سا تعارف کروادوں۔ ہمارا گاؤں پدھراز بہت بہت خوب صورت ہے۔ اللہ کے کرم سے یہاں ہر قسم کی سہولیات موجود ہیں اور سب سے اچھی بات یہاں یہ لڑکیاں، لڑکوں سے زیادہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور ہم دونوں سسٹرز نے بھی آئی سی ایس کے بعد اچھی لی اے میں ایڈمیشن لیا ہے۔

ہم پورے ڈائجسٹ پہ تبصرہ نہیں کر سکتے وجہ آپ کو معلوم ہے لیکن جس ناول نے آج ہمیں تبصرہ کرنے پہ

اکسایا ہے وہ ہے ”شہزاد“ صائمہ جی! دل کرتا ہے ہم آپ کے ہاتھ چوم لیں۔

اسنے باذوق قارئین کا ”شہزاد“ یہ بدذوق سا تبصرہ پڑھ کے بے ساختہ میرا سر دیوار میں دے مارنے کو جی چاہتا ہے۔ میرے کزن ظہیر عالم جو میرے ”ان“ کے بڑے بھائی ہونے کا شرف بھی رکھتے ہیں۔ وہ میری اس جنوبی محبت سے جو مجھے شعاع و خواتین اور کرن سے ہے سخت چڑتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر تم ان کے بجائے اپنی اسٹڈی پر توجہ دیتیں تو تمہارے بارکس ”بھی“ سے زیادہ آجاتے، میں کہتی ہوں کہ آپ مستقبل کی رائٹر سے بات کر رہے ہیں سوئیز کے ساتھ بات کیجیے۔ ہم دونوں کی جتنی بھی محبت ہے آخر وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔

اب آپ مجھے یہ بتا دیں کہ کیا میں رائٹر بن سکتی ہوں۔ مائی سویٹ سسٹرش! بڑی اچھی شاعری کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ ہم دونوں معصوموں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہیں۔

ج: حافظہ اقراء! باذوق قارئین کا ”بدذوق“ سا تبصرہ۔ بدذوق قارئین ہو سکتے ہیں یہ تبصرہ کب سے بدذوق ہو گیا۔ آپ دونوں ”معصوموں“ کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آپ میں صلاحیت ہے۔ رائٹر بن سکتی ہیں لیکن فی الحال صرف مطالعہ کریں۔



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ کو ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے لیے طبع و نقل اور اداریہ محظوظ جس بھی قلوبا ادارہ کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی دلی مجلس۔ ذرا ناؤر لائی گئی گورنمنٹ رولڈ کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریر اجازت لینا ضروری ہے سب صورت دیگر ادارہ کا کوئی اجازت نامہ یا حق رکھتا ہے۔



بھروسا

اداکارہ ریشم نے کہا ہے کہ ”انہوں نے بچپن سے لے کر اب تک جس پر بھروسہ کیا ہے اس نے انہیں دھوکا دیا ہے۔“ (اور آپ اب تک دھوکے کھاتی رہیں.....؟)

انہوں نے کہا ہے کہ بچپن میں والد کے انتقال کے بعد ان کی بہن نے ہی انہیں ماں بن کر پالا۔ (ہیں..... والد کے انتقال کے بعد ماں بن کر پالا، یا والدہ کے انتقال کے بعد.....؟)

ریشم کا کہنا ہے کہ ان کی سب سے اچھی دوست بابر شریف ہیں (تو ریشم! آپ کی عمر.....؟) وہ انہیں مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلاتی ہیں (بارہ شریف! مزے مزے کے کھانے..... بنا کر.....؟) مگر دوستی کے باوجود وہ بابر کا سینئر ہونے کے باعث بہت احترام بھی کرتی

ہیں۔ اور ان سے خوب ہنسی مذاق بھی کرتی ہیں (آخر انا ہی مذاق.....؟)

ریشم نے مزید کہا کہ بچپن سے ہی انہیں بابر شریف پسند تھیں۔ (بتا دیاں کہ کم عمر ہیں) اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ایک دن بابر شریف ان کی بہترین دوست بن جائیں گی۔

ترجیح

مہرین سید ماڈلنگ کے بعد فلموں کی طرف آگئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ”شادی کے بعد وہ فلموں سے دور ہو گئی تھیں۔ مگر اب دوبارہ انہوں نے فلمیں کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ایک فلم کے بعد انہیں مزید فلموں کی آفرز بھی آتی ہیں (ویسے کس کس نے آفر کی ہے۔ بھی فلموں کی اور کس کی.....) مگر ابھی انہوں نے فیصلہ نہیں کیا۔ (کیا آپ کو لینے کا.....؟)



مہرین سید کا مزید کہنا ہے کہ۔ پاکستانی فلموں میں ماڈلنگ کی بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ سے پرانی اداکاراؤں اور اداکاروں کی اجارہ داری کا دور ختم ہو گیا ہے۔ (ویسے ہی جیسے نئی اور کم عمر ماڈلز کے آنے سے آپ جیسی ماڈلز کو فلموں کی طرف آنا پڑ گیا ہے)

مہرین سید نے کہا کہ میں اپنی مرضی کا کام کرنے والی اداکارہ ہوں (فلموں میں مرضی.....؟) اور فیشن انڈسٹری ہی میری ترجیح ہے۔ (کام مانگنے کا یہ طریقہ.....؟)

قربانی

صنم سعید کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے وہ ماڈلنگ ہو یا اداکاری، فلم ہو یا ڈرامہ ہر صنف میں یکساں مقبول ہیں۔ صنم سید کہتی ہیں کہ جدید دور میں صف اول کے فنکار فلم انڈسٹری کو استحکام دینے کے لیے ڈراموں میں کام نہ کرتے ہوئے بڑی قربانی دے رہے ہیں (بینک بیلنس بڑھانے کی.....؟) فلم انڈسٹری کوئی دی فنکاروں نے ایک نئی سمت دی ہے۔ (جی جی اب فلم، فلم نہیں ٹی وی ڈراما ہی گنتی ہے۔) کئی فنکار اب فلموں کی مصروفیات کی وجہ سے ٹی وی سے بالکل دور ہو گئے ہیں۔ میں بھی ایسا ہی کر کے اپنا حصہ ادا کر رہی ہوں (یا معاذ خنہ کی صورت وصول کر رہی ہیں؟) میری کئی فلمیں ریلیز ہو چکی ہیں (قابل ذکر کوئی نہیں)

دانش مند

پاکستانی نژاد برطانوی گلوکار زین ملک نے انکشاف کیا ہے کہ ان کے آنے والے اہم میں اردو گانے اور قوالی بھی شامل ہوگی۔ زین ملک جو کہ برطانوی میوزک بینڈ ”ڈون ڈائرکشن“ کے سابق لیڈ سکر بھی ہیں کا کہنا ہے کہ ”آنے والے اہم کے لیے ایک گانا بولی وڈ کے مشہور موسیقار آے آر رن کے ساتھ بھی کر رہا ہوں۔ اردو زبان سے شروع ہی سے ناتا رہا ہے۔ بچپن سے ایسا بھادر عامر خان کی فلمیں دیکھ کر بڑا ہوں (دے کا کے ایک آدھ نام کوئی

ہمایوں سعید، عدنان صدیقی یا بشری الصاوی کاں لیا سی) جو کوئی بھی ملے اسے شاہ رخ خان کی فلم دیو داس دیکھنے کا مشورہ دینا نہیں بھولتا۔ زین ملک کا مزید کہنا ہے کہ ”اگر آپ کسی مسئلے کا پر امن اور دانش مندانہ حل چاہتے ہیں تو اسے کسی خاتون کے حوالے کر دیں (ہیں ہیں.....؟) میں دیانت داری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری کامیابی کے پیچھے بھی میری زندگی میں آنے والی خواتین کا ہاتھ ہے۔“ (اچھا جی! وہ جو آپ کو ملی ہے وہ کامیابی ہے.....؟)

کچھ ادھر ادھر سے

دنیا کے نفسیاتی ماہرین بہت سارے اختلاقات کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ اپنے آپ سے محبت کرنے والے اور اپنی ذات میں کم رہنے والے اپنی ازدواجی زندگی میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

(اعجاز مگنی۔ آواز حق)

☆ اقامہ پر عدلیہ کے کمزور فیصلے سے نواز شریف کو فائدہ ہوا ہے۔ ہم اس فیصلے پر کیسے تنقید کرتے عدلیہ پہلے ہی سہلے کی زد میں تھی۔

(عمران خان)

☆ میں کچھ دوستوں کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا عاصمہ جہانگیر کا خلا پُر نہیں ہو سکتا۔ جہاں ظلم ختم نہ ہوگا۔ ہزاروں گمشدہ افراد واپس نہ آئیں گے اور غیرت کے نام پر قتل بند نہ ہوں گے وہاں عاصمہ جہانگیر کی مزاحمت بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ مزاحمت جاری رہے گی۔

(قلم کمان۔ حامد میر)

☆ جرم سزاؤں سے کم نہیں ہوتے، معاشرے میں عدل سے ختم ہوتے ہیں۔ عدالتوں کا احترام خوف سے قائم نہیں ہوتا۔ عدالتوں کے انصاف پر مبنی فیصلوں سے ہوتا ہے۔

(فیض عام سہیل ڈوانچ)

گرن

مارچ 2018 سالگرہ نمبر

”گرن کا دسترخوان“

اب ہر ماہ گرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- ✽ ”کیا تجھے یاد ہیں گزشتہ سال اپنے“ قارئین سے سروے،
- ✽ فنکار ”سکندر ہاشمی“ سے شاہین رشید کی ملاقات،
- ✽ شعر و سخن کی دنیا سے معروف شاعر ”نیرادنیتر“ اس ماہ مہمان ہیں،
- ✽ اداکار ”راہد احمد“ کہتے ہیں ”میری بھی سنیے“،
- ✽ اس ماہ مداح گرن اور اقراء جٹ کے ”مقابلہ ہے آئینہ“،
- ✽ ”من موزیک کی ہمت نہ مانو“ آئینہ مرزا کا ماہ دار ناول کی آخری قسط،
- ✽ ”ہو انیس رخ بدل سکیں“ محبت مہدالہ کا ناول،
- ✽ ”مہر نشین“ مصباح علی سید کا ناول کی آخری قسط،
- ✽ ”جادو گرناں“ گھبت سیرا کا ناول،
- ✽ ”سوئے دی تاو حری“ امت العزیز شہزاد کا ناول،
- ✽ ”شم سے یا خوشی ہے تو“ تنزیلہ ریاض کا ناول،
- ✽ ”چھوٹی سی خطا“ نادیہ احمد کا ناول،
- ✽ ”چندوی“ غلام حسن علی کا ناول،
- ✽ راشدہ رفعت، نفیسہ سعید، نظیر قاطعہ اور مریم مامونیر کے افسانے اور مستقل خطبے۔

عمیرات کی دنیا میں محبت اور عقیدت کی معراج ہے۔ ذرا تفصیل پڑھیے اور اپنے دلوں کو عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منور کریں۔ ترکوں نے جب مسجد نبوی کی تعمیر کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنی وسیع و عریض ریاست میں اعلان کیا کہ ”انہیں عمارت سازی سے متعلق فنون کے ماہرین کو رکھیں۔“

اعلان کرنے کی دیر تھی کہ ہر علم کے مانے ہوئے لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں، سلطان کے حکم سے استنبول کے باہر ایک شہر بسایا گیا جس میں اطراف عالم سے آنے والے ان ماہرین کو الگ الگ محلوں میں بسایا گیا، اس کے بعد عقیدت اور محبت کا ایسا باب شروع ہوا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

خلیفہ وقت جو دنیا کا سب سے بڑا فرمان روا تھا، شہر میں آیا اور ہر شعبے کے ماہر کو تاکہ کی۔ ”کہ اپنے ذہن ترین بچے کو اپنا من اس طرح سکھائے کہ اسے یتاؤ بے مثال کر دے۔“

اس اثنا میں ترک حکومت اس بچے کو حافظ قرآن اور شہسوار بنائے گی، دنیا کی تاریخ کا یہ عجیب و غریب منصوبہ کئی سال جاری رہا۔

پچیس سال بعد ایسے نوجوانوں کی جماعت تیار ہوئی جو نہ صرف اپنے شعبے میں یتائے روزگار تھے، بلکہ ہر شخص حافظ قرآن اور باعمل مسلمان بھی تھا، یہ لگ بھگ پانچ سو لوگ تھے۔ اسی دوران ترکوں نے پتھروں کی نئی کانیں دریافت کیں، جنگلوں سے لکڑیاں کٹوائیں، تختے حاصل کیے گئے اور شیشے کا سامان، ہم پہنچایا گیا۔ یہ سارا سامان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر پہنچایا گیا تو ادب کا یہ عالم تھا کہ اسے رکھنے کے لیے مدینہ سے دور ایک بستی بسائی گئی، تاکہ شہر سے مدینے کا ماحول خراب نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے اگر کسی پتھر میں ترمیم کو ضرورت پڑی تو اسے



شوق شہادت

حضرت عمرو بن لوط کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عمرو اکڑ اکڑ کر میدان جنگ میں گھوم رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ.....

”اللہ گواہ ہے کہ میں جنت کا مشاق ہوں“ ان کا ایک بیٹا بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں لڑتے رہے اور اللہ نے دونوں کو شہادت کا مرتبہ نصیب فرمایا۔

شہادت کے بعد جب حضرت عمرو اور ان کے شہید بیٹے کی لاش اونٹ پر لاد کر مدینے کی جانب لے جانی جانے لگی تو اونٹ بیٹھ گیا۔ ہزار کوش کی، مگر اونٹ نہ اٹھا۔ بہت دیر کی مار پیٹ کے بعد وہ کھڑا تو ہو گیا، مگر کسی طرح مدینے کی طرف بڑھنے کے لیے تیار نہ تھا۔

جب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو کی بیوی سے پوچھا۔

”گھر سے چلتے وقت عمرو نے کیا کہا تھا۔“ بیوی نے بتایا کہ کوئی اور بات تو نہ کی تھی، البتہ قبلہ کی طرف رخ کر کے یہ دعا ضرور کی تھی کہ ”خدا یا! مجھے پھر گھر والوں کی طرف نہ لوٹائے گا۔“

یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”پھر یہ اونٹ مدینے کی طرف ہرگز نہ جائے گا۔“ (ماخذ۔ ”روشن ستارے“ از محمد یوسف اصلاحی)

عقیدت و محبت کی لازوال کہانی لوگ تاج محل کو محبت کی علامت قرار دیتے ہیں، مگر یقین کریں کہ عثمانی دور میں مسجد نبوی کی تعمیر،

حضرت عمرو بن لوط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے پیارے صحابی تھے۔ آپؐ ٹانگ سے معذور تھے، مگر ایمان کی ایسی حرارت آپؐ کے سینے میں تھی کہ احد کی جنگ میں آپؐ جذبہ شہادت سے سرشار جہاد میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپؐ ٹانگوں سے معذور ہیں اور معذوروں کو اللہ نے رخصت دے رکھی ہے، مگر آپؐ کا شوق جہاد بڑھتا ہی گیا۔ کہتے گئے

”میں اپنے بیٹوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا کہ وہ تو جام شہادت نوش کر کے جنت میں چلے جائیں اور میں پیچھے رہ جاؤں۔“

بالآخر آپؐ شہادت کی تمنا سے بے قرار ہو کر ایک دن ہتھیار لگائے قبلہ کی طرف رخ کر کے دعا کرنے لگے۔

”خدا یا! مجھے گھر والوں کی طرف نہ لوٹائیے گا۔“

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری دعا ہے کہ میں راہ خدا میں شہادت پاؤں اور میں اپنے اس لنگڑے جسم سے جنت میں پہلوں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو منع کیا کہ تم معذور ہو اور اللہ نے تمہیں رخصت دی ہے، لیکن ان کے شوق اور ارادہ کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔

شعاع کے ساتھ

ادارہ

رمیش گل

(1) - بچپن سے ہی شعاع اپنی کزنز کے ہاتھوں میں دیکھا ہے۔ ہم میں ادبی ذوق کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ بات یہ ہے کہ رسالے ہوں۔ اخبار..... کتابیں کچھ بھی..... سب کچھ چائے کا نہیں جنون ہے۔ اور پڑھنے ہوئے دنیا مافیہا سے بے خبر ہو جانا ہماری فطرت.....

ہماری کزن ہمیں چڑ کر اخباری کیز کہتی ہے۔ ہم کبھی اس خطاب پر خوش نہ ہو سکے۔ کیونکہ کیز کوئی بھی ہو، ہمیں برا لگتا ہے۔

خیر کہانیاں پڑھنے کے جنون نے شعاع اور خواتین سے نويس دسویں ہی میں متعارف کروا دیا تھا۔ میں نے ان سے بہت کچھ حاصل بھی کیا۔ اسی پہلے مجھے مع کرتی تھیں۔ مگر جب میں نے انہیں سمجھایا کہ اسی اس میں ہم لڑکیوں کے لیے بہت سے سبق ہوتے ہیں۔ تو وہ اب کچھ نہیں کہتیں..... آج پہلی بار قلم اٹھا کر شعاع کے ساتھ ایک اور رشتہ استوار کر رہے ہیں..... گھبرائے گھبرائے کیونکہ آج سے پہلے تک تو ہم نے ایک لائن یا جملہ لفظ تک لکھ کر نہیں بھیجا۔ سو سوچا پہلے تعارف کروا لیا جائے۔ کہ ہم بھی پڑے ہیں پاکستان میں.....

(2) - صبح سویرے ای کی آواز کانوں میں پڑتی ہے۔ پھر دینی روایتی صبح نماز، ناشتہ، کالج..... پھر کالج سے دوپہر تک واپسی ہوتی ہے۔ پھر کھانا کھانا، تھوڑا بہت کام یا آرام کر لینا، پھر اکیڈمی..... شام کے قریب واپسی ہوتی ہے۔ پھر بس کالج کا کام اور پڑھائی ہوتی ہے اور فارغ ہو جاؤں تو چلی جاتی ہوں..... سب سے الگ تھلک..... اپنے مخصوص کمرے میں..... مخصوص نشست پر..... اپنا مخصوص

بک لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ کچھ پڑھنے کا موڈ نہ ہو تو لکھتی ہوں۔ لکھنے کا موڈ نہ ہو تو پڑھ لیتی ہوں۔ بیٹنگ کرنا..... پکڑی کرنا میرے پسندیدہ مشاغل ہیں۔

کہانیاں لکھنا بھی اچھا لگتا ہے۔ بلکہ آج کل ایک ناول لکھ رہی ہوں۔ پہلے میرے معمولات میں شام کی چھل قدمی شامل تھی۔ اپنی بہن کے ساتھ..... اور چلتے ہوئے میں اسے خود سے بنا بنا کر ناول سنایا کرتی تھی اور مجھے کیا پتا تھا۔ مجھ سے ایسا ناول بھی بن جائے گا۔ جو مجھے مجبور کرے گا میں اسے لکھوں..... میں بہت گھبراتی ہوں کیونکہ یہ میری زندگی کا پہلا ناول ہے۔ اور سنانے اور لکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سنانے ہوئے ساتھ ساتھ بنا پڑنا ہے۔ جس کی میں عادی تھی۔ اور لکھتے ہوئے ساتھ ساتھ دکھانا پڑتا ہے۔ جو میرے لیے نیا تجربہ ہے۔ اس کے بعد بارہ بجے تک ہماری یہی روٹین ہوتی ہے۔

بارہ بجے کسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ”اب آ جاؤ سونے“

کبھی تو اٹھ جاتی ہوں اور کبھی ”آ رہی ہوں“ کہہ کر بیٹھی رہتی ہوں۔

(3) - کسی کہانی میں اپنا مکمل کردار نظر نہیں آیا۔ ایک تو ناول میں بہت منتخب کر کے پڑھتی ہوں۔ اس لیے بہت کم ناول پڑھے۔ اور جو پڑھے ان میں کوئی کردار اپنا عکس نہیں لگا۔ تھوڑی بہت عادات شاید مل جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی سے.....

تحریریں پڑھنے کو مجبور کرتی ہیں۔ ایک بار پھر پڑھنے پر..... یارم کے لیے تو میرا دل چاہ رہا ہے۔ ایک علیحدہ سے خط لکھوں۔

(4) - خوبیاں اور خامیاں..... سوال دلچسپ بھی ہے اور شاید مشکل بھی..... حساس ہوں۔ بلکہ بے حد حساس ہوں اسے خوبی کہہ دیں، خالی سمجھیں۔ آپ کی مرضی..... میرے نزدیک یہ کمزوری ہے۔ مگر کمزوری کو اپنی طاقت بنانا چاہتا ہے۔ سو میں بھی اپنی حساسیت صاف پر غفلت کر لیتی ہوں۔ میرا خیال ہے، میں ایک بہادر لڑکی ہوں۔ اس کے علاوہ بہت انا پرست ہوں۔ مجھے عزت سے زیادہ دنیا میں اور کوئی چیز پیاری نہیں۔

”لوگ دکھ پہنچائیں۔ تو معاف کر دیتی ہوں۔ دل بہت بڑا ہے میرا..... اپنے لیے یہ جملہ کئی لوگوں سے سنا اپنی چیز بخوشی دوسروں کو دے دیتی ہوں۔ کوئی مجھے میری خامی بتائے۔ تو میں اس خامی ہو تو دور کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بدگمان جلد ہو جاتی ہوں۔ اور جس سے ہوں۔ اس سے بغیر کچھ کہے اپنی راہیں الگ کر لیتی ہوں۔ لیکن یہ گزرا سال مجھ میں ایک بڑی تبدیلی لے کر آیا۔ اور وہ یہ کہ میرے دل میں جس کے لیے بدگمانی ہو۔ میل ہو۔ تو میں کسی دوسرے سے ڈسکس کرنے کے بجائے براہ راست اسی بندے سے بات کر لیتی ہوں۔

باقی اور کیا لکھوں..... عام سی لڑکی ہوں۔ اچھی لڑکی سمجھی جاتی ہوں۔ کوشش ہوتی ہے جان پہچان والے کم ہوں۔ ایک ہی بندہ ہو سلام دعا والا مگر بے غرض (مگر ہوتے ہوئے سلام دعا والے زیادہ ہی بن جاتے ہیں) خود میں کن رہتی ہوں۔ نہ دوسروں کی کسی چیز سے متاثر ہوتی ہوں۔ نہ انہیں متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اچھے لوگوں سے واسطہ رکھ لیتی ہوں بن جائے تو..... برے، خود غرض، بدتمیز، مغرور لوگوں سے نہ دشمنی رکھتی ہوں نہ دوستی..... بھئی خوش رہیں۔ جیسے رہیں۔ اپنی زندگی کے میرا کیا..... میں سنجیدہ دکھائی دیتی ہوں۔ مگر میں سنجیدہ نہیں ہوں۔

بہن لکھ لڑکی ہوں۔ میں اہل ہے بہت معمولی لکھتی ہوں۔ مگر میرا خیال ہے میں سادہ نہیں ہوں۔ ان اور عقل مند ہوں۔ کیا آپ کو میری تحریر سے نہیں لگتا بابا۔ ہاں اپنی بدتمیز بہن کے ہاتھوں آسانی سے بدبو بن جاتی ہوں۔ جو بہن کم اور دوست زیادہ ہے میری.....

(5) - کوئی ایسا بھی ہے جو کہ اسے بارش اچھی نہیں لگتی..... ”میں نہیں مند“ جی ہاں بہت اچھی لگتی ہے بارش..... گرمیاں ہوں تو کھوم پھر کر..... اور سردیاں ہوں تو اپنی مخصوص نشست پر کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ بشرط موڈ اچھا ہو۔ اپنا ہی ایک شعر لکھتی ہوں۔

چاند ستارے ٹھنڈی ہوائیں گلشن میں آئیں تو کیا آگ، گلے ایسے موسم کو دل کا موسم اچھا ہوتا سو بارش کبھی کبھی اداس بھی کر دیتی ہے۔ جب یہ سوچ ذہن میں آئے۔ کہ ایک دن یہ بارش یوں ہی زمین پر ہو رہی ہوگی۔ اور میں قبر کے اندر ہوں گی۔ اور یہ سن کر میری کزن مجھے بوڑھی روح کہتی ہے۔ میں بالکل نہیں چڑتی ہنس دیتی ہوں۔ یہ سوچ..... یعنی ہمارے اندر بڑھا بزرگ..... مجھے یہ احساس ضرور دلاتا ہے۔ یہ زندگی جو مجھے ملی..... اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اور اسے بے کار مسکے مسائل میں گنوا دینا عقل مندی نہیں۔

(6) - شاعری میں نے زیادہ نہیں پڑھی ناول لڑکی طرح..... اور جو پڑھی ان میں احمد فراز اور جاذب غار پسندیدہ شاعر ہیں۔ میں آپ کو جاذب غار کے چند شعر لکھ رہی ہوں۔ دنیا ہمیں کیسے کیسے امتحانوں میں ڈال دیتی ہے۔ ذرا پڑھیے۔

باہر آؤں تو خفا مجھ سے کنارے والے سانس کھٹکتی ہے ڈبوتا ہوں جو سر پانی میں اور یہ خوب صورت شعر میں گرا تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن سوچتا یہ ہوں کہ آئے تھے اٹھانے کتنے پسندیدہ اشعار تو بہت ہیں۔ فی الحال یہ ہی کافی ہیں۔

موسم کے پکوان

خالد جیلانی

سبے پوری کھانا گوشت

ضروری اشیاء:-

گوشت

پیاز کا پیسٹ

ادریک، لہسن، پیسٹ

دہی

اٹلی کا پیسٹ

لال مرچ

ہلدی

دھنیا

گرم مسالا

کچا پیتا

ہری مرچیں

ہرا دھنیا

نمک

تیل

ترکیب:- گوشت میں کچا پیتا، ادرک اور لہسن

پیسٹ لگا کر دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔

دہی، لال مرچ، ہلدی، پیاز دھنیا، گرم مسالا پاؤڈر اور

نمک ڈال کر بھون لیں۔ اس میں گوشت شامل

کر کے درمیانی آگ پر دس منٹ ڈھک کر پکائیں

اس کے بعد اٹلی کا گودا اور ہری مرچیں شامل کر کے

مزید دس منٹ بھنی آگ پر دم پر رکھیں، گوشت گل

جائے تو ہرا دھنیا ڈال کر اتار لیں۔

مکھنی ملائی ہرا مسالا چکن

ضروری اشیاء:-

چکن

آدھا کلو

ہرا دھنیا (کٹا ہوا)

ہری مرچیں (کٹی ہوئی)

لہسن، ادرک پیسٹ

دہی

زیرہ (بھنا اور کٹا ہوا)

لیموں کا رس

پیاز (پسی ہوئی)

نمک

تیل

ترکیب:- دہی میں تیل گرم کر کے پیاز اور

لہسن، ادرک پیسٹ ڈال کر تیل لیں۔ اس میں مرغی

ڈال کر بھونیں، مسالا بھن جائے تو نمک، ہرا دھنیا،

ہری مرچیں اور دہی ڈال کر حسب ضرورت پانی ڈال

دیں، ڈھک کر درمیانی آگ پر پکائیں۔ گوشت گل

جائے تو بھون کر لیموں کا رس، کٹا ہوا زیرہ، مکھن اور

ملائی شامل کر کے کس کر دیں۔ سردنگ پلیٹ میں

نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

قیمہ اسپیکٹھی

ضروری اشیاء:-

قیمہ

پیاز

لہسن

ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے)

تیل

نماثر پیسٹ

لال مرچ

نمک

ہلدی

ایک چوتھائی پائے کا چچہ

ہرا دھنیا (کٹا ہوا)

ہری مرچ (کٹی ہوئی)

ایک پیسٹ

ترکیب:- اسپیکٹھی کو بالائے تیل میں پھر کسی برتن

میں تیل میں پیاز ڈال کر ہلکا سا فرانی کریں، قیمہ،

لہسن، ٹماٹر ڈال کر بھونیں۔

قیمہ کا پانی خشک ہو جائے تو نمک، لال مرچ،

ہلدی ڈال کر بھونیں، پھر ٹماٹر پیسٹ، ہرا دھنیا، ہری

مرچ ڈال کر بھونیں۔ تیل الگ ہو جائے تو اسپیکٹھی

ڈال کر کس کر لیں۔ ایک منٹ پکائیں اور ڈش میں

نکال لیں اور گرم گرم پیش کریں۔

آلو، خشکاش کے ساتھ

اشیاء:-

آلو

خشکاش

تیل

کلوچی

زیرہ

لہسن کے جوے

سیاہ مرچ پاؤڈر

ہلدی پاؤڈر

ہری مرچ

نمک

ترکیب:- آلو چھیل کر جو کورنگوں میں کاٹ

لیں، ایک فرانتک پین میں تیل گرم کریں۔ جب تیز

گرم ہو جائے تو آگ سے اتار لیں اور اس میں کلوچی

اور زیرہ ڈال کر کڑکرائیں۔ اس کے بعد اس میں کٹا

لہسن ڈال کر درمیانی آگ پر بھون لیں۔ اب اس

میں سیاہ مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، آلو اور ہری مرچ

ڈال کر اچھی طرح کس کر دیں اور دس سے تین منٹ

کے لیے تیز آگ پر پکائیں۔ شتعل چھچھلائی رہیں۔

اس کے بعد آگ بجائی کر کے ڈھکن ڈھک کر آلوؤں

کے عمل مکمل جانے

وقت سے چھچھلائی رہیں۔

لیں اور اس کو بھی آلوؤں میں شامل

پانچ سے چھ منٹ کے لیے پکائیں۔ آخر میں 10

شامل کر کے اچھی طرح کس کریں اور پوکے

اتار کر گرم گرم پیش کریں۔

چکن چیز پر اٹھاروں

مرغی کا گوشت (بون لیں)

آدھا کلو

بند گوشتی (باریک کٹی ہوئی)

لہسن پیسٹ

ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)

چندر چیز

پاؤڈر

سیاہ مرچ پاؤڈر

نمک

تیل

پرائے کے اجزاء:

دوب

ایک کپ

حسب ضرورت

حسب ذائقہ

تنے کے لیے

ترکیب:- فرانتک پین میں تیل گرم کر کے اس

میں لہسن پیسٹ اور گوشت ڈال کر پانی خشک ہونے

تک فرانی کر لیں۔ بند گوشتی، سیاہ مرچ پاؤڈر، ہری

مرچیں اور نمک شامل کر دیں 2-3 منٹ پکانے کے

بعد پاؤڈر اور چندر چیز ڈال کر کس کر دیں۔ میدہ،

آٹا، مٹی اور نمک کس کر کے نیم گرم پانی سے گوندھ کر

10 منٹ کے لیے رکھ دیں۔ گندھے ہوئے آٹے

کے پیڑے بنا کر گرم توے پر پرائے بنا کر گولڈن

ہونے تک فرانی کر لیں۔ پرائے میں گوشت کا آمیزہ

رکھ کر رول بنالیں۔ سردنگ پلیٹ میں نکال کر دہی

اور ہری چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

Goldenpearl

BEAUTY FOR EVER

PAKISTAN'S
BEST SELLING
BEAUTY CREAM

Khacharti
Aik
Sacha Khawab

Golden
Pearl

Beauty Cream



دھولیں۔ جلد سے دانوں، کیل مہاسوں کا خاتمہ چند دنوں میں ہی ہو جائے گا۔

☆ اگر آپ کے بالوں میں خشکی بڑھ گئی ہے تو آدھا پاؤ وہی میں ایک انڈا ملا کر بالوں پر لگائیں۔

اس کے بعد تو لے سے اپنے بالوں کو پیٹ لیں۔ ایک گھنٹے بعد سر دھو لیں۔ اس طرح سر میں پھلی کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔

☆ دہی میں سے بالائی الگ کر کے اس میں ایک لیوں کا رس ملا کر چند گھنٹوں کے لیے ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ یہ آمیزہ ہاتھوں اور ناخنوں پر لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھ اور ناخن دھو کر خشک کر لیں۔ دو ہفتے تک یہ عمل دہراتے رہنے سے ہاتھوں کی جلد نرم و ملائم اور خوب صورت ہو جاتی ہے۔

☆ سادہ دہی کو بہترین مونچر ازرق قرار دیا جاتا ہے جس میں گلیکلیک ایسڈ کی مقدار خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ بہترین فوائد کے لیے ایک انڈے کی سفیدی میں چائے کا ایک چمچ دہی اور چائے کا ایک چمچ شہد ملا کر چہرے اور گردن پر لگائیں۔ پندرہ منٹ پر نیم گرم پانی سے اچھی طرح دھو لیں۔ چند دنوں میں ہی جلد دیکھنے لگے گی۔

☆ اگر آپ چہرے کو چھریوں سے پاک رکھنا چاہتی ہیں تو چائے کا ایک چمچ دہی میں ایک چوتھائی چمچ کیٹو کارس یا آدھے لیوں کا رس شامل کر کے چہرے پر پانچ منٹ کے لیے لگائیں۔ آخر میں نیم گرم پانی سے چہرہ دھو لیں۔ کیوں اور کیٹو کے علاوہ کسی دوسرے ریلے پھل کا رس بھی دہی میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

☆ ایک چمچ سادہ دہی میں چائے کا آدھا چمچ لیوں کا رس چھریوں کا تیل، چائے کا آدھا چمچ لیوں کا رس ملائیں۔ دس منٹ لگا رہنے کے بعد نیم گرم پانی سے چہرہ دھو لیں۔

☆

انگریز



دہی ایک مکمل قدرتی ذریعہ

قدرتی غذا میں ایسی بھی ہیں جنہیں کھانے کے علاوہ چہرے اور بالوں کی خوب صورتی اور دیکھ بھال کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دہی کا شمار بھی ان ہی قدرتی اشیاء میں کیا جاتا ہے۔ موسم گرما میں وہی فرحت بخش ذائقے سے ہم کنار کرنے کے علاوہ مختلف جلدی نسخوں اور ٹونکوں کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے۔ تاہم اس کے در در رس فوائد سے بیشتر خواتین اب بھی لاعلم ہی ہیں۔

دہی کا جلد اور بالوں کی خوب صورتی میں بنیادی کردار ہوتا ہے۔ اس میں زبک، میٹھیم، وٹامن بی ۱۲، بی ۱۰، بی ۶ اور بی ۱۲ کے علاوہ حیاتین کی دافر مقدار موجود ہوتی ہے۔ یہ جلد کو بنیادی اجزاء فراہم کرنے کے علاوہ قدرتی مونچر ازرق کے طور پر بھی کام آتی ہے۔ یہ جلد کے خلیوں کی دوبارہ تعمیر کر کے اس کی عمومی صحت درست کرتی ہے۔ ساتھ ہی جلد کو بارونق اور چمک دار بناتی ہے۔ یہ بہت سے طریقوں سے جلد اور بالوں کے لیے فائدہ بخش ثابت ہو سکتی ہے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

بالوں اور جلد کے لیے ٹونر

☆ روزانہ چہرے پر دہی لگانے سے جلد کی چمک بھال ہوتی ہے۔ دہی میں شامل زبک تمام قسم کے جراثیم چہرے سے صاف کر کے اسے خوب صورت بناتا ہے۔ تاہم اسے جلد پر لگانے سے قبل چہرے کو ہر قسم کے میک اپ سے پاک کر لینا ضروری ہے۔

☆ بالائی سے پاک دہی میں تھوڑا سا خیر ملا کر چہرے پر لگائیں۔ چند منٹ بعد سادہ پانی سے چہرہ